اُردُو زبان کا اوّلین

مخزن

ایڈیٹر

ابوالاثر حفیظ جالندھری

دارالاشاعت پنجاب کی چار بے نظیر کتابیں!

ہ۔جناب ابوالاثر حفیظ جالندھری کی پیاری پیاری بیس (۲۰) عمدہ نظموں کا مجموعہ جس میں عید۔ شبرات اور دیوالی دسہرے تا اور برسات کے موسم پر رہٹ کی سہانی اور میٹھی صدا پر دھوبی کی "چھوا چھو" پر بڑی مزیدار نظمیں ہیں۔ ایسط رتیترتی پر اچھی اچھی نظمیں لکھی گئی ہیں۔ قیمت صرف آٹھ آنے ۸

سے ہندوستان میں بچہ بچہ واقف ہے۔ اس کی عیاریاں ہی ایسی ہیں۔ کہ جو کوئی ایک دفعہ اُن کا حال سُن لوٹ ہو جاتا ہے۔ اب تک عمر عیار کا حال یا تو طلسم ہوش رُبا میں لکھا تھا۔ جس کے ہزاروں صفحے بچوں کے۔ بیہودہ بازاری کتابوں میں تھا۔ جن میں بے شمار ایسی بیہودہ باتیں تھیں۔ جن کا بچوں کی نظر سے گزرنا اچھا نہیں اب ہم جناب **ابوالاثر حفیظ** جالندھری سے حالات عمر عیار نہایت پرلطف آسان اور دلچسپ زبان میں لکھواتے ہیں۔ پہلے حصے میں عمر کے کی نشرارتیں اور امیر حمزہ کے ساتھ نوشیرواں کے دربار میں پہنچنے اور مصیبتوں میں گرفتار ہو کر صحیح وسلامت نکل آنے کی داستان ہے دوسرے حصہ میں جادوگروں کے طلسم میں پھنسنے اور عمر عیار کی بدولت چھٹکارا پانے کا حال ہے۔ دونوں حصوں میں آٹھ رنگین تصویریں بھی ہیں۔ سرورق نہایت خوبصورت جس پر عمر عیار کی رنگین تصویر ہے۔ قیمت حصہ اوّل عہ حصہ دوم صہ

ہندوستان ہمارا۔ حضرت **ابوالاثر حفیظ** جالندھری نے تاریخ کو دلفریب اور سبق آموز بنانے کے لئے پہلی مرتبہ تاریخ ہند کی مشہور کہانیاں آسان اور بہت موثر انداز سے نظم میں لکھی ہیں۔ اس کتاب میں راماین۔ مہابھارت سری کرشن مہاراج گوتم بدھ۔ سکندر۔ پٹھان اور مغل۔ بادشاہوں۔ سکھوں اور انگریزوں کے حالات پر بے حد روانی اور قادر الکلامی سے نظمیں لکھی گئی جس سے ہندوستان کی تاریخ کے تمام اہم واقعات آنکھوں کے سامنے گذر جاتے ہیں۔ اور اُن تمام قوموں کی عظمت اور شوکت کا نقشہ نظروں کے سامنے کھنچ جاتا ہے۔ جو مختلف زمانوں میں ہندوستان پر حکومت کر چکی ہیں۔ مصنف نے ایسی تمام باتوں کو نظر انداز کر دیا جن کا کسی جماعت یا فرقے کو ناگوار گذرنے کا ڈر تھا۔ اور ہر مضمون پر خود متاثر ہو کر نظم لکھی ہے۔ اور شروع میں علامہ عبداللہ یوسف علی صاحب آئی۔سی۔ایس پرنسپل اسلامیہ کالج کا دیباچہ ہے۔ کتابت کاغذ طباعت نہایت اعلیٰ۔ چودہ رنگین بلاک کی تصویریں نہایت خوبصورت جلد اور سرورق تحفے کے طور پر دینے کے قابل کتاب۔ قیمت عہ

نغمہ زار

ابوالاثر حفیظ جالندھری کا کلام تمام پنجاب کے مشاعروں اور ہندوستان کے اکثر رسالوں میں شائع ہو کر اس قدر پسند کیا جا چکا ہے۔ کہ اب کسی مزید تعارف کا محتاج نہیں اس کتاب میں اس نامور اور مقبول و محبوب شاعر کی تمام مطبوعہ و غیر مطبوعہ نظمیں اور غزلیں جمع کر دی گئی ہیں۔ ایک مست کیف شاعر کی دنیا۔ جس میں حسن و عشق اور موسیقی ایک دوسرے میں کھوتے ہوئے ہیں ضخامت تقریباً ۱۵۰ صفحہ۔ قیمت عہ

ملنے کا پتہ:۔

دارالاشاعت پنجاب ۱۹۵ ریلوے روڈ لاہور



سکوت ——— عمل چغتائی

دورِ جدید
رجسٹرڈ ایل نمبر

مخزن
لاہور

قیمت سالانہ للعہ/ ممالکِ غیر سے ۹ شلنگ
بذریعہ وی پی للعہ/ فی پرچہ ۶/

جلد ۱ | بابت ماہ مارچ ۱۹۲۷ء | نمبر ۱

تصاویر (۱) بانیٔ مخزن۔ (۲) سکوت ۔ عمل چغتائی

صفدر علی خاں خوشنویس رامپوری کاتب مخزن

شذرات

یہ امر موجبِ اطمینان ہے کہ مخزن اور اُس کی ادبی خدمات کو ملک نے تا حال فراموش نہیں کیا۔ احیائے تازہ کا اشتہار ہوتے ہی مخزن کے قدیم سرپرستوں اور مشاہیرِ ادب نے حوصلہ افزا الفاظ میں مسرت کا اظہار کیا ہے۔ اور قیمتی مشورے بھی دئے ہیں۔ قدیم خریدارانِ مخزن نے جس جوشِ اشتیاق کا مظاہرہ فرمایا ہے اس سے مخزن کی حیاتِ ثانیہ اور اُس کے مقاصد کی کامیابی کا پُر زور دعوے کیا جا سکتا ہے ✣

ہم اپنے دوستوں کے بعض خطوط آئندہ نمبر میں درج کرینگے۔ فی الحال شکریہ ادا کرکے صرف یہ کہنے پر اکتفا کرتے ہیں کہ انشاءاللہ مخزن اپنے قدردانوں کی توقعات اور اپنے دَورِ اوّل کی بہترین روایات کے مطابق ثابت ہونیکی کوشش کریگا۔ کامیابی خدا کے فضل اور آپکی قدردانی و حوصلہ افزائی پر منحصر ہے ✣

محفلِ مخزن میں جس طرح نوخیز و جواں سال ادیبوں اور شاعروں کو دعوتِ شرکت دی گئی ہے۔ اُسی طرح اسکے قدیم سرپرست اہلِ قلم کو بھی پھر ایک مرتبہ جمع کرنے کا اہتمام کیا جا رہا ہے۔ چنانچہ خان بہادر شیخ عبدالقادر صاحب بانیٔ مخزن، اُستاذی حضرت مولانا گرامی مدظلہ اور حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب قبلہ کے تبرکات اسی اشاعت میں پیش کئے جا رہے ہیں۔ حکیم سیّد ناصر نذیر صاحب فراق دہلوی۔ لالہ تلوک چند صاحب محروم کے جواہرِ افکار موصول ہو چکے ہیں جو آئندہ اشاعت میں مخزن کو زینت بخشیں گے ✣

کارپردازانِ مخزن ہمعصر اخبارات و جرائد کے بے انتہا شکرگزار ہیں جنہوں نے مخزن کے دوبارہ اجراء کی خبر سُنتے ہی نہایت فیاضانہ رواداری سے اُس کی حیاتِ ثانی کا پُرتپاک خیر مقدم کیا ہے ✣

مخزن دستورِ قدیم کے مطابق مشاہیر کی تصاویر پیش کرتا رہیگا۔ مشاہیر کے علاوہ مصوری کے ایسے شاہکار حاصل کرنیکی بھی کوشش کی جائیگی جن سے مذاقِ سلیم کو حظ حاصل ہو لیکن بازاری تصویروں کی توقع نہ رکھئے کیونکہ مخزن ملک کے اخلاق کو خراب کرنے کا آلہ بننا نہیں چاہتا ✣

دورِ جدید کی پہلی اشاعت میں بانیٔ مخزن کے سوا کسی کی تصویر موزوں نہ تھی۔ چونکہ آپ سے دُنیائے اُردو کا ہر فرد واقف ہے اس لئے صرف تصویر پر اکتفا کی گئی ہے، دوسری تصویر سکوت ہے۔ اس کو دیکھئے۔ یہ اُس باکمال مصور کا نتیجۂ فکر ہے جس کے مُوقلم کی لطیف جنبشوں نے بہزاد کی روح کو آئینۂ تصویر بنا رکھا ہے۔ ہم آپ سے داد طلب ہیں کہ پہلی اشاعت ہی میں حضرت چغتائی کے فن کا ایک بالکل نیا نمونہ پیش کرتے ہیں ✣

ایسوسی ایٹڈ پریس کی تازہ اطلاع ہے۔ کہ مدراس کی سالانہ سرکاری نمائشِ تصاویر میں انگریزی اور ہندوستانی انداز میں سے بہترین تصویر کا انعام حضرت چغتائی کو ملا ہے۔ غالباً حضرتِ چغتائی اس کا تذکرہ بھی خلافِ شان سمجھتے ہیں مگر ہم انہیں اس وجہ سے مبارکباد دیتے ہیں کہ یہ انعام درحقیقت انڈین آرٹ کی فتح کا نشان ہے کیونکہ مدراس کی اس نمائش میں ہندوستانی انداز کی تصاویر پر یہ انعام شاید ہی کبھی ملا ہو ✣

ایڈیٹر

تقریب

مخزن کی زندگی کے مختلف دور اربابِ بصیرت کے لئے سبق آموزی کی ایک نہایت دلچسپ داستان مہیا کرتے ہیں۔ یوں سیکڑوں رسائل و جرائد ملک میں نکلنا شروع ہوئے اور بند ہو گئے۔ مگر عروج و زوال کی جو انتہا مخزن کو دیکھنی پڑی شاید کسی اَور ادبی رسالے کو دیکھنی نصیب نہ ہوئی ہو ✣

ادبِ اُردو نے ہوش میں آ کر کروٹ ہی لینی چاہی تھی۔ کہ اس کا گلا گھونٹ دینے کی تجویزیں ہونے لگیں۔ اور زبان کو معاندانہ حملوں سے بچانے اور اسے ہر دل عزیز بنانے کے لئے مخزن اُفقِ ادب پر نمودار ہوا۔ شیخ عبد القادر صاحب قبلہ نے ضرورتِ وقت کا لحاظ رکھتے ہوئے اس خوبی سے یہ پہلا قابلِ قدر ادبی رسالہ چلایا۔ اور ادیبوں اور انشا پردازوں کی ایک اتنی کثیر اور قابلِ قدر جماعت اپنے گرد جمع کر لی۔ کہ اُردو کی تمام دُنیا میں مخزن کی دھوم مچ گئی۔ جس شہر میں بھی علم و ادب کا ذرا سا چرچا تھا۔ وہاں ہر ماہ آرزومندوں کی نظریں عید کے چاند کی طرح مخزن کی منتظر رہنے لگیں۔ اشاعت حیرت انگیز سرعت سے ہزاروں تک پُہنچ گئی۔ قدر دانی نے حوصلہ افزائی کی اور مخزن کو خوش حالی کا ایک ایسا زمانہ دیکھنا نصیب ہوا۔ جس کے لئے پھر تمام رسالے تمنّا ہی کرتے رہ گئے ✣

لیکن کس کو علم تھا۔ کہ یہ رسالہ جو اس وقت ملک میں اس قدر عالی مرتبہ تصوّر کیا جاتا ہے۔ عنقریب کیسی ذلت اور گمنامی کی حالت میں گرنے والا ہے! ۱۹۱۱ء میں واقعات نے شیخ صاحب قبلہ کو فرائضِ ادارت سے قطعِ تعلق کر لینے پر مجبور کر دیا۔ اور مخزن دوسرے ہاتھوں میں چلا گیا ✣

مخزن سے شیخ صاحب کی علیحدگی۔ گویا جسم سے رُوح کی علیحدگی تھی۔ اگرچہ مخزن کے نئے مالک مولوی غلام رسول صاحب مرحوم نے ہنگامۂ جنگ اور کاغذ کی نایابی کے زمانے میں ہمت نہ ہاری مگر رسالے کی معنوی و ادبی حیثیت کو قائم رکھنا اُن کے بس کی بات نہ تھی۔ رسالے کے قلمی سرپرست

ادارت کی ناقابلیت کے سبب سے بددل ہونے لگے۔ مخزن رفتہ رفتہ ساری دل رُبائی اور دلفریبی کھو بیٹھا۔ مختلف قابل حضرات نے اس کی عنانِ ادارت سنبھالی۔ اور کوشش کی۔ کہ اسے پھر مقبول و محبوب بنائیں۔ لیکن بے سود۔ آخر رسالے کی کیا حالت ہوئی۔ اور یہ ذلّت کی کس انتہا کو پہنچا۔ اس امر سے اظہر من الشمس ہے۔ کہ اس کے ایک اڈیٹر صرف پانچ روپے اور دو وقت روٹی پر فرائضِ ادارت ادا کیا کرتے تھے۔

وہی مخزن تھا۔ اور اسے بلند معیار پر لانے کے لئے اس کے مالک بے دریغ روپیہ صرف کر رہے تھے۔ لیکن اڈیٹر کی ناتجربہ کاری اور چھچھورپنے نے اسے مشاعروں کی رپورٹوں اور انتخابات کا ایک ذلیل وادنٰی مجموعہ بنا کر ذوقِ سلیم کی نظروں سے گرا دیا۔ کہ بعد میں اسے سنبھالنے کی بہتیری کوشش کی گئی۔ اور مولانا بیدل مرحوم نے اسے کامیاب بنانے میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھی۔ لیکن رسالہ ۱۹۲۶ء میں دم توڑ گیا۔ آج میں اس جسمِ بے روح کو لے کر "مسیحا نفس ادیبوں" اور "ادب اُردو سے دلچسپی رکھنے والوں" کے سامنے آیا ہوں۔ اور خداوند تعالےٰ کی رحمت سے اُمید رکھتا ہوں۔ کہ وہ ان کو اس زبان کے پُرانے خادم کو دوبارہ زندہ کر دینے کی توفیق عطا فرمائے۔

(اڈیٹر)

مخزن کا نیا دَوْر

(از خان بہادر شیخ عبدالقادر بی۔ اے بیرسٹر ایٹ لا)

مجھے اس خبر سے بہت مسرّت ہوئی ہے کہ مخزن پھر نکلتا ہے۔ قدیم تعلقات کو ملحوظ رکھتے ہوئے مجھے سب سے پہلے اسے خیر مقدم کہنا چاہیئے۔ مخزن نے بیسویں صدی کے ساتھ جنم لیا اور بیس برس کے قریب ادبِ اُردو کی خدمت کرتا رہا۔ ان بیس برس میں دس برس اس کی خبرگیری میرے ذمے تھی۔ سفر میں حضر میں۔ سوتے جاگتے۔ اُٹھتے بیٹھتے یہ فکر رہتی تھی کہ کہیں سے مضامین نظم و نثر فراہم کروں جو شائقینِ ادب کی دلچسپی اور فائدے کا ذریعہ ہوں۔ میری قسمت کی یاوری کہیئے یا زبانِ اُردو

کی بخت بیداری سمجھئے کہ مخزن کی ابتدا ایسے وقت میں ہوئی جب زمانۂ حال کے بہترین صاحبانِ فن زندہ تھے اور ہونہار نوجوان اُن کی تصانیف سے فیض پا رہے تھے۔ شعرائے غزل گو میں داغ و امیر۔ قومی اور ملکی شاعروں میں حالی و اکبر۔ فسانہ نگاروں میں شرر و سرشار۔ مرثیہ گو حضرات میں نفیس و اوج و شاد۔ ناثروں میں نذیر احمد و شبلی موجود تھے۔ مگر مخزن نے یہ التزام کیا کہ ان اُستادوں کے بعد جو لوگ ان کی کرسیاں لینے والے تھے اُن کو مائل کیا کہ وہ میدان میں آئیں اور اپنی خداداد قابلیتوں کے جوہر دکھائیں۔ چنانچہ ناظر۔ نیرنگ حسرت اور اقبال کی نظمیں۔ اور ابوالکلام ظفر علی خاں۔ راشد الخیری اور حسن نظامی کی نثر مدتوں اَوراقِ مخزن کی زینت رہیں۔ رفتہ رفتہ کہنہ مشق مشاہیر بھی مائلِ امداد ہو گئے اور کبھی کبھی اُن کے نتائجِ افکار سے بھی مخزن کی رونق بڑھی۔ لیکن اس کی اصلی شہرت اور فروغ کا مدار اُس وقت کے نوجوان اہلِ قلم کی ایجاد پسند طبائع پر تھا۔ اُن کے زور سے مخزن نے فضائے ادب میں وہ بلند پروازیاں کیں جن کی داستانیں آج تک زبانوں پر ہیں ✤

یہ مخزن کا پہلا دَور تھا۔ اس میں وہ زمانہ شامل ہے جب مخزن لاہور سے عارضی طور پر ہجرت کر کے ۱۹۰۵ء میں دہلی چلا گیا تھا۔ گویا زبانِ اُردو کی طلب صادق اسے اُردو کے مرکز کی طرف کھینچ لے گئی تھی۔ جو تین سال دہلی میں گزرے کئی اعتبار سے اس کی زندگی میں خاص اہمیّت رکھتے ہیں۔ زبان کی صفائی جو اسے ہمیشہ ملحوظ تھی اُن دنوں اور ترقی کر گئی۔ بعض بہت نادر مضامین اُسی زمانے میں دستیاب ہوئے۔ کئی لاجواب کتابیں مطبعِ مخزن سے انہی دنوں میں شائع ہوئیں۔ اس کے علاوہ وہاں اُس وقت اہلِ علم وفن کا ایک جمگھٹا تھا۔ جو پھر میسّر آنا مشکل ہے ✤

۱۹۰۸ء میں مخزن پھر اپنے وطنِ مالوف یعنی لاہور میں آ گیا۔ اس کی مزید ترقی کے کئی خواب تھے جو پورے نہ ہو سکے۔ کیونکہ میں ۱۹۱۱ء میں لاہور سے لائل پور چلا گیا اور مجھے بادلِ ناخواستہ مخزن سے دست بردار ہونا پڑا۔ وہاں سے بیٹھ کر میں اس کا اہتمام نہ کر سکتا تھا۔ مجھے تلاش تھی کہ کوئی صاحب اسے جاری رکھنے کا ذمہ لیں۔ کہ اتفاق سے ایک بزرگ مولوی غلام رسول صاحب جو

قصور کے ایک ذی علم گھرانے سے تھے اور بہت علم دوست آدمی تھے۔ یہ بوجھ اپنے کندھوں پر اُٹھانے کے لئے آمادہ ہوئے۔ اور کئی سال تک انہوں نے بڑی ہمّت اور استقلال سے اپنے فرائض ادا کئے۔ اڈیٹری کے لئے انہیں مولوی احسان اللہ خاں صاحب تاجور نجیب آبادی مِل گئے۔ جنہوں نے نہایت ایثار کے ساتھ کئی سال مخزن کی اڈیٹری کی اور اس بات کی کوشش کی کہ اس رسالے کا ادبی معیار قائم رہے۔ اور تھوڑے عرصے کے لئے مولٰنا تاجور کے بعد بعض اور مشاہیر جن میں بیدل صاحب شاہجہاں پوری خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں کرسیٔ ادارت پر متمکن رہے۔ یہ رنگ قائم رہتا مگر بد قسمتی سے مولوی غلام رسول صاحب کا انتقال ہوگیا اور گو اُن کے بعد اُن کے بھائی اور جانشین مولوی ظہورالدین صاحب نے چند سال اُن کے قدم بہ قدم چلنے کی کوشش کی۔ مگر آخر میں کافی حوصلہ افزائی نہ دیکھ کر وہ رسالے کو بند کرنے پر مجبور ہو گئے۔

یہ مخزن کا دوسرا دَوْر تھا۔ گو دورِ اوّل کی کامیابی تو دورِ ثانی کو نصیب نہیں ہوئی۔ لیکن یہ دَوْر بھی بہت غنیمت تھا۔ جن مشکلات کا اڈیٹروں کو سامنا تھا اُن میں سب سے بڑی مُشکل یہ تھی۔ کہ پُرانے اہلِ قلم تو یکے بعد دیگرے رُخصت ہو چکے تھے یا رُخصت ہو رہے تھے۔ اور دَوْرِ اوّل میں جو نئے مشاہیر پیدا ہوئے تھے وہ موجود تو تھے مگر اُن میں سے اکثر ایسے مشاغل میں منہمک تھے کہ ادبی خدمات کے لئے وقت نکالنا اُن کے لئے دُشوار تھا۔ ان دُشواریوں کے باوجود جو سامان دَوْرِ ثانی کے اڈیٹروں نے مہیّا کیا۔ اس کے لئے وہ مستحقِ آفریں ہیں۔

اب یہ رسالہ پھر جاری ہوتا ہے۔ مولوی ظہورالدین صاحب اسے اپنے مرحوم بھائی کی نشانی سمجھتے ہیں اور اس پر روپیہ لگانے اور اس کے اہتمام کی خدمت اپنے ذمے لینے کو تیار ہیں۔ اڈیٹری کے لئے میرے دوست ابوالاثر حفیظ صاحب آمادہ ہوئے ہیں۔ اور اس نئے دَوْر میں سب سے زیادہ اُمید افزا یہی بات ہے۔ نوجوان شعرا میں حفیظ کا پایہ نہایت بلند ہے۔ اور اُن کے کلام میں سادگی اور تاثیر غیر معمولی درجہ رکھتی ہیں۔ جب کبھی وہ کسی مشاعرے میں اپنی نظم پڑھتے ہیں تو لوگ ازخود رفتہ ہو کر اُن کا کلام سُنتے ہیں۔ اور اُن کا جادُو بھرا ترنّم سونے پر سہاگا ہوتا ہے یہی نہیں۔ وہ نثر بھی خوب لکھتے ہیں۔ مگر کسی

ادبی رسالے کی اڈیٹری کے لئے جو صفت انہیں خاص طور پر موزوں بناتی ہے وہ یہ ہے کہ کئی نئے مضمون نگار اُن کے حلقۂ احباب میں ہیں۔ اور اُن سے گہرے مراسم رکھتے ہیں۔ مخزن کا نیا دَور اگر کامیاب ہوا تو اُن نئے آدمیوں کی بدولت ہوگا جو حفیظ صاحب کے ہم عصر ہیں۔ اور جن سے انہیں پوری امداد ملنی چاہیئے۔ جو لوگ میرے دست و بازو تھے۔ وہ بہت سا حصہ اپنے کام کا کر چکے۔ اور ماشاءاللہ مشاہیر ہیں۔ اُن سے کبھی کچھ مدد ملے گی تو تبرّک کا حکم رکھے گی۔ اب نئے سخنوروں کی باری ہے۔ وہ آئیں اپنا سکہ جمائیں۔ میں اُمّید کرتا ہوں کہ اُردو کے سب بہی خواہ حفیظ صاحب کی اس مخلصانہ سعی کی دل سے قدر کریں گے اور اُن کا حوصلہ بڑھائیں گے +

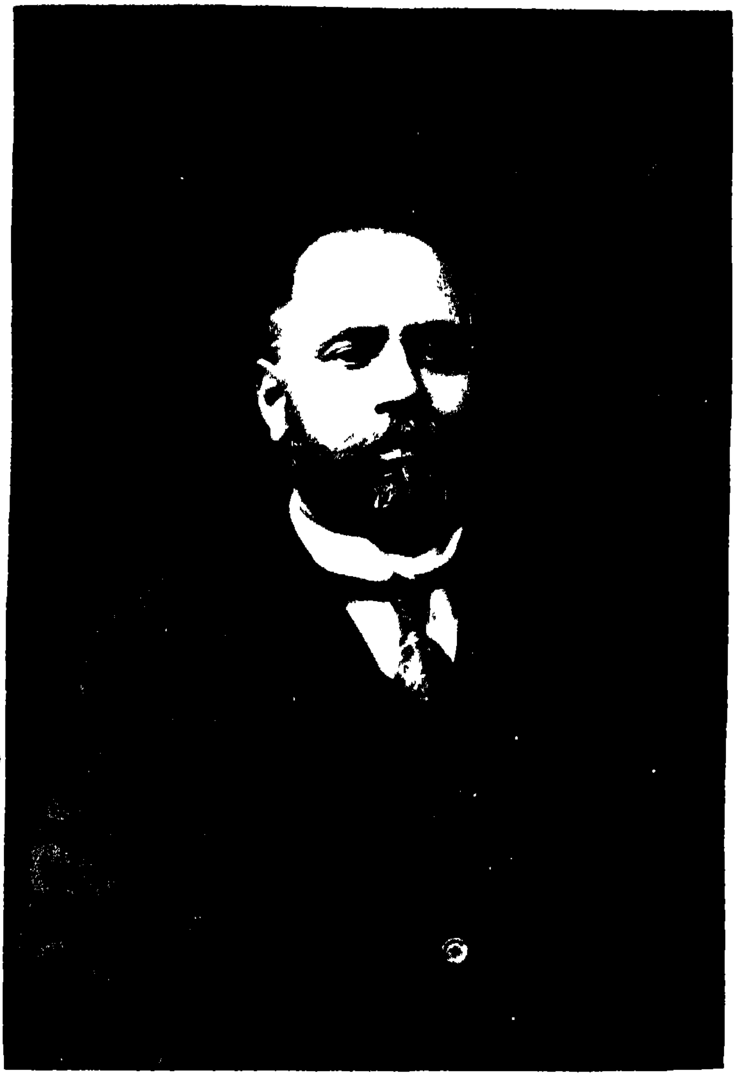
پیشتر اس کے کہ اس افتتاحی مضمون کو ختم کروں۔ ایک دو باتیں مخزن کی گزشتہ اور آئندہ روش کے متعلق کہنا چاہتا ہوں۔ جن سے شاید ادارت کو بھی کچھ مدد ملے اور ناظرین کو بھی معلوم ہو کہ انہیں اس رسالے کے دوبارہ شائع ہونے سے کیا توقعات ہونی چاہیئں۔ مخزن نے ہمیشہ یہ کوشش کی ہے کہ وہ محض ادبی رسالہ ہو۔ اور سیاسی یا مذہبی جھگڑوں میں نہ اُلجھے۔ میں اُمید کرتا ہوں کہ اس دورِ جدید میں بھی یہ خصوصیت قائم رکھّی جائے گی۔ البتہ زمانے کے بدلتے ہوئے حالات کو ملحوظ رکھتے ہوئے میں یہ مشورہ دیتا ہوں کہ جہاں عملی سیاسی معاملات پر غیر جانب داری کی ضرورت ہے اور اس کے مباحث کو اور اخباروں اور رسالوں کے لئے چھوڑنا چاہیئے۔ وہیں یہ مفید ہوگا کہ علم سیاسیات پر وقتاً فوقتاً مخزن میں مضامین شائع ہوتے رہیں۔ یہ ایک ایسی خدمت ہوگی جو کسی اور رسالے نے تا حال اپنے ذمّے نہیں لی۔ اور یہ ایسا مضمون ہے جس کی اہمیت آج کل پہلے سے بھی زیادہ ہوگئی ہے۔ پولیٹیکل سائنس (یعنی علم سیاسیات) کے متعلق انگریزی میں اور دیگر یورپی زبانوں میں اچھی اچھی کتابیں موجود ہیں۔ اُن سے بذریعہ ترجمہ یا اقتباس مضامین اخذ کئے جائیں اور سلیس اور عام فہم پیرائے میں پیش کئے جائیں +

ایک اور غرض جسے مخزن نے آج تک باقی سب اغراض پر مقدّم رکھا ہے۔ یہ ہے کہ اُردو جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے باہمی ارتباط کی یادگار اور مُلک کی مشترکہ زبان ہے۔

اس کی ترقی میں دونوں کر کوشش کریں۔ اسی سبب سے مذہبی اور سیاسی مضامین سے بچنے کا اصول پیشِ نظر رہا اور اسی لئے ڈھونڈ ڈھونڈھ کر ہندو اہلِ قلم سے امداد حاصل کی گئی۔ میں امید کرتا ہوں کہ اس غرض کی تکمیل اب بھی اسی قدر اہم سمجھی جائے گی۔ اب اس کی تکمیل کے لئے پہلے سے زیادہ سہولتیں پیدا ہو گئی ہیں۔ مخزن کے نکلنے کے بعد کئی اچھے اچھے رسالے اُردو میں نکلے جن کے اڈیٹر ہندو اہلِ قلم تھے۔ اُن میں سے بعض اب تک جاری ہیں۔ اُردو کے متعدد اخبار اب ہندوؤں کی اڈیٹری میں نکلتے ہیں۔ اُردو کے مشاعروں اور ادبی جلسوں میں ہندوؤں کی نہایت کثیر تعداد شوق سے حصہ لیتی ہے۔ اور اُن میں کئی بہت اچھی نثر یا نظم لکھتے ہیں۔ ان سب ذرائع سے جو کچھ میسر ہو۔ مخزن کو اس کا خزانہ بننا چاہیئے۔

ایک اور خصوصیت جو مخزن میں اس کے ابتدائی زمانے میں پائی جاتی تھی وہ یہ تھی کہ انگریزی فرانسیسی یا دیگر مغربی زبانوں کے ادبیات کے بہترین نمونے سلیس اور بامحاورہ ترجموں کے ذریعے اُردو داں صاحبان کے سامنے پیش کئے جاتے تھے۔ درمیان میں اس کام کی طرف وہ توجہ نہیں رہی جو چاہیئے تھی۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ خصوصیت بھی پھر قائم کی جائے۔ میری یہ آرزو ہے کہ سب رسالے جو اُردو میں شائع ہوتے ہیں ایک دوسرے کے ہمدرد ہوں۔ اور اپنے لئے ہر رسالہ ایک جُدا گانہ روش پیدا کرے جس سے ہر رسالہ دوسرے کے لئے ایک تکملہ ہو اور کسی نہ کسی پہلو سے کوئی ایسی خدمت سرانجام دے جو دوسری جگہ انجام نہ دی جا رہی ہو۔ یہ دوستانہ مشورے دیتے ہوئے میں مخزن کو دوبارہ زندگی پانے پر مبارک باد دیتا ہوں۔ اور دعا کرتا ہوں کہ یہ زندگی دیرپا ثابت ہو۔

عبدالقادر



خان بہادر شیخ عبدالقادر بی۔اے۔ بیرسٹرایٹ لا

شہزادۂ خُسرَوُ کی بغاوت

(از ڈوجیرک)

پچھلے دنوں تاریخ ہند کے بعض واقعات اور شخصیتوں کے متعلق ایک دلچسپ کتاب "آکسفورڈ یونیورسٹی پریس" سے شائع ہوئی تھی۔ جس میں تاریخ کی مختلف کتابوں سے مضامین ترجمہ کرکے درج کئے گئے ہیں + اس کتاب میں ایک مضمون شہزادۂ خسرو کی بغاوت پر بھی درج ہے۔ جوفرانسیسی کی ایک نایاب تاریخ سے ترجمہ ہوا ہے + یہ تاریخ جس کا بہت کچھ مغلوں سے تعلق ہے۔ ابھی تک انگریزی زبان میں مکمل منتقل نہیں ہونے پائی۔ لہذا مضمون کو پیش کرنے سے پیشتر اس کا مختصر تذکرہ کرنا نامناسب نہ ہوگا +

کتاب کے مصنف کا نام پادری پیرڈوجیرک ہے اور کتاب کا مکمل نام یہ ہے۔

"اُن یادگار واقعات کی تاریخ جو ایسٹ انڈیز اور اُن ممالک میں جنہیں پرتگیزوں نے دریافت کیا تھا۔ مسیحی مذہب اور کیتھولک عقیدے کے قائم ہونے اور ترقی پانے کے دوران میں رونما ہوئے۔ اور جس میں خصوصیت سے اس امر کا ذکر ہے۔ کہ اس مقصد کے لئے مسیحی انجمن کے پادریوں نے وہاں پہنچنے کے زمانے سے لے کر سنہ ۱۶۱۰ء تک کیا کچھ کیا۔ اور کیا کیا مصیبتیں اُٹھائیں" +

اس کتاب کے تین حصے ہیں۔ جو سنہ ۱۶۰۸ و سنہ ۱۶۱۰ء اور سنہ ۱۶۱۴ء میں شہر بورڈو میں شائع ہوئے تھے + یہ تاریخ جو تالیف کی حیثیت رکھتی ہے۔ اُن خطوط سے معلومات اخذ کرکے مرتب کی گئی ہے۔ جو پرتگال میں مسیحی انجمن کے ہندوستانی ممبروں سے موصول ہوتے تھے + جن خطوط کا تعلق سترھویں صدی کے قرن اوّل سے تھا۔ اُنہیں پادری فرنینڈ گوریرو نے پہلے ہی جمع کرکے مرتب اور شائع کر دیا تھا + اسی مجموعے سے ڈوجیرک نے اپنی تاریخ کے تیسرے حصّے کا مواد حاصل کیا + شہزادۂ خسرو کی بغاوت بھی تیسرے ہی حصّے سے ترجمہ کی گئی ہے + اگرچہ

اس بیان میں کوئی ایسی بات نہیں۔ جو پروفیسر بینی پرشاد (الہ آباد) اپنی قابلِ قدر تصنیف "ہسٹری آف جہانگیر" میں بیان نہیں کر چکے۔ تاہم بعض مقامات پر تھوڑا بہت اختلاف ہے۔ اور اس کے علاوہ ڈو جیرک کے الفاظ کو اُردو میں پیش کرنا نامناسب نہیں معلوم ہوتا +

اکبر اعظم کی وفات کے آٹھ روز بعد اُس کا فرزند اکبر اور جانشین انصرامِ سلطنت اپنے ہاتھ میں لینے کی غرض سے قصر میں داخل ہؤا۔ جب ایک تخت گاہ کھڑی کر کے شاہانہ تکلف سے آراستہ کر دی گئی۔ اور تخت جو بعجلت تمام تیار کیا گیا تھا۔ اس پر رکھ دیا گیا۔ تو وہ آ کر جلوہ افروز ہو گیا + اس وقت تمام لوگوں نے "بادشاہ سلامت" کے نعرے لگائے۔ اور جب سب لوگ نذریں پیش کر چکے۔ تو وہ اپنے قلعے کو مراجعت کر گیا۔ اور وہیں پر سکونت اختیار کر لی + تمام دُنیا کو عموماً اور جیزوئٹ پادریوں اور عیسائیوں کو خصوصاً نئے بادشاہ سے بڑی بڑی توقعات تھیں + وہ ان سے ہمیشہ بہت مرحمت سے پیش آیا تھا۔ اور اس طرح اُس نے ان کے دل میں یہ اُمیدیں پیدا کر دی تھیں۔ کہ وہ سریر آرائے سلطنت ہو گا۔ تو اس کے مقبوضہ علاقے کے مذہبی معاملات میں انقلاب عظیم پیدا ہو جائے گا۔ اور اُس کے وابستگانِ دامن عیسائی مذہب قبول کریں گے + اس کی ایک یہ وجہ بھی تھی۔ اب تک اکثر لوگ اسے عیسائی ہی سمجھتے تھے۔ اور اس کے بے تکلف دوست علے الاعلان اس کا عقیدہ یہی بتاتے تھے۔ لیکن ان اُمیدوں کا انجام مایوسی مقدر تھا۔ کیونکہ مسلمانوں نے اس سے شرع محمدی کی حفاظت کی قسم لے لی۔ نیز اپنے عہدِ حکومت کے آغاز ہی میں مسلمان رعیت کی اُلفت اور اتحاد حاصل کرنے کی آرزو میں اس نے ہر ممکن طریق سے ان پر احسانات کرنے شروع کر دئے۔ تاکہ اس طرح اس کا تخت و تاج زیادہ محفوظ و مصئون ہو جائے+ اس نے ان کی تمام مساجد کو صاف کروایا۔ نماز کی پابندی پر زور دیا۔ اور ایک نیا لقب نور الدین محمد جہانگیر اختیار کر لیا۔ جس کے معنے ہیں "شرعِ محمدی کا اُجالا اور فاتح عالم"+ پادریوں سے اس نے کچھ اعتنا نہ کیا۔ اور ان سے اس طرح پیش آیا۔ گویا پہلے کبھی دیکھا ہی نہیں +

کچھ عرصے بعد اس کے بیٹے نے اس کے

خلاف اُسی طرح بغاوت کر دی۔ جس طرح خود اُس نے اپنے باپ شہنشاہ مرحوم کے خلاف بغاوت کی تھی۔ لیکن اس کے نتائج بہت مختلف نکلے۔ جو ہم بیان کریں گے +

اپنے باپ کو برہم کر چکنے کے بعد اس پر سے نوجوان شہزادے کا اعتماد ایسا اُٹھا۔ کہ ۱۰ اپریل ۱۶۰۶ء کو وہ رات کے وقت کانوں کان خبر ہوئے بغیر کہ کہاں جا رہا ہے اپنے بعض نہایت بےتکلف دوستوں کی معیت میں قلعے سے نکل کھڑا ہوا + اس کے خدام نے یہ ظاہر کیا کہ شہزادہ اپنے دادا کے مقبرے کی زیارت کو جا رہا ہے۔ چنانچہ اس بہانے اس کو شاہی محافظوں کے درمیان سے گزر جانے میں کچھ دشواری پیش نہ آئی + لیکن تھوڑے ہی عرصے بعد اس کے ساتھیوں نے اسے سلطان جاہ کے لقب سے یاد کرنا اور لڑائی کے لئے گھوڑے اور دوسرا سامان فراہم کرنا شروع کر دیا + جب یہ خبر بادشاہ کے کانوں تک پہنچی تو اُس نے اپنے مشیروں کو طلب کیا۔ جنہوں نے اس طرح طرح کے مشورے دیئے + سب کچھ سُن کر اُس نے یہ تصفیہ کیا۔ کہ اپنے بیٹے کے خلاف خود ہی فوج کشی کرے۔ چنانچہ سپیدۂ سحر پھوٹتے ہی اُس نے کوچ کر دیا +

اس اثناء میں اُس کا بیٹا ایک بڑے صوبے[لہ] دار پر جا پڑا + یہ صوبے دار لاہور سے چل کر بادشاہ کے حضور میں آگرے جا رہا تھا جہاں بادشاہ کے باپ کا انتقال ہوا تھا۔ اور جہاں اب تک دربار ہو رہا تھا۔ شہزادے نے طرح طرح کے وعدوں اور دھمکیوں سے اسے اس بات پر آمادہ کر لیا۔ کہ بادشاہ سے منحرف ہو کر اپنی افواج سمیت اسی سے مل جائے + اس کے بعد شہزادہ ایک دوسرے صوبے دار پر جا پڑا۔ جو ایک لاکھ روپیہ لے کر بادشاہ کی خدمت میں روانہ ہوا تھا + روپیہ چھین کر اُس نے اس کو بھی اپنی امداد پر تیار کر لیا۔ اس کے بعد اپنے ساتھیوں کو اپنے سے اَور زیادہ وابستہ کرنے کے لئے نہایت فراخ دلی سے یہ روپیہ اور مالِ غنیمت اُن میں تقسیم کر دیا + اس فیاضی کی خبر پھیلنے کی دیر تھی۔ کہ بہت جلد شہزادے کی جماعت کی تعداد بارہ ہزار تک پہنچ گئی۔ اور جب وہ لاہور پہنچا۔ جو آگرے سے تین سو میل کے

لہ حسین بیگ بدخشی (ہسٹری آف جہانگیر از پروفیسر بینی پرشاد ایم۔ اے)

فاصلے پر واقع ہے۔ تو اُس وقت ایک نہایت طاقتور فوج کا رہنما بن چکا تھا ◆

لیکن اہلِ[1] لاہور نے یہ سُن پایا تھا۔ کہ شہزادہ اپنے باپ کے ہاں سے فرار ہو کر آیا ہے۔ اُنہوں نے شہر کے دروازے بند کر دئے۔ اور شہزادے کو اندر داخل ہونے کی اجازت نہ دی ◆ اس پر شہزادہ غضب ناک ہو گیا۔ اور اُس نے شہر کا محاصرہ کر کے آٹھ دن تک اُسے گھیرے رکھا ◆ لیکن وہ اِس شہر کو تسخیر نہ کرنے پایا تھا۔ کہ اسے اطلاع پہنچی۔ کہ اس کا باپ افواج سمیت اس سے لڑنے کو آ رہا ہے۔ اور بہت قریب آن پہنچا ہے ◆ یہ معلوم ہوتے ہی شہزادے نے محاصرہ اُٹھا لیا۔ اور باپ سے مقابلہ کرنے کو پلٹ پڑا۔ اور ارادہ کر لیا۔ کہ اسے دریائے راوی کو جو دونوں کے درمیان حائل تھا عبور نہ کرنے دے ◆ لیکن وہ کچھ زیادہ مستعدی سے کام نہ لے سکا۔ اور اس کے باپ کی کچھ فوج نے پہلے ہی دریا کو عبور کر لیا ◆ اس بدنصیب شہزادے کی مصیبتوں میں اضافہ کرنے کو ایک یہ آفت آئی۔ کہ ساری رات بارش ہوتی رہی۔ سپاہی عام طور پر تیر کمان سے لڑا کرتے تھے۔ کمانیں بارش سے سیل گئیں۔ چنانچہ وہ نہ اپنے اسلحہ بوجہ احسن استعمال کر سکے۔ اور نہ گھوڑوں ہی سے کام لے سکے ◆ پھر بھی اپنا سب کچھ بازی پر لگا کر شہزادے نے اس فوج پر دھاوا بول دیا۔ جس نے دریا کو عبور کر لیا تھا ◆ اُن میں سے بہت سوں کو تہ تیغ کر ڈالا۔ اور جو باقی تھے اُن کے بھی پاؤں اُکھیڑ ڈالتا۔ کہ اس کے باپ کے ایک افسر نے حکمتِ عملی سے کام لیا ◆ اس نے اپنے بہت سے پیادوں کو پیام بروں کا بھیس بدلوا کر کہہ دیا۔ کہ شہزادے کی فوج میں مل جائیں۔ اور ہر طرف یہ خبر پھیلاویں۔ کہ بادشاہ بہ نفس نفیس دریا کو عبور کر چکا ہے۔ اور ایک بہت بڑی فوج کے ساتھ نہایت تیزی سے بڑھا چلا آ رہا ہے ◆ کسی سپاہی نے یہ خبر یہاں پھیلائی۔ کسی نے وہاں۔ غرض ذرا سی دیر میں شہزادے کی تمام فوج نے اس اطلاع کو سچ سمجھ لیا ◆ کچھ دیر بعد اس افسر نے حکم دیا۔ کہ شہنائیاں اور دمامے بجائے جائیں تاکہ یہ ظاہر ہو۔ کہ بادشاہ آن پہنچا ہے ◆

لیکن شہزادہ موقعے سے ہر ممکن فائدہ

[1] لاہور کا حاکم دلاور خاں تھا۔ (ہسٹری آف جہانگیر از پروفیسر بینی پرشاد ایم۔ اے)

حاصل کرنے پر تُلا ہوُا تھا۔ اس نے اپنا حملہ جاری رکھا۔ اور ارادہ کر لیا۔ کہ کم از کم شاہی فوج کے اس حصّے کے پاؤں اُکھیڑ ڈالے۔ اس کو اُمید تھی۔ کہ اس طرح شاید باقی فوج کا بھی حوصلہ ٹوٹ جائے۔ اور اُس کو کامیابی نصیب ہو۔ لیکن قدرتِ خداوندی جو اس قسم کی کوششوں کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتی ہے۔ مخل ہوئی۔ اور اس کے ہمراہیوں کے حوصلے پست ہو گئے۔ غلطی سے یہ یقین کر کے کہ بادشاہ سر پر آن پہنچا ہے۔ وہ سہم گئے۔ اس کی موجودگی کے خیال ہی سے ان کی حالت غیر ہو گئی۔ اور باہم مشورہ کرنے کے بعد وہ سب بھاگ نکلے۔ شہزادہ ان کی بات نہ سُنتا تھا۔ لیکن اس کے جرنیل نے اس کے گھوڑے کی باگ پکڑ کر اسے مُڑ جانے پر مجبور کر دیا۔ اور کہا۔ کہ تم تباہی کے مُنہ میں جارہے ہو۔ اتنی سی بات سے شہزادے کی بنی بنائی بازی بگڑ گئی۔ اس کی فوجوں نے جب دیکھا۔ کہ اس نے دشمن کو پیٹھ دکھا دی ہے۔ تو میدان چھوڑ کر بھاگنا شروع کر دیا۔ سب منتشر ہو کر نہایت بدنظمی کے ساتھ اِدھر اُدھر بھاگ گئے۔ دشمن نے سُرعت سے اُن کا تعاقب کیا۔ اور اُن میں سے اکثر کو موت کے گھاٹ اُتار دیا۔

اس اثناء میں بادشاہ نے دریا عبور کر لیا۔ اور چونکہ شہزادے نے کابل کا رُخ کر لیا تھا۔ اس لئے یہ فرمان دے کر قاصد روانہ کر دئے۔ کہ اگر وہ کہیں سے دریا (چناب) کو عبور کرنا چاہے۔ تو اُس کو گزرنے کی اجازت نہ دی جائے۔ جب تک شہزادہ دریا پر پہنچا۔ بادشاہ کے قاصد بھی وہاں پہنچ چکے تھے۔ حاکم نے فوراً احکام صادر کر دئے۔ کہ کشتیاں جو عام طور پر دریا میں تیار رکھی جاتی ہیں۔ سوائے ایک کے سب ہٹا لی جائیں۔ اور جب شہزادہ آ کر دریا پار کرنے کی خواہش ظاہر کرے۔ تو ملّاح کشتی کو کھے کر دریا کے درمیان ریتے میں پھنسا دیں۔ اور پھر کشتی نکالنے کے لئے امداد لانے کا بہانہ کر کے آئیں۔ اور اطّلاع دے جائیں۔ ملّاحوں نے مو بمو ہدایات کی تعمیل کی کشتی کو ریت کے جزیرے میں یوں پھنسا دیا۔ گویا محض سوءِ اتفاق سے یہ حادثہ ہو گیا ہے۔ اور پھر فوراً آ کر حاکم کو اس امر کی اطّلاع دے دی۔ حاکم دوسری کشتی میں سوار ہو کر شہزادے کی طرف روانہ ہوُا۔ شہزادے کے ہمراہ اُس کی فوج کے افسر اور دو ایک اور لوگ بھی تھے۔ حاکم حسبِ معمول آدابِ شاہی بجا لایا۔ اور پھر بغیر کسی قسم کا شبہ پیدا کرنے کے اُن سب کو

ع۱ پروفیسر بینی پرشاد کی تاریخ میں درج ہے۔ کہ ابوالقاسم نمکینی نے لڑائی کے بعد شہزادے کو گرفتار کیا۔

اپنے قلعے میں لے گیا۔ جب اس کے قیدی حفاظت سے قلعے میں اُتر چکے۔ تو وہ کھانا تیار کروانے کا عُذر کر کے چلا آیا۔ اور دروازے کو باہر سے مقفل کر دیا۔ جو سپاہی شہزادے کے پیچھے پیچھے آئے تھے۔ اُنہوں نے جب دیکھا۔ کہ وہ قید ہو چکا ہے۔ اور اُسے امداد پہنچانے کا کوئی ذریعہ بس میں نہیں رہا۔ اُدھر دریا پر کشتیاں موجود نہ ہونے کی وجہ سے اس کو عبور کرنا بھی ناممکن ہے۔ تو وہ اطراف وجوانب میں منتشر ہو کر روپوش ہو گئے ۔

اس اثنا میں بادشاہ اپنے فرزند کی نقل وحرکت کے متعلق نہایت فکرمندی کی حالت میں لاہور کی طرف بڑھا چلا آرہا تھا۔ جب وہ شہر کے قریب پہنچا۔ تو کمپنی کے پادری اُس کی تعظیم وتکریم بجالانے کی غرض سے شہر سے باہر چلے آئے۔ چھ میل کا سفر کیا ہوگا۔ کہ بادشاہ اپنی افواج کی سرکردگی میں آتا ہوا مِل گیا۔ دونوں طرف نہایت سلیقے سے افواج کے دو دستے آرہے تھے۔ اور درمیان میں بادشاہ سلطنت کے بعض نہایت بلند مرتبہ اُمرا کی معیت میں چلا آرہا تھا۔ لوگ اس کے لئے راستہ صاف کرتے جاتے تھے۔ اور جس کسی سے دوچار ہوتے اُسے سڑک پر سے گزرنے نہ دیتے تھے۔ لیکن پادریوں کو گزرنے کی اجازت مِل گئی۔ اور بڑھتے بڑھتے وہ بادشاہ کے حضور میں پہنچ گئے۔ بادشاہ نے اُن کو دیکھ کر گھوڑے کی باگیں کھینچ لیں۔ اور اس کے ساتھ ہی تمام فوج بھی تھم گئی۔ پادریوں نے اس کی ران کو اپنے سینے سے لگا لیا۔ اور حضور ملک معظم نے نہایت خندہ پیشانی سے اُن کی مزاج پُرسی کی۔ اور جو چھوٹا سا تحفہ اُنہوں نے پیش کیا اُسے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اس کے بعد اُنہیں رُخصت کا اشارہ کر کے پھر کوچ شروع کر دیا۔ شام کے قریب اسے اطلاعات موصول ہوئیں۔ کہ اس کا بیٹا قید ہو چکا ہے۔ چنانچہ اُسی وقت صوبے داروں میں سے ایک کو روانہ کیا۔ کہ نہایت سخت پہرے میں اُسے لے کر آجائے ۔

جس قلعے میں شہزادہ قید تھا۔ وہاں پہنچ کر صوبے دار نے بغیر ادب آداب یا اخلاق ظاہر کرنے کے وہ زنجیریں نکالیں۔ جن پر مخمل منڈھی ہوئی تھی۔ اور جو پہلے ہی سے اسے دے دی گئیں تھیں۔ اور کہا بادشاہ کا فرمان ہے۔ کہ یہ آپ کے پیروں میں ڈال دی جائیں۔ اس طرح اُس کو قابو میں لانے کے بعد اور اُن دوسرے لوگوں کو ہمراہ لے کر جو اُس کے ساتھ قید تھے۔ وہ نہایت احتیاط سے

سخت پہرے کے ساتھ روانہ ہوگیا۔ اس کی واپسی پر بادشاہ نے ایک ہاتھی جس کا سامان نہایت ذلیل تھا۔ شہزادے کو دریا سے پار لانے کے لئے روانہ کیا۔ اور حکم دیا کہ اُسے نشاط[1] محل میں جہاں بادشاہ مقیم تھا لایا جائے۔ اُس کی آمد کی خبر سُن کر بادشاہ اُٹھ کر اندر مکان میں چلا گیا۔ غالباً اس خیال سے کہ جذباتِ پدری کے خروش کو تنہائی میں ٹھنڈا کر آئے۔ لیکن ذرا سی دیر میں وہ باہر آگیا۔ اور حکم دیا۔ کہ شہزادے کو لایا جائے۔

تمام دربار اُمید و بیم کی حالت میں شاہی فیصلہ سُننے کا منتظر تھا۔ غریب شہزادہ دست و پابستہ اپنے باپ کے حضور میں لایا گیا۔ تو جتنے لوگ موجود تھے۔ سب بے انتہا متاثر ہوئے۔ جوں ہی شہزادے نے بادشاہ کو دیکھا۔ دور ہی سے ادب و احترام ظاہر کرنا شروع کر دیا۔ بادشاہ نے اُسے نزدیک بلوایا۔ اور جو صوبے دار اور درباری وہاں موجود تھے۔ اُن میں بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔ اس کے بعد غصے سے تمتایا ہوا چہرہ اُس کی جانب کر کے نہایت جگر خراش الفاظ میں اپنی ناراضگی کا اظہار کیا۔ وہ صوبے دار بھی جو اُس کی جماعت میں شامل تھے۔ سامنے بلوائے گئے۔ اُن میں سے ایک بادشاہ کا نامی صوبے دار تھا۔ اور مختلف اہم مواقع پر خدمات بجالاتا رہا تھا۔ اور دوسرا خزانچی اور لاہور شہر کا حاکم تھا۔ یہ دونوں اس کے سامنے بھاری زنجیروں میں جکڑے ہوئے کھڑے تھے۔ تو بادشاہ نے غصے کے طور پر مذاق میں کہا۔ کہ "صوبے داروں نے کیا خوب بادشاہ منتخب کیا۔ اور بادشاہ نے اپنی لاثانی مہم میں امداد کے لئے کیا خوب صوبے دار منتخب کئے ہیں"۔

قصہ مختصر بادشاہ نے شہزادے کو اپنے ایک صوبے دار کے سپرد کر دیا۔ اور احکام صادر کئے۔ کہ اس کی نہایت سختی سے حفاظت کی جائے۔ اور اس کے پیروں سے سلاسل دُور نہ کی جائیں۔ صوبے داروں میں سے جو پیش تھا۔ اُسے برہنہ کر کے ایک نئے ذبح کئے ہوئے بیل کی کھال میں سلوا دیا گیا۔ خزانچی کو اسی طرح برہنہ کر کے ایک گدھے کی کھال میں سلوایا گیا۔ جو اسی مقصد کے لئے ذبح کیا گیا تھا۔ کھالیں خوب کھینچ کر سی گئیں۔ تاکہ جب وہ رفتہ رفتہ سوکھیں اور سکڑیں تو زیادہ تنگ ہوتی جائیں۔ اور اسی طرح مجرموں کو زیادہ عذاب پہنچ سکے۔ وہ تمام رات اسی حالت میں رکھے گئے۔ اور صبح کو اسی ملبوس

[1] مرزا کامران کا باغ (ہسٹری آف جہانگیر)

میں تشہیر کئے گئے۔ ایک کی کھال پر سر کے قریب بیل کے سینگ تھے۔ اور دوسرے کے گدھے کے کان۔ اور دونوں کو گدھوں پر اس طرح سوار کیا گیا تھا۔ کہ اُن کے چہرے دُم کی طرف تھے؂

اس سزا نے لوگوں کو متحیر کر دیا۔ کیونکہ اُنہوں نے پچھلی مرتبہ ان ہی لوگوں کو اسی لاہور شہر میں نہایت بیش قیمت لباس پہنے۔ نہایت اعلےٰ سواریوں پر گزرتے دیکھا تھا۔ اور اُن کی اُس حالت اور موجودہ حالت میں زمین آسمان کا فرق تھا؂ جب وہ نشاط محل میں واپس آئے۔ جہاں بادشاہ موجود تھا۔ تو صوبے دار پر احساس ذلّت بے انتہا غالب آیا۔ کہاں وہ شان وشوکت کہ نہایت تزک وشان سے ہاتھیوں اور گھوڑوں اور جلو برداروں کے ساتھ بازاروں میں سے گزرا تھا۔ اور کہاں یہ ذلّت۔ اس میں کھڑے ہونے کی سکت بھی باقی نہ رہی۔ اور وہ مرکر زمین پر آرہا؂ بادشاہ نے حکم دے دیا۔ کہ اس کا سر کاٹ کر آگرے بھیجا جائے۔ اور وہاں شہر کے دروازے پر ٹانگا جائے؂ جسم کے چار حصّے کئے گئے۔ اور رہگزروں پر بانس گاڑ کر اُن پر ٹانگے گئے۔ تاکہ اس قسم کی شرانگیز کارروائیاں کرنے والوں کو عبرت حاصل ہو؂

خزانچی کو کھال میں سی کر چھوڑ دیا گیا۔ لیکن بادشاہ نے خاص مرحمت سے کام لے کر اس بات کی اجازت دے دی۔ کہ اس کے ملازم کھال کو باہر سے تر کرتے رہیں۔ تاکہ وہ اسے زیادہ سختی سے نہ جکڑنے پائے؂ لیکن اس طرح اسے جتنی تسکین ہوئی۔ اُس کا معاوضہ اور زیادہ تکلیف اُٹھا کر ادا کرنا پڑا؂ نمی سے مچھر اور کیڑے اس قدر جمع ہو گئے۔ کہ اس کو پہلے سے بھی زیادہ عذاب پہنچنے لگا۔ مزید براں سورج کی حرارت سے کھال سڑ گئی۔ اور اُس میں سے ایسی بُری بُو آنے لگی۔ کہ کوئی قریب جانے کا روادار نہ ہوتا تھا؂ لیکن آخر میں بادشاہ نے عنایت خُسروانہ سے کام لے کر اُس شخص کو معاف کر دیا؂ چونکہ اب بادشاہ کی آرزو یہ تھی۔ کہ اپنی ایک بیٹی سے اُس کی شادی کر دی جائے۔ اس لئے اس قدر افزائی کے شکرئے میں اسے پچیس لاکھ روپیہ ادا کرنا پڑا؂ جس روز اُس نے روپیہ ادا کر دیا۔ اُسی روز شام کو اُسے کھال میں سے نکال لیا گیا۔ شہر میں لے گئے۔ اور چند روز میں وہ چلنے پھرنے کے قابل ہو گیا؂ آخر کار بادشاہ کی نظرِ عنایت حاصل ہونے کے بعد وہ پھر اپنے

پُرانے عہد سے پر سرفراز کر دیا گیا +

بہت سے سپاہی بھی جنہوں نے شہزادے کا ساتھ دیا تھا گرفتار کر لئے گئے تھے + جس روز بادشاہ شہر میں داخل ہوا۔ اُس کے حکم سے دوسو اعضا بُریدہ یا برسر دار راستے کے دونوں طرف موجود تھے + اُن میں سے بہت سے ایسے تھے۔ جو بادشاہ کے مصاحبوں اور منظورِ نظر اُمرا کے رشتے دار تھے۔ لیکن اُن کے لئے اس ڈر کے مارے کسی کو زبان کھولنے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ کہ کہیں ہم بھی شہزادے کے جانب داروں میں نہ شمار کر لئے جائیں +

بادشاہ ایک نہایت آراستہ ہاتھی پر سوار سڑک پر سے گزر رہا تھا۔ ہر مجرم کے متعلق اسے کچھ بتایا جاتا اور وہ اِدھر اُدھر سر پھیر کر اُن کو دیکھتا جاتا تھا + بادشاہ سے کچھ پیچھے شہزادہ آرہا تھا۔ اس کے پیروں میں اب تک زنجیریں پڑی تھیں۔ اور وہ ایک چھوٹے سے ہاتھی پر سوار تھا۔ جس پر نہ عماری تھی۔ اور نہ دوسرا سامان آرائش +

شہر میں داخل ہونے کے بعد بادشاہ نے شہزادے کو اپنے محل میں قید کر دیا + اب تک اس کو بیڑیاں پہنا رکھی تھیں۔ مگر پہلے کی نسبت کسی قدر ہلکی تھیں +

بہت جلد بادشاہ نے اس کے خطابات اور اس کے حقوق چھین کر اپنے دوسرے بیٹے کو دے دئے۔ اور اُسے معزول کر کے جانشینی کے حق سے محروم کر دیا + جس صوبے دار کا سر بادشاہ نے کٹوا ڈالا تھا۔ اس کی املاک سے پچیس لاکھ روپیہ بادشاہ کو وصول ہؤا۔ اور دوسرے ملزموں سے گراں قدر رقم ہاتھ آئی + یہ سب روپیہ بادشاہ نے اپنے خزانے میں داخل کر دیا۔ اور جو گھوڑے اور دوسری چیزیں اپنے بیٹے سے چھینی تھیں۔ وہ اُن لوگوں کو دے ڈالیں۔ جنہیں شہزادہ اپنا سب سے بڑا دشمن تصور کرتا تھا۔ تاکہ اسے اَور بھی زیادہ افسوس اور صدمہ ہو + اس طرح خدا اُن بچوں کو جو اپنے والدین کے خلاف بغاوت کرتے ہیں اسی زندگی میں سزا دیتا ہے +

سید امتیاز علی تاج۔ بی۔ اے

مدنیات

تعلیم اور عملی زندگی میں

(از پرنسپل عبداللہ یوسف علی سی۔ بی۔ ای۔ ایل ایل ایم (کنٹب)
(ترجمہ از جناب محمد دین صاحب تاثیر ایم۔ اے)

مدنیات[1] کا مضمون بالکل اچھوتا ہے۔ اس موضوع پر بہت کم کتابیں دستیاب ہو سکتی ہیں۔ اردو تو کیا انگریزی زبان میں بھی ایک دو کتابیں بمشکل نکلیں گی۔ جو ہمارے ہندوستان کے حالات پر لکھی گئی ہوں جس طرح یہ مضمون نرالا ہے۔ اسی طرح یہ اصطلاح بھی ہندوستان کے لئے بالکل نئی ہے +

آج سے دس برس پہلے تعلیمی ادارات[2] کے سلسلے میں "مدنیات" کا تذکرہ بحیثیت ایک مستقل مضمون کے شاذ و نادر ہی کیا جاتا تھا۔ بلکہ آج تک اسے تعلیم کے جملہ شعبوں میں رائج نہیں کیا گیا۔ نہ یہ فیصلہ کیا گیا ہے۔ کہ اس کا موضوع کیا کچھ ہو۔ اس کی طرزِ تدریس کیا ہے۔ اور نہ یہ معلوم ہے۔ کہ اس کا تعلق دوسرے مضامین سے کیا ہے +

"تعلیم اور عملی زندگی میں مدنیات" اس عنوان سے میرا یہ مدعا نہیں کہ میں اس مسئلے کے دونوں پہلوؤں پر الگ الگ روشنی ڈالوں۔ اس وقت میں یہ ظاہر کرنا چاہتا ہوں۔ کہ "مدنیات" جیسے مضمون کو محض ایک نظریاتی مضمون قرار نہیں دیا جاسکتا۔ کیونکہ اسے ہماری روزمرہ کی زندگی کے حقائق کے ساتھ گہری وابستگی ہے۔ اور یہ وابستگی ہمیشہ برقرار رہنی چاہیئے +

دستورِ حکومت کے نظریئے قدرتاً سیاسیات اور اس کے متعلقہ مضامین سے وابستہ ہیں۔

---

[1] Civics

[2] Institutions

اور یہ بحث گھر بیٹھے مطالعہ خانے میں بھی طے ہو سکتی ہے۔ کہ کون کون سے ادارے تہذیب کے کن کن مخصوص مظاہر یا مخصوص معاشری اور اقتصادی حالات کے لئے مناسب ہیں۔ یہ اُلجھے ہوئے گیسو روزانہ زندگی کی مشاطگی سے بھی سُلجھائے جا سکتے ہیں۔ اور یہ پیچ و خم کونسل ہال کی آہن گری سے بھی نکالے جا سکتے ہیں۔ اس میں بھی شک نہیں۔ کہ مدنیات میں ہمارا واسطہ۔ تصوّرات و ادارات ہی سے ہے۔ مگر تاہم یہ کہنا پڑتا ہے۔ کہ "مدنیات" کو ایک مخصوص زاویہ نگاہ سے دیکھنے کی ضرورت ہے +

یہ ایک ایسے شہری کا زاویۂ نگاہ ہونا چاہئے۔ جو اپنے اردگرد چند ادارے دیکھتا ہے۔ ان کے مقاصد۔ معانی اور اہمیت کو سمجھنا چاہتا ہے۔ اور یہ کوشش کرتا ہے۔ کہ اپنے اندر شہریت کی وہ رُوح پیدا کر سکے۔ جو دَورِ حاضرہ کی تمام اعلےٰ معاشرتوں کی بُنیاد ہے + اور جس کا تذکرہ میں بالتفصیل کرنے والا ہوں +

"معلم"

معلّم تعلیم کے ذریعے سے نئی نسل کا خلّاق ہوتا ہے۔ اور اگر معلّم خلاقِ قوم ہونے کی حیثیت میں معراجِ کمال تک پہنچے۔ تو اُسے قوموں اور لوگوں کے خیالات اور سپرٹ کو نئے قالب میں ڈھالنے کے ایسے ایسے مواقع حاصل ہو سکتے ہیں۔ جو زندگی کے دوسرے شعبوں میں شاید ہی مل سکیں۔ وجہ یہ ہے۔ کہ انسانی اطوار اور وجدانیات کی نشو و نما میں بچّے کی طبیعت ایک نہایت اُمّید افزا جزو ہے۔ اور ابتدائی تعلیم نئے خیالات کا بیج بونے کے لئے مؤثر ترین زمین ہے + سیاست داں حضرات اور مصلحین مذاہب انسانی مصیبتوں کو گھٹانے کے لئے۔ جو بڑی بڑی تجویزیں چاہیں پیش کریں۔ مگر ان کی تکمیل ہم عصر نسلوں میں نہیں ہو سکتی۔ اور انہیں نمو پذیر بچّوں ہی کے ذہن پر ثبت کرنا چاہئے +

بچّوں کے ذہن کے ساتھ ہمدردی کا گہرا تعلق رکھنے والے اصحاب خوب جانتے ہیں۔ کہ بچے کے ذہن میں بلند ارادوں اور فیاضانہ جوش و ہیجان کو قبول کرنے کی کس قدر صلاحیّت موجود ہے + انگلستان کے مشہور شاعر "ورڈز ورتھ" نے اپنی لاثانی نظم[1] میں بچّے کی جو تعریف کی ہے۔ وہ محض شاعرانہ مبالغہ ہی نہیں۔ بلکہ ایک حیرت ناک صداقت ہے۔ جسے شاعر کے تخیّل نے روزمرّہ زندگی کے بطلان آموز گرد و غبار

[1] Ode on Immortality.

میں سے نکھار کر الگ کر دیا ہے۔ فی الحقیقت بچہ اس اصلی سانچے سے قریب تر ہے۔ جس میں خالق بنی نوعِ انسان کو ڈھالتا ہے۔ اور اگر ہمارے نزدیک فرشتے ایسی ہستیاں ہیں۔ جو رذالت اور نامعقول تعصبات سے بالاتر ہیں۔ تو بچے کے فرشتہ فطرت ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ اور معلم کس قدر خوش نصیب ہے۔ جسے ایسی فطرت تک رسائی کا موقع حاصل ہے۔ وہ اس کے اندرونی رجحانات کا اُس وقت مطالعہ کر سکتا ہے۔ جب وہ مشکوک محرکات سے آلودہ نہ ہوں۔ اور پھر وہ ان رجحانات کا رُخ اس طرح پھیر سکتا ہے۔ کہ ہماری ارضی زندگی ایک سماوی چنگاری سے چمکنے لگے۔

میرے دل میں معلم کے پیشے کی اہمیت کا بہت بڑا احساس ہے۔ اور مجھے یقینِ واثق ہے۔ کہ وہ بڑی بڑی اصلاحات جو انسانی ترقی کا موجب بن سکتی ہیں۔ اُن کو عمل پذیر کرنے کا قوی ترین آلہ معلم ہی کی ذات ہے۔

حقیقت یہ ہے۔ کہ اخلاقی تعلیم اور شہریت جیسے مطالب کتابوں کے ذریعے سے سمجھائے نہیں جا سکتے۔ ان کو سمجھنے اور حاصل کرنے کے لئے ہمیں یہ چاہیئے۔ کہ چند زندہ مثالیں پیشِ نظر رکھیں۔ یا چند اصولوں کو کسی شعبۂ حیات سے مطابقت دیں۔ مگر معلم کو یہ بھی چاہیئے۔ کہ اس موضوع پر جس قدر لٹریچر میسر ہو مہیا کرے۔ اور جب وہ چند اصول اپنے ذہنی ملکیت بنا لے۔ تو پھر وہ انہیں عملی جامہ پہنا سکتا ہے۔ اخلاقیات اور مدنیات میں آخری کسوٹی اطوار و اعمال ہی ہیں۔ اگر معلم اس موضوع پر انگریزی کتب کا مطالعہ کرے تو اُن میں اُسے دستورِ حکومت پارلیمنٹ کا ضابطہ۔ مختلف قوانین کی ساخت اور شہریوں پر ان سب کے اثرات وغیرہ مضامین کے متعلق معلومات دستیاب ہو جائیں گی۔ یا شہر اور شہریوں کی سیاسی۔ اقتصادی اور سماجی[1] زندگی کا تعلق بالوضاحت ظاہر کیا گیا ہوگا۔ مگر مشکل یہ پڑے گی۔ کہ ان سب میں برطانوی شہریوں کے زاویۂ نگاہ کی ترجمانی ہوگی۔ اور ہندوستانی معلم اس سے فائدہ نہیں اُٹھا سکے گا۔ بلکہ اگر وہ احتیاط نہیں برتے گا تو محض اوپرے دل سے ان معلومات کو ذہنی طریق پر حاصل کرکے اپنے گردوپیش کے حالات کو ان سے مطابقت نہ دے سکے گا۔ اور اس طرح شاید وہ شاہ راہِ علم سے بھٹک کر محض ایک بند کوچے میں ٹھوکریں کھاتا پھرے گا۔

لیکن اگر وہ اپنی حاصل کردہ معلومات کو اس طرح استعمال کرے۔ جس سے اُس کا ماحول

۱. Social

روشن تر ہو جائے۔ اور اس کے آس پاس جو
ہنگامہ بپا ہے۔ جو مسائل اسے درپیش ہیں وہ
پوری طرح واضح ہو جائیں۔ تو واقعی وہ سیدھے
راستے پر چل رہا ہے۔ اور بہت جلد مدنیات
کے اصل معانی اور حقیقی طریق عمل اس کی سمجھ
میں آجائیں گے ٭

مثلاً وہ انگریزی کتابوں میں لیبر پارٹی
یا اشتراکیت وغیرہ کے حالات پڑھتا ہے۔
ہوسکتا ہے کہ اسے صرف پیچیدہ
اقتصادی مسائل کے ہنگاموں کی ایک دھیمی
سی صدائے بازگشت سنائی دے۔ حالانکہ
آج کل کی مغربی زندگی کا تار و پود انہیں ہنگاموں
سے ترکیب پا رہا ہے۔ لیکن اگر وہ تخیل کو اور
بلند کرے۔ اگر وہ ہندوستانی کاشتکاروں
کی حقوق طلبی۔ بمبئی کلکتہ اور جمشید پور جیسے
بڑے بڑے شہروں کے "کارخانہ داروں"
کی متجسس اُمیدوں پر غور کرے۔ یا قرض خواہ
اور مقروض جماعت کی کشاکش کو دیکھے۔ جو کبھی
فرقہ وارانہ مخاصمت۔ کبھی سیاسی رقابت
اور کبھی اقتصادی تصادم کا بہروپ بھر لیتی
ہے۔ تو اُسے معلوم ہو جائے گا۔ کہ مدنیات
کا مطالعہ ان مباحث پر جو بظاہر لاینحل
معلوم ہوتے ہیں، کس طرح ایک نئی روشنی
ڈالتا ہے۔ اور کس طرح اس پر عمل پیرا ہونے
سے شہریت کی وہ رُوح پیدا ہوتی ہے۔ جو
اس وقت ہم سب کے پیش نظر ہے ٭

بہترین طریقہ یہی ہے۔ کہ اس مسئلے پر
روزمرہ زندگی کے واقعات کی روشنی میں نظر
ڈالی جائے ٭ اپنے ذہن میں ایک شہری
فرض کر لیجئے۔ اور اس کے روزانہ مشاغل پر غور کیجئے۔
اور یہ دیکھئے۔ کہ اُس کا شہری زندگی کے جزئیات
سے کتنا تعلق ہے ٭

مثلاً وہ لاہور کا رہنے والا ہے۔
جب وہ صبح سویرے اُٹھتا ہے۔ تو دیکھتا ہے۔
کہ اُس کے نل میں پانی نہیں آیا۔ یا اگر پانی آیا
ہے۔ تو دھار اتنی پتلی ہے۔ کہ وہ پوری طرح
مُنہ ہاتھ نہیں دھو سکتا ٭ عام طور پر یہ ہوتا
ہے۔ کہ وہ اپنی صفائی پسند طبیعت پر دباؤ
ڈال کر راضی برضا ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر وہ سچا
شہری ہے۔ تو وہ یہ نہیں کرے گا۔ کہ صرف
بلدیہ (میونسپلٹی) کو کوس کر رہ جائے۔ بلکہ وہ
اپنے آپ سے سوال کرے گا۔ کہ میں نے
اپنے نمائندے کی تنبیہہ میں کس قدر حصّہ
لیا ہے۔ یہ درست ہے۔ کہ انتخابات کی رُو
سے دس ہزار میں سے ایک رائے دہندہ
جملہ حلقۂ انتخاب کی قوّت کا $\frac{1}{10000}$ حصّہ رکھتا ہے لیکن

شہری زندگی کا اہم نکتہ یہ ہے۔ کہ اگر دس ہزار یا اُن کا معتدبہ حصّہ ایک نقص کا احساس کر لے۔ اور اُسے رفع کرنے پر تُل جائے تو پھر اُس کو دُنیا کی کوئی طاقت اس مقصد کی تکمیل سے روک نہیں سکتی۔ کسی مخصوص جماعت میں ناقابلیت بدانتظامی۔ ذاتی اغراض اور اس قسم کی اَور مشکوک حرکات کا موجود ہونا قرینِ قیاس ہے۔ لیکن اگر دس ہزار میں سے اکثریت کے دلوں میں شہریت کی روح موجزن ہو تو پھر وہ ذاتی اور مخصوص محرکات کو بہا کر لے جاسکتی ہے۔ فتح ہمیشہ مشترک اور ہمہ گیر رجحانات کو حاصل ہوتی ہے۔ اکھل کھرے اور سماج کے دُشمن ہمیشہ شکست کھاتے ہیں ۔

خیر۔ تو ہمارا شہری مُنہ ہاتھ دھو کر کپڑے پہنتا ہے۔ اور سیر کے لئے باہر نکلتا ہے۔ وہاں اُسے گندگی سے بھری ہوئی گاڑیوں کا سامنا ہوتا ہے۔ جو اُس کے دماغ کو پریشان کر دیتی ہیں۔ اب اگر وہ سچّا شہری ہے۔ تو اُسے یہ سوچنا چاہیئے۔ کہ اس پریشانی کا وہ خود بھی ذمّے وار ہے۔ یا نہیں۔ اُسے یہ جاننا چاہیئے۔ کہ تمام شہر کی صفائی کا انتظام ہم سب مل کر کرتے ہیں۔ اگر صاحبِ اختیار جماعت ناقابل ہے۔ تو ہم سب کا فرض ہے۔ کہ ہم معاملے کو اپنے ہاتھوں میں لے لیں۔ اور مناسب کارروائی کریں۔ ہمارا شہری سیر کر کے گھر واپس لوٹتا ہے۔ اور ناشتا کر کے کام پر جاتا ہے۔ وہ شہر جو ہماری خوابوں کے تمنّا زاروں میں آباد ہے۔ یعنی وہ شہر جہاں ہر کوئی آباد ہونا چاہتا ہے۔ وہاں تو ہمارا گھر ہماری کارگاہ کے ساتھ ملحق ہے لیکن یہ بات اس دُنیا کے کسی شہر میں ہر ایک کو نصیب نہیں ہو سکتی۔ ہر شہری چاہتا ہے کہ بہت جلد اپنے کام پر جا پہنچے۔ لیکن جب وہ یہ دیکھتا ہے۔ کہ آمدورفت کے ذرائع ناکافی ہیں۔ تو اُس کے سامنے شہریت کا ایک اور مسئلہ آجاتا ہے۔ اگر وہ کوئی کرائے کا تانگہ یا فٹن لیتا ہے۔ تو اُس کا نمبر ظاہر کرے گا۔ کہ اس پہ میونسپلٹی کا دخل ہے۔ اگر گاڑی میں سامانِ نشست درست نہیں۔ گدیلے خراب ہیں۔ گھوڑا بیمار یا زخمی ہے۔ یا کوچوان نکمّا ہے۔ تو اُس کی رگِ شہریت کو پھر صدمہ پہنچے گا۔ اور اُس کا دل خود بخود یہ سوال کرے گا :-

"ان چیزوں کی اصلاح کے لئے تم نے کیا کچھ کیا ہے؟"

بڑے بڑے شہروں میں ٹریم گاڑیاں

اوموٹریں وغیرہ چلتی ہیں۔ اگر ان کا ایک جگہ ہجوم ہو جائے یا انتظام درست نہ ہو۔ تو ہمیں پھر شہریت کی ذمے داریوں اور فرائض کا سامنا ہوتا ہے ۔ اگر سڑکیں ناہموار یا شکستہ ہیں ۔ پوری طرح صاف نہیں ۔ تو اس کے ذمے دار کون لوگ ہیں ؟ بلدیہ ۔ اس کی انتظامی جماعت اور اس کے رُکن ۔ بالآخر رائے دہندگان غرض ہم سب کے سب ذمے دار ہیں ۔

شام کے وقت گھر واپس آنے پر شاید اُسے ریلوے پارسل موصول ہوتا ہے۔ جس کے لئے چنگی کا محصول واجب الادا ہو۔ یا مقامی ٹیکس کا کوئی بل آیا ہوا ہو۔ تو اُس کے سامنے ایک اقتصادی مسئلہ پیش ہوگا۔ چُنگی کا انتظام تسلی بخش ہے۔ یا تجارت کو تباہ برباد کر رہا ہے۔ کیا یہ محصول محض وصولی اسباب پر لگایا جاتا ہے ؟ اور اس طرح عام مُلک کے لئے مضرت رساں ہے ؟ اگر محصول بلاواسطہ ہے تو کیا اسے منصفانہ طور پر وصول کیا جاتا ہے ؟ کیا اُسے اُن ہی مقاصد پر کفایت کے ساتھ خرچ کیا جاتا ہے۔ جن کے لئے وہ وصول کیا جاتا ہے ؟ کیا یہ مناسب محصول ہے۔ کیا محصول ادا کرنے والے کی سہولت کو ہر طرح مدِنظر رکھا جاتا ہے۔ اور کیا وہ خدمات جن کے لئے اسے وصول کیا جاتا ہے۔ انفرادی عمل سے زیادہ مفید طور پر سرانجام دی جارہی ہیں ؟

جب رات ہوتی ہے تو ہمارا شہری بجلی کا لیمپ روشن کرتا ہے۔ یا برقی پنکھا چلاتا ہے۔ اُس وقت یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ آیا بجلی مہیا کرنے کا کام میونسپلٹی نے اپنے ذمے لے رکھا ہے یا کسی انفرادی اجارے کے سپرد ہے ؟ اور کیا برقی رَو کفایت اور اہلیت کے ساتھ پیدا اور خرچ کی جاتی ہے ؟

بعض حالات میں رسدی اجارے کے حقوق اس کی ذمے داریوں کی نسبت بہت زیادہ ہوتے ہیں کیا اجارہ دار اپنے آپ کو پبلک کا خادم تصور کرتے ہیں۔ یا مطلق العنان اور ٹائیسُل حکمراں ؟

(باقی باقی)

عورت یا شیر؟

پُرانے زمانے کا ذکر ہے۔ کہ ایک نیم وحشی دراوڑ راجہ ہندھیاچل سے اُس پار کی سرزمینوں پر حکومت کرتا تھا۔ وہ آریہ نسل سے نہیں تھا۔ اُس کی رگوں میں ہندوستان کے قدیم دراوڑوں کا خُون موج زن تھا۔ جس سے تا حال وحشت کی بو نہ گئی تھی۔ تاہم وہ بنگال اودھ اور وسطِ ہند کے کھشتری راجاؤں کا ہم نبرد اور مہذّب آریہ ورت کا ہمسایہ تھا۔ اس مقدس پڑوس نے اُس کے خیالات کو متاثر کر دیا تھا۔ اس لئے وہ فیّاض بھی تھا۔ تُندمزاج بھی۔ آزاد خیال بھی تھا۔ پُرانی وحشیانہ رسموں کا پابند بھی۔ اُس کی طبیعت تلوّن سے معمور تھی۔ مگر اُس کا حکم اٹل ہوُا کرتا تھا۔

وہ راجہ تھا مطلق العنان تھا۔ اس لئے اپنے خیالات کو جب اور جس طریق سے چاہتا عملی جامہ پہنانے میں تامّل نہ کرتا۔ اُسے اپنی رائے پر پورا اعتماد تھا۔ لہذا ہر کام اپنی رضامندی کے مطابق انجام دیتا۔ اگرچہ اُجدھیا اور کپل وستو کے عظیم الشان درباروں کی طرح اُس کا بھی ایک دربار تھا۔ جس میں اُس نے اپنی نیم وحشی رعایا میں سے اچھے اچھے رتن جمع کر رکھے تھے۔ اور اُن سے مشورہ طلب بھی ہوتا تھا۔ مگر اپنی رائے کی مخالفت اُسے پسند نہ تھی۔ تائیدِ کلام سے بے حد خوش ہوتا۔ لیکن اختلاف رائے کو برداشت نہ کرتا۔ مخالفت کا خیال بھی اُسے اپنے درباریوں کی تمناؤں کو تباہ کر دینے کے لئے کافی تھا۔

ہمسایہ قوم کے پرتو نے اُس کی جہالت کسی قدر زائل کر دی تھی۔ اپنے ہم عصر سُورماؤں کے بہادرانہ اشغال کے مقابلے میں اُس نے اپنی راجدھانی میں ایک تماشا گاہ قائم کی تھی۔ اس تماشا گاہ میں وہ انسانی اور حیوانی درندگی کے نظّارے دکھا کر نیم وحشی رعایا کو اپنے وقت کی تہذیب سے آراستہ کرنے میں بے حد دلچسپی لیتا تھا۔

لیکن اس تماشا گاہ میں بھی اُس کی بیباک وحشت اور ستم ظریفی نے مل کر ایک نئی جدّت

پیدا کی تھی۔ یعنی یہ تماشا گاہ اس لئے نہیں بنائی گئی تھی۔ کہ لوگ وہاں آئیں اور جمع ہوکر دو تلوزیوں کو لڑتے اور پھر ایک کو زخموں سے نڈھال ہوکر دم توڑتے دیکھیں۔ یا اُس کی بے ربط گفتگو سُنیں + نہ اس لئے کہ ایک خونخوار ہیبت ناک درندے کے مقابل کسی بے دین راکھش کا حشر دیکھ کر عبرت پکڑیں۔ بلکہ اس تماشا گاہ کی بُنیاد کا مقصد ان باتوں سے بلند تر تھا۔ اور وہ یہ تھا۔ کہ لوگوں کے ذہنی قواء کو اَور زیادہ مضبوط اور وسیع کیا جائے +

تماشا گاہ کا منڈپ اپنے پیچیدہ برآمدوں پُراسرار اور پوشیدہ تہ خانوں۔ بھول بھلیّاں سے بھی زیادہ بعید الفہم گزرگاہوں کے سبب سے شاعرانہ عدل و انصاف کا ایک دلچسپ ذریعہ بنایا گیا تھا +

جب رعایا کا کوئی فرد ایسا مجرم ٹھہرایا جاتا۔ جس سے خود راجہ کو دلچسپی ہو۔ تو اعلان کر دیا جاتا تھا۔ کہ فلاں روز اُس مجرم کی قسمت کا آخری فیصلہ شاہی اکھاڑے میں کیا جائیگا +

اکھاڑا تماشا گاہ کے وسیع منڈپ کا مناسب نام تھا۔ اگرچہ اُس کی ساخت کسی دُور دراز تہذیب کا چربا تھی۔ مگر راجہ نے اُس کے استعمال میں بھی جدت پیدا کر رکھی تھی + کیونکہ راجہ اپنے زمانے کے کارناموں کو دقیانوسی خیالات سے زیادہ وقعت نہ دیتا تھا۔ وہ اپنی اختراعات کو مناسب اور ہر شخص کے لئے قابلِ عمل خیال کرتا تھا +

مقررہ دن جب لوگ اکھاڑے کے وسیع برآمدوں میں جمع ہو جاتے۔ تو راجہ بھی اپنے گراں ڈیل اور نیم عُریاں درباریوں کے جھُرمٹ میں برآمد ہوتا۔ اور سب سے بڑی عدالت کے اونچے سنگھاسن پر بیٹھ جاتا۔ ہر طرف خاموشی چھا جاتی۔ وحشیانہ نعروں کی گُونج مہیب چُپ چاپ سے بدل جاتی۔ اُس وقت راجہ اشارا کرتا۔ اُس کے اشارے پر سنگھاسن کی نچلی دیوار میں ایک دروازہ کھول دیا جاتا۔ اور مجرم اکھاڑے میں داخل ہوتا +

راجہ کے عین مقابل دیوار میں ایک ہی طرح کے دو بند دروازے ہوتے تھے۔ مجرم کا فرض تھا۔ کہ وہ عدالت عالیہ کے سامنے پس و پیش کئے بغیر اُن کی طرف بڑھے۔ اور دونوں میں سے ایک دروازہ کھول دے +

دروازے کا انتخاب اُس کی اپنی خوشی اور پسند پر مبنی تھا۔ اس پر نہ تو کسی قسم کا جبر و تشدّد روا رکھا جاتا۔ نہ رہبری کی جاتی۔ بلکہ اس معاملے میں فیصلہ نہایت عادلانہ طور پر

ن
ی قسمت پر چھوڑ دیا جاتا۔ ایک دروازہ
نے پر خوفناک۔ ظالم اور بھوکا شیر برآمد ہوتا۔
بر اسی مقصد کے لئے تلاش کر کے وہاں پہلے
موجود رکھا جاتا تھا۔ جو دروازے سے گرجتا
نکلتا۔ اور نہتے بدنصیب مجرم پر جھپٹتا اور
پھاڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالتا۔ یہی اُس مجرم
سزا سمجھی جاتی +

جب مجرم کی قسمت یہ فیصلہ کرتی تو لوہے
ے گھڑیال ماتمی انداز سے شور مچاتے۔ اکھاڑے
ے باہر چاروں طرف اُجرت پر بُلائے ہوئے
ی اپنی دردناک چیخوں اور سنکھ دھوتو دھوتو
پکار سے افسوس کا اظہار کرتے۔ عام تماشائی
روں کو جھکائے افسردہ صورت بنائے آہستہ
ہستہ اپنے گھروں کو لوٹ جاتے + اُن کے دلوں
میں مقتول کے حُسن و شباب یا بزرگی و عزت
کا احساس لہریں لیتا نظر آتا +

لیکن جب مجرم دوسرا دروازہ کھول لیتا۔
تو اُس میں سے ایک کم سن عورت نکل کر اُس
کے سامنے آکھڑی ہوتی۔ اس عورت کا بے حد
حسین ہونا لازمی تھا۔ اور راجہ اسے اپنی تمام
سلطنت میں سے خود انتخاب کرتا تھا+ اس عورت
کی شادی اُسی مجرم کے ساتھ کر دی جاتی تھی۔
اور اس امر کو مجرم کی معصومیت کا انعام خیال
کیا جاتا +

اس حالت میں یہ پروا نہ کی جاتی تھی کہ مُجرم کی پہلے بھی کوئی بیوی ہے یا نہیں۔ خواہ وہ کسی دوسری عورت کو دل و جان ہی سے کیوں نہ چاہتا ہو۔ کتخدا ہو۔ یا ناکتخدا۔ راجہ اپنے عطیے کے مقابلے میں کسی بات کا خیال نہ کرتا تھا +

شادی کی رسمیں اُسی وقت اکھاڑے کے اندر راجہ کے سامنے ادا کی جاتیں۔ راجہ کے اشارے سے فوراً ایک اور دروازہ کھلتا۔ لمبے لمبے بالوں والے پجاری گویوں اور ناچنے والی کنواری لڑکیوں کو لئے ہوئے باجے گاجے کے ساتھ اُس جوڑے کے پاس پہنچتے۔ شادی کا اہتمام نہایت دھوم دھام سے کیا جاتا +

رسوم کے خاتمے پر گھڑیال بجتے۔ تمام لوگ اپنی وحشیانہ اُچھل کود سے خوشی کا اظہار کرتے۔ اور معصوم مجرم اپنی نئی دُلھن کے ساتھ گھر کی طرف روانہ ہوتا۔ راستے میں لڑکے لڑکیاں اُن پر پھولوں کی برکھا کرتے جاتے +

راجہ کی عدالت کا یہی نیم مہذب فیصلہ تھا + اس طریقِ عمل کی خوبی ظاہر ہے۔ مجرم کسی طرح یہ نہیں سمجھ سکتا تھا۔ کہ عورت کس دروازے سے برآمد ہوگی + وہ اپنی خوشی سے ایک دروازہ کھول دیتا۔ اُس کو اس بات

کی مطلقاً خبر نہ ہوتی تھی۔ کہ اب میں شادی سے ہم کنار ہوں گا۔ یا موت سے!

اس سے پیشتر جتنے واقعات گزر چکے تھے۔ اُن میں شیر کبھی ایک دروازے سے برآمد ہوا تھا اور کبھی دوسرے سے۔ اور یہ فیصلے بہتر ہی نہیں بلکہ اٹل بھی تھے +

یعنی اگر مجرم اپنے آپ کو واقعی مجرم پاتا۔ تو چشم زدن میں اُسے سزا مل جاتی تھی۔ اور اگر وہ معصوم ظاہر ہوتا۔ تو اُس کو ایک عورت مل جاتی۔ خواہ وہ اُسے پسند کرے یا ناپسند۔ اُسے راجہ کے فیصلے سے رہائی مل ہی نہیں سکتی تھی +

اکھاڑا ایک مشہور مقام تھا۔ جب لوگ ایک اہم فیصلے کے دن وہاں جمع ہوتے تو انہیں اس امر کا بالکل علم نہ ہوتا تھا۔ کہ وہ ایک مجرم کا قتل دیکھیں گے۔ یا شادی! یہ لاعلمی اُن کی آتشِ شوق کو اَور بھی بھڑکاتی۔ تماشائی خوش اور بے تاب نظر آتے تھے۔ اور اکثر اپنے ذہن سے کام لیتے اور اوٹ پٹانگ قیاس دوڑاتے تھے۔ لیکن اس فیصلے پر الزام نہ دھرتے تھے۔ کیونکہ اُن کے خیال میں فیصلہ مجرم کے اپنے ہاتھوں میں ہوتا تھا +

اس دُھن کے پکے نیم مہذّب راجہ کی ایک بیٹی بھی تھی۔ جو اُس کے خیالات کی طرح رنگین و آراستہ تھی۔ اور وہ قدرتی طور پر اس لڑکی کو سارے جہان بلکہ اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز رکھتا تھا +

اس کے درباریوں میں ایک نوجوان بھی تھا۔ جو رعایا کے ایک معزز قبیلے سے تعلق رکھتا تھا + اور یہ ہمیشہ سے ہوتی آئی ہے۔ کہ اکثر درباری نوجوان شہزادیوں کے دامِ محبت میں پھنس کر صدمے اُٹھاتے رہتے ہیں چنانچہ اس نوجوان پر راجہ کی بیٹی فریفتہ تھی۔ راجہ کی بیٹی کو اپنے محبوب کی جاں نثاری پر پورا بھروسہ تھا۔ کیونکہ وہ ساری مملکت میں بہادری خوب صورتی اور مردانگی میں بے نظیر تھا۔ وہ اسے انتہائی گرمیِ شوق کے ساتھ چاہتی تھی۔ اِس حد تک۔ کہ اس کی چاہت میں تشدّد کا جذبہ بھی موجود تھا + وہ اُسے زیادہ اور زیادہ دل سوز اور پُرجوش بنانا چاہتی تھی خوش قسمتی سے اس آتشیں عشق کا سلسلہ ایک مدت تک جاری رہا۔ لیکن ایک وقت آیا۔ کہ راجہ پر یہ راز افشا ہو گیا +

راجہ نے اپنے فرائض ادا کرنے میں زیادہ تامل نہیں کیا۔ کسی تذبذب یا سوچ بچا

کے بغیر نوجوان کو حراست میں لے لیا۔ اور مقدمے کی تحقیقات کے لئے آخری دن مقرر کردیا۔ یہ دن واقعی ایک یادگار دن تھا۔ رعایا اور خود راجہ اس مقدمے کی تحقیق میں غیر معمولی دلچسپی لے رہے تھے۔ اس سے پیشتر کبھی ایسا واقعہ رُونما نہ ہؤا تھا۔ کہ ایک غلام خاص راجہ کی بیٹی سے محبّت کرنے کی جُرأت کا مرتکب ہو۔ شاید دُنیا کے آغاز میں یہ بات معمولی خیال کی جاتی ہو۔ مگر ان قوموں کے لئے معاملہ نہایت اہم تھا +

خونخوار جلّادوں نے تمام سلطنت کے پنجرے دیکھے بھالے۔ تاکہ سب سے زیادہ تُند۔ سب سے زیادہ ظالم اور سب سے زیادہ ہیبت ناک شیر منتخب کیا جاسکے +

فن کے بڑے بڑے مبصروں نے تمام مُلک کی عورتوں میں سے ایک بہترین حسین دوشیزہ تلاش کی۔ تاکہ اگر اس نوجوان کی قسمت کا ستارا اُسے معصوم ثابت کردے تو اس الزام کی نسبت سے اتنا ہی بڑا انعام بھی دیا جائے +

البتہ یہ بات سب پر ظاہر تھی۔ ہر شخص جانتا تھا۔ کہ الزام قطعاً درست اور سچا ہے + مجرم نے راج کماری سے محبّت کی۔ اس سے نہ وہ جوان انکار کرتا تھا۔ نہ راج کماری۔ لیکن راجہ اس ظاہر و باہر ثبوت کی رُو سے فیصلہ کرکے اپنی عدالت کے خود ایجاد دستور کو توڑنا نہیں چاہتا تھا +

مقررہ دن آن پہنچا۔ قرب و جوار کے لوگ اکٹھے ہوگئے۔ تماشاگاہ تماشائیوں سے کھچا کھچ بھرگئی اور ایک کثیر التعداد انبوہ جسے اندر جگہ نہ مِل سکی اکھاڑے کے باہر جمع ہوگیا +

راجہ اور اُس کے درباری ہم صورت دروازوں کے بالمقابل اپنے اپنے مرتبوں کے مطابق متمکن ہوگئے + سب کچھ تیار تھا۔ لوگوں کی سرگوشیاں ایک گہرے سکوت میں چھُپ گئی تھیں۔ کہ راجہ نے اشارا کیا شاہی نشستوں کے نیچے کا دروازہ کھُلا۔ اور راج کماری کا جاں نثار اکھاڑے میں داخل ہوگیا +

سرو قد۔ وجیہہ۔ جمیل۔ خوش وضع۔ خوش اطوار بانکے نوجوان کے لئے تماشائیوں کے دلوں میں خوشی اور رنج دونوں قسم کے جذبات اُبھر آئے +

آدمی سے زیادہ خلقت کو یہ معلوم نہ تھا۔ کہ ایسا شاندار انسان بھی اُن کے درمیان رہتا ہے۔ لوگ سوچ رہے تھے۔ کہ ایسے نوجوان

سے کسی شہزادی کا محبت کرنا کوئی اچنبے کی بات نہیں ہو سکتی۔ لیکن اُس کا اس امتحان کی جگہ پر موجود ہونا خطرناک ہے +

جب نوجوان نے اکھاڑے میں قدم رکھا۔ تو دستور کے مطابق وہ راجہ کی تعظیم کے لئے جھکا + لیکن اس وقت اُس نے راجہ کی موجودگی کا مطلقاً احساس نہ کیا۔ اُس کی آنکھیں خوبصورت راج کماری پر جمی ہوئی تھیں۔ جو راجہ کے داہنے ہاتھ بیٹھی تھی +

اُف اس عورت کی فطرت کتنی بیباک تھی۔ ورنہ شاید وہ ایسے وقت یہاں موجود نہ ہوتی، مگر اُس کی رُوح میں ایک تڑپ تھی۔ اور محبت کی آگ نے اُسے یہ نظارا دیکھنے کے لئے مجبور کر دیا تھا +

جس وقت سے یہ اعلان ہوا تھا۔ کہ اس کا محبوب امتحان کے اکھاڑے میں اپنی قسمت کا فیصلہ اپنے ہاتھوں سے کرے گا۔ اُس وقت سے دن اور رات اُس کے لئے برابر تھے اُس نے سوائے اس خاص امر کے اور کسی بات سے سروکار نہ رکھا تھا + اُس کے پاس طاقت تھی۔ حکومت تھی۔ پیش ازیں اس انوکھی عدالت میں حصہ لے چکی تھی۔ اُسے دروازوں کے راز معلوم تھے۔ اُس نے معلوم کر لیا تھا۔ کہ دونوں دروازوں کے پچھلی طرف کس کمرے میں بھُوکا شیر خوفناک دانت نکالے کھڑا ہے۔ اور کس کمرے میں حسین عورت بیٹھی انتظار کر رہی ہے + راجہ کے پُراسرار محل کے دروازے جن میں کھال کے پردے لٹک رہے تھے۔ کسی قسم کا شور یا آواز سُنائی دینے کے ہر طرح ناقابل تھے۔ لیکن زور۔ زر اور عورت کے جذبۂ محبت نے ساری حقیقت آشکار کر دی تھی۔ اُسے نہ صرف یہ معلوم تھا۔ کہ عورت کس دروازے کے پیچھے اُس کے عاشق کی منتظر ہے۔ بلکہ اُسے یہ بھی خبر تھی۔ کہ وہ عورت کون ہے ؟

وہ دوشیزہ جو نوجوان مجرم کی بےگناہی کا صلہ منتخب ہوئی تھی۔ دربار کی تمام لڑکیوں سے بدرجہا خوبصورت اور دلرُبا تھی۔ خود راج کماری اُسے خوبصورت سمجھتی تھی۔ لیکن اُس سے نفرت کرتی تھی۔ اُس نے بارہا دیکھا اور محسوس کیا تھا۔ کہ یہ نازک اندام حسینہ محبت بھری نظروں سے اُس کے محبوب کو دیکھا کرتی ہے۔ بعض اوقات راج کماری کو یہ بھی محسوس ہوتا تھا۔ کہ اُس کی نگاہیں کامیاب لوٹ رہی ہیں۔ اور اُس کا محبوب بھی پیغام محبت کا جواب دے رہا ہے + کبھی کبھی اس نے ان کو گفتگو کرتے بھی دیکھا تھا یہ گفتگو جو سرِ راہ ہے

اور بہت مختصر طور پر ہوتی تھی۔ بہت ممکن ہے۔ کہ ناموافق پہلوؤں پر ہو۔ لیکن راج کماری کس طرح جان سکتی تھی +

راج کماری کے محبوب پر نگاہیں ڈالنے والی لڑکی محبت کی دیوی تھی۔ لیکن راج کماری اپنے آباواجداد سے ورثے میں ملی ہوئی انتہائی وحشت کے ساتھ اُس لڑکی سے نفرت کرتی تھی۔ اور وہی لڑکی اس وقت سامنے کے دروازوں میں سے ایک کے پیچھے پوشیدہ تھی +

جب اس کے محبوب نے مڑ کر اُس کی طرف دیکھا۔ دونوں کی نگاہیں چار ہوئیں۔ اس وقت راج کماری سب سے زیادہ سفید اور زرد رُو نظر آتی تھی۔ اور اُس کے اردگرد کے بے نقاب چہروں میں کوئی بھی اُس سے زیادہ بے حس و حرکت نہ تھا +

دونوں نے ایک دوسرے کو ایسے تیز جذبے سے دیکھا۔ جو صرف اُنہیں لوگوں کو عطا ہوتا ہے۔ جن کی روحیں ایک دوسرے سے پیوستہ ہوں + راج کماری جانتی تھی۔ کہ کون سے دروازے کے پیچھے شیر ہے۔ اور نوجوان کو بھی یقین تھا۔ کہ وہ ضرور جانتی ہے۔ نوجوان عاشق اپنی محبوبہ کی محبت بھری فطرت کو سمجھتا تھا اور اُسے پکا یقین تھا۔ کہ میری نگاہیں دروازوں کا سربستہ راز معلوم کئے بغیر راج کماری کے چہرے سے نہ اُٹھیں گی۔ وہ راز جو تمام تماشائیوں کی نظروں سے پنہاں تھا۔ نوجوان کو پوری اُمید تھی۔ کہ شہزادی اس معمے کو حل کرنے میں کامیاب ہو چکی ہوگی +

نوجوان کی متجسس آرزومند اور پُرشوق نگاہ نے پوچھا۔ کدھر؟

اور راج کماری پر یہ استفسار اس طرح واضح ہو گیا۔ گویا اُس نے پورے زور سے پکارا ہو +

ایک ساعت بھی ضائع نہ ہونی چاہیئے تھی۔ یہ سوال بغیر آنکھ جھپکائے صرف نگاہ کی لطیف جنبش کے ذریعے سے پوچھا گیا تھا۔ اور ایک جنبش نگاہ ہی اُس کا جواب ہو سکتی تھی +

راج کماری نے اپنا داہنا ہاتھ اُٹھایا۔ اور اُس کی روشن آنکھوں میں سے نگاہ نے داہنی جانب جنبش کی + ان لطیف اشاروں کو راج کماری کے محبوب کے سوا کوئی نہ دیکھ سکا۔ نوجوان کی آنکھوں کے سوا ہر فردِ بشر کی آنکھیں سامنے کے دروازوں پر لگی ہوئی تھیں +

وہ مڑا۔ اور مضبوط قدموں کے لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا دروازوں کا درمیانی فاصلہ طے کرنے لگا۔ دلوں کی حرکت بند ہو گئی۔

سانس رُک گئے۔ آنکھیں آئینے کی طرح اُس پر جم گئیں ۔ وہ کسی پس وپیش کے بغیر داہنی جانب کے دروازے کی طرف چل دیا۔ اور کسی ہچکچاہٹ کے بغیر اُسے کھول دیا ۔

اب اس کہانی کا آخری معمہ یہ ہے۔ کہ اُس دروازے میں سے شیر نکلا یا عورت ؟

ہم اس سوال پر جتنا غور کرتے ہیں اُسی قدر اس کا حل مشکل ہوتا جاتا ہے ۔ اس سوال کا حل انسانی قلب کے مطالعے میں ہے۔ اور اس نے ہمیں جذبات کے پُراسرار گورکھ دھندے میں پھنسا دیا ہے ۔

کہانی کے پڑھنے والو! اس سوال کے جواب پر غور نہ کرو۔ بلکہ اُس پُرجوش اور نیم وحشی راجکماری کے دل کا مطالعہ کرو۔ جس کی روح مایوسی کی شدید آگ میں بھسم ہو رہی تھی ۔

"میں نے اُسے کھو دیا۔ لیکن اُس کو حاصل کون کرے گا؟"

آج کے دن سے بیشتر اپنی سرگرم تفتیش کے آغاز پر۔ وہ بارہا وحشت ناک خوابوں سے چونک اُٹھی ہوگی۔ اُس نے کئی مرتبہ اس خیال کے آتے ہی دونوں ہاتھوں سے چہرا ڈھانپ لیا ہوگا۔ کہ اُس کا محبوب ایسے دروازے کو کھول رہا ہے۔ جس کے دوسری جانب بپھرا ہوا شیر اُس کا انتظار کر رہا ہے ۔

کئی مرتبہ اُس کے تصور نے اپنے محبوب کو دوسرے دروازے پر دیکھا ہوگا۔ اور درد وکرب سے دانت پیس لئے ہونگے۔ اپنے بالوں کو نوچا ہوگا۔ اس خیال سے۔ کہ اُس کا مطلوب اپنی خوشی سے ایسے دروازے کو کھول رہا ہے۔ جس کے پیچھے ایک بے انتہا حسین عورت ہے ۔

تصور ہی تصور میں اپنے عاشق کو اُس عورت سے ملنے کے لئے بڑھتے آتشیں رُخساروں اور اشتیاق ریز نگاہوں سے اُس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے دیکھ کر۔ اُس کا دل رقابت کی آگ سے جل اُٹھا ہوگا ۔ اُس نے تصور کی آنکھوں سے اپنے کھوئے ہوئے معشوق کے افسردہ جسم کو نئی رُوح سے جگمگاتے دیکھا۔ اور عوام الناس کو خوشی کے نعرے لگاتے سُنا ہوگا ۔ کبھی اُس نے خیال کیا ہوگا۔ کہ شیر اُس کے جسم کو چیر پھاڑ رہا ہے۔ اُس کی چیخیں سُنی ہونگی۔ کبھی پجاری کے روبرو اُسے ایک دوسری عورت کا خاوند بنتے ملاحظہ کیا ہوگا۔ کبھی اس کی ہڈیاں کڑکتی اور ٹوٹتی دکھائی دی ہونگی۔ اور کبھی اُس پر پھولوں کی برکھا ہوتی نظر آئی ہوگی ۔

ان تصورات کے ہنگاموں میں اُس کی رُوح ایک مایوسانہ آہ میں غرق ہوگئی ہوگی ، اُس نے

سوچا ہوگا۔ کہ میں اسی وقت مر جاؤں۔ اور اُس دُنیا میں اپنے محبوب کا انتظار کروں جہاں وہ اُس کی آغوش سے چھینا نہیں جا سکتا +

اُس نے نگاہ کی ایک ہی جنبش سے اپنا فیصلہ سُنا دیا تھا۔ مگر اس فیصلہ کرنے کے لئے کئی اندوہ ناک دن اور راتیں بسر ہوئی تھیں + وہ جانتی تھی کہ مجھ سے سوال کیا جائے گا۔ اور اُس نے سوچ لیا تھا۔ کہ میں کیا جواب دونگی +

اُس نے کسی پس و پیش کے بغیر اپنا نازک ہاتھ داہنی جانب پھیر دیا + مگر اس فیصلے کا نتیجہ جاننا آسان نہیں۔ دروازے میں سے کیا نکلا عورت یا شیر؟ تم خود اس سوال پر غور کرو۔ میں اس معمے کو حل کرنا اپنا فرض نہیں سمجھتا +

(مفتی محمد انور)

موافقت ماحول

از میرزا یگانہ لکھنوی

دلِ خود را کہ پشیماں نتوانم دیدن
بہ کسے دست و گریباں نتوانم دیدن

روزِ عید آمد و تا ساز یک آہنگ زنیم
جنگ با گبر و مسلماں نتوانم دیدن

وقت آن ہست کہ سازم بہمیں لیل و نہار
خویش را بے سر و ساماں نتوانم دیدن

تا کجا گوش بر افسانۂ ماضی بودن
روز و شب خواب پریشاں نتوانم دیدن

بہمیں پشتِ ورق رنگِ تماشا ریزم
رُوئے مقصود چو آساں نتوانم دیدن

میخانۂ توحید

مستی ہے شرابِ ہوش دیوانہ کو
دوڑا ہوا جا رہا ہے میخانہ کو

تو عقل کو کیا سمجھ رہا ہے ناداں
گر ہوش ہے۔ دیکھ جھک کے پیمانہ کو

توحید ہوشیارپوری

خودکشی

یہ مضمون مشہور جرمن فلسفی "شوپن ہار" کی ایک کتاب سے ترجمہ کیا گیا ہے۔ اور محض ایک ذہنی قلابازی ہے۔ اس سے مقصد محض اُن لوگوں کو جھنجھوڑ نا ہے۔ جو ایک شانِ بے نیازی سے ہر مسئلے کے متعلق ایک مستقل رائے قائم کر لیتے ہیں۔ اور کسی چیز کے مختلف پہلوؤں پر غور کرنا ایک ناقابلِ تلافی گناہ تصوّر کرتے ہیں۔ یقین ہے کہ ناظرین اس مضمون کو پڑھ کر خودکشی پر آمادہ نہ ہو جائیں گے +

شوپن ہار، اُن معدودے چند فلسفیوں میں سے ہے۔ جنکی تحریر کچھ شگفتہ بھی ہوتی ہے۔ اور کسی حد تک ہم عامیوں کی سمجھ میں بھی آسکتی ہے۔ مگر یہ اختر صاحب کا کمال ہے۔ کہ انہوں نے ایسی سلیس زبان لکھی ہے۔ جس سے اس فلسفیانہ مضمون میں افسانے کی سی دلاویزی آگئی ہے + (ایڈیٹر)

جہاں تک مجھے علم ہے سامی اقوام اور یہودی عقائد کے پیروؤں کے سوا اور کسی مذہب کے پیرو خودکُشی کو جُرم تصوّر نہیں کرتے + اس خیال کی اس امر سے اَور بھی تائید ہوتی ہے۔ کہ نہ تو انجیل کے پُرانے عہدنامے میں کہیں اس کی ممانعت یا خصوصیت سے مذمت کی گئی ہے۔ اور نہ نئے میں۔ حتّٰے کہ مذہبی مفتیوں کو مجبوراً اس کی مذمت کے لئے من گھڑت فلسفیانہ دلائل کا سہارا ڈھونڈھنا پڑتا ہے + یہ دلائل اس قدر بودے ہوتے ہیں۔ کہ وہ بے چارے منطق کی خامیوں پر سخت اور زوردار الفاظ کا پردہ ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں یعنی استدلال کا کام خطابت سے لیتے ہیں + کبھی کہتے ہیں خودکشی انتہائی بُزدلی ہے۔ کبھی ارشاد ہوتا ہے۔ یہ مجنون اور خبط الحواس لوگوں کا کام ہے۔ یا اسی قسم کی اور مزخرفات کی بارش ہونے لگتی ہے۔ کچھ اَور بس نہیں چلتا۔ تو یہ مضحکہ انگیز فیصلہ صادر فرما دیتے ہیں۔ کہ خودکُشی جُرم ہے + حالانکہ دُنیا میں

کوئی چیز ایسی نہیں۔ جس پر انسان کو اپنی ذات اور اپنی جان سے زیادہ مکمل حقوق حاصل ہوں۔ جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے۔ خودکشی جرم تصور کی جاتی ہے۔ اور جرم بھی ایسا خوفناک۔ کہ انگلستان کے عامیانہ تعصب نے اس کی نہایت ہی وحشیانہ سزا مقرر کر رکھی ہے۔ مرنے والے کی تمام جائداد ضبط کر لینے کے علاوہ اس کی تجہیز و تکفین نہایت ناشائستہ طریق پر کی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ خودکشی کے قریباً ہر مقدمے میں اہلِ جیوری خبط الحواسی کا فتوےٰ صادر کر دیتے ہیں۔ مَیں اس امر کا فیصلہ قارئین کے اخلاقی احساسات پر چھوڑتا ہوں۔ فرض کیجئے۔ آپ کو اطلاع ملتی ہے۔ کہ کسی شخص سے جو آپ کا شناسا ہے کوئی جرم مثلاً چوری۔ قتل یا کوئی اور ظالمانہ فعل سرزد ہوا ہے۔ اس خبر سے آپ کے دل پر جو اثر ہوگا۔ اس کا اُن احساسات سے مقابلہ کیجئے جو یہ سُن کر پیدا ہوں گے کہ اُس شخص نے اپنے ہاتھوں اپنی زندگی کا خاتمہ کر دیا ہے۔ پہلی حالت میں انتہائی غیظ و غضب کے جذبات پیدا ہونگے اور آپ پُرزور الفاظ میں عبرتناک سزا اور انتقام کا مطالبہ کریں گے۔ لیکن مؤخرالذکر واقعے کو سُن کر آپ کے دل میں رنج اور ہمدردی کی ایک لہر دوڑ جائے گی۔ نیز اُس نفرت کی بجائے جو ہر مذموم فعل سے فطرۃً ہوا کرتی ہے۔ آپ مرحوم کے حوصلے اور دلیری کی بھی داد دیں گے۔

دُنیا میں کون ایسا شخص ہوگا۔ جس کے کسی شناسا۔ دوست یا رشتے دار نے برضا و رغبت اس عالمِ فانی کو خیرباد نہ کہا ہو۔ کیا ان لوگوں کو اخلاقی مجرموں کی طرح حقارت سے یاد کرنا چاہیئے؟ ہرگز نہیں! بلکہ میری رائے میں تو ان مذہبی مُفتیوں سے پوچھنا چاہیئے۔ کہ انہیں کیا حق حاصل ہے۔ کہ دو منٹ کے لئے منبر پر جا براجے۔ یا قلم ہاتھ میں لیا اور ایک ایسے فعل کو جرائم کی فہرست میں شامل کر دیا۔ جو اُن ہستیوں سے سرزد ہوا ہے۔ جن کے لئے ہمارے دل میں بے انتہا محبت اور عزت کے جذبات موجود ہیں۔ اور ساتھ ہی ان لوگوں کو باعزت تجہیز و تکفین سے بھی محروم کر دیا۔ جو اپنی خواہش سے عدم آباد کی راہ پر چل کھڑے ہوئے۔ ان مُفتیوں کے اس فعل کی تائید کے لئے انجیلِ مقدس میں کوئی حکم موجود نہیں۔ بلکہ وہ کوئی معقول فلسفیانہ دلیل بھی پیش نہیں کر سکتے۔ انہیں یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ ہم دلائل چاہتے ہیں محض گالیوں سے مرعوب نہیں ہو سکتے۔ مانا کہ تعزیری قوانین خودکشی کی ممانعت کرتے ہیں۔

لیکن مذہب کے معاملے میں یہ کوئی معقول دلیل نہیں۔ پھر یہ ممانعت بھی کس قدر مضحکہ انگیز ہے۔ کیونکہ جو شخص موت سے نہیں ڈرتا۔ اُسے کس سزا کا خوف ہوسکتا ہے؟ اگر قانون اقدام خودکشی کی سزا دیتا ہے۔ تو یہ خودکشی کی نہیں بلکہ اس کم سوادی کی سزا ہوتی ہے جس کے باعث خودکشی کے خواہش مند کی کوشش بار ور نہ ہوسکی۔

مزید براں اگلے زمانے میں لوگ خودکشی کو اس نظر سے ہرگز نہ دیکھتے تھے۔ پلائنی کہتا ہے۔ "زندگی اس قدر پسندیدہ شئے نہیں۔ کہ اسے طول دینے کے لئے ہم ہر قیمت دینے پر تیار ہو جائیں۔ جو پیدا ہوا ہے ایک دن مر جائے گا۔ خواہ اُس کی زندگی کتنی ہی بدکاریوں اور جرائم سے آلودہ کیوں نہ ہو۔ ملول اور مصیبت زدہ دل کو سب سے بڑی راحت اس خیال میں ملتی ہے۔ کہ جو نعمتیں ہمیں قدرت نے عطا کی ہیں ان میں سے باموقعہ موت سب سے اہم اور قیمتی ہے۔ اور یہ نہایت خوش قسمتی کی بات ہے۔ کہ ہر شخص اس نعمت سے فائدہ اُٹھانے پر قادر ہے۔" یہی مصنف ایک اور جگہ لکھتا ہے۔ "قدرت بھی ہر چیز پر قادر نہیں۔ کیونکہ اگر وہ مرنا چاہے۔ تو اپنی موت کو بلانا اس کے بس میں نہیں۔ تاہم ہماری سفلی زندگی کے مصائب و آلام میں موت اُس کی عطا کی ہوئی بہترین نعمت ہے۔" اور سنئے۔ مسّلیا اور زیرہ سیٹس میں جو شخص اپنی جان سے بیزاری کے معقول وجوہ پیش کردے اُسے مجسٹریٹ سب کے سامنے اپنے ہاتھ سے زہر کا پیالہ دے دیتا تھا۔

ذرا غور کیجیے۔ کہ اگلے زمانے میں کتنے شجاع اور عقل مند انسانوں نے اپنے ہاتھوں زندگی سے مخلصی حاصل کی۔ اس میں شک نہیں کہ ارسطو نے خودکشی کرنے والے کو اگرچہ خود اپنی ذات کا مجرم قرار نہیں دیا۔ مگر حکومت کا مجرم ضرور گردانا ہے۔ لیکن سطابیس کی شرح فلسفہ ارسطاطیس میں یہ الفاظ پائے جاتے ہیں "جب بدبختی حد سے بڑھ جائے۔ تو نیک انسان کو زندگی سے کنارہ کرلینا چاہیئے۔ اور جب کوئی بُرا آدمی بے حد آسودہ ہوجائے تو اُس کے لئے بھی یہی مناسب ہے"۔

اور پھر یہ بھی لکھا ہے۔ "وہ شادی کرکے بچّوں کا باپ بن جائے۔ حکومت کے کاموں میں حصّہ لے۔ عموماً نیک زندگی بسر کرے اور زندہ رہے۔ اور پھر اگر ضرورت پڑے اور کسی وقت یہ ضرورت اسے مجبور کردے تو گوشۂ لحد میں پناہ گزیں ہوجائے"۔

مسئلۂ جبر کے معتقدوں نے تو کھُلم کھُلا خودکُشی کی تعریف کی ہے۔ ان کی کتابوں میں سیکڑوں مثالیں مِل جائیں گی۔ جہاں اسے ایک قابلِ تحسین اور دلیرانہ فعل قرار دیا ہے۔ خصوصاً سینیکا کی تصانیف میں تو اس کی بیحد تعریف کی گئی ہے۔ یہ امر بھی کسی سے پوشیدہ نہیں کہ ہندوؤں میں خودکشی مذہبی فعل تصوّر کی جاتی ہے۔ خصوصاً جب کوئی بیوہ اپنے رفیقِ زندگی کا ساتھ دینے کے لئے پروانہ وار اس شمعِ مُردہ پر جل مرتی ہے۔ بلکہ جب کوئی ہندو جگن ناتھ دیوتا کی رتھ کے آگے پڑ کر کچلا جاتا ہے۔ یا گنگا میں کُود کر دریائی جانوروں کی شکم پُری کا سامان بن جاتا ہے یا کسی مقدّس چشمے میں ڈوب کر پران تیاگ دیتا ہے۔ تو اسے بھی اس کے مذہبی جوش پر محمول کیا جاتا ہے۔ سٹیج پر بھی جو زندگی کا آئینہ ہے۔ یہی کچھ دیکھنے میں آتا ہے۔ مثلاً مشہور و معروف چینی ناٹک "لا آرفیلین ڈی لا چائنی" میں تقریباً سب کی سب معزز ہستیاں خودکُشی ہی سے نیستی کے پردے میں چلی جاتی ہیں۔ اور دیکھنے والوں کی ایک لمحے کے لئے بھی یہ رائے نہیں ہوتی۔ کہ یہ لوگ کسی جُرم کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ ہمارے اپنے تھیئٹر کی بھی بہت کچھ یہی حالت ہے۔ مثلاً گوئٹے کے ایک ڈرامے میں پالمائرا۔ شلر کے میریا سٹوارٹ میں مارٹیمر۔ اسی طرح آتھیلو اور کونٹس ٹرزکی وغیرہ۔ شیکسپیئر کے ڈرامے ہملیٹ کا ہیرو جو باتیں اپنے دل سے کرتا ہے۔ کیا انہیں مجرمانہ خیالات سمجھنا چاہئے؟

[1] "زندگی اور خواب کا تار و پود ایک ہی ہے" . . . .

ہستی یا عدم؟ بود و نبود؟ یہ حل طلب سوال ہے کیا قسمت کے تیروں کا ہدف بننا۔ اور چُپ چاپ مصائب جھیلنا زیادہ پُر عظمت کام ہے۔ یا حوادث میں بڑھتے ہوئے طوفان کا دونوں سے مقابلہ کرنا اور مقابلہ کرکے ان کا خاتمہ کر دینا۔ مرجانا سو جانا۔ اور پھر بس۔ لیکن کیا سو جانے سے تمام دردِ سر تمام قدرتی صدمات کا جو جسمِ انسانی کو ورثے میں ملے ہیں خاتمہ ہو جاتا ہے؟ مرجانا سو جانا۔ سو جانا اور پھر شاید کوئی خواب دیکھنا۔ یہ ہے ایک خلش! کیونکہ اس نیند میں خدا جانے کیا کیا خواب دکھائی دیں۔ یہی سبب ہے۔ کہ لوگ اپنی زندگی اور ساتھ ہی جملہ مصائب کا خاتمہ نہیں کرتے۔ موت کے بعد کا خوف اُس نامعلوم مُلک کی موہومیت اور ہمارے ضمیر ہمیں بُزدل بنا دیتے ہیں۔ "ہیملٹ" (تیسرا ایکٹ۔ پہلا سین)

وہ صرف یہ کہتا ہے۔ کہ اگر ہمیں یقین ہو جائے کہ مر جانے پر ہماری ہستی بالکل فنا ہو جائے گی۔ تو موجودہ دُنیا سے عدم آباد بدرجہا بہتر ہے۔ لیکن ایسا ہونا معلوم +

خودکُشی کے خلاف جو دلائل توحید پرست یعنی یہودی مذاہب کے پیرو یا ان کے ہم خیال فیلسوف پیش کرتے ہیں۔ نہایت کمزور اور کم مایہ ہوتے ہیں۔ جن کا بُطلان بڑی آسانی سے کیا جا سکتا ہے۔ ہیوم نے اپنے مضمون "خودکُشی" میں ان کا نہایت جامع اور دنداں شکن جواب دیا ہے + یہ مضمون مصنّف کی زندگی میں عوام النّاس تک نہ پہنچ سکا۔ اور پھر شائع ہونے پر بھی فوراً ہی ضبط کر لیا گیا۔ وجہ وہی شرمناک تعصب اور مذہبی استبداد جو ان دنوں تمام انگلستان پر مسلط ہو رہا تھا۔ چنانچہ اس کی صرف چند جلدیں پوشیدہ اور گراں قدر رقوم کے عوض فروخت ہوئیں + اس عظیم الشان ہستی کا یہ مضمون اور ایک اَور تصنیف باسلے نے شائع کر دی ہیں۔ جس کے لئے ہمیں ممنون ہونا چاہیئے۔ انگریز قوم کے لئے نہایت شرم کا مقام ہے۔ کہ انگلستان کے اتنے بڑے فلسفی کی ایک خالص فلسفیانہ کتاب جس کا مقصد محض یہ تھا کہ خودکُشی کے خلاف موجودہ دلائل کا منطق سے جواب دیا جائے اس طرح استبداد کا نشانہ بنے۔ گویا وہ کوئی نہایت ہی غلیظ تصنیف ہے اور آخر دوسرے ملکوں میں پناہ لینے پر مجبور ہو جائے۔ نیز اس سے ایسے معاملات میں اس وقت کے مُفتیوں کی دماغی کیفیت کا بھی بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے +

میں نے اپنی سب سے بڑی تصنیف میں اس تنہا دلیل کا شافی جواب دیا ہے۔ جو اس وقت اخلاقی نقطۂ نظر سے خودکُشی کے خلاف موجود ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ خودکُشی بلند ترین اخلاقی منزل تک پہنچنے میں حائل ہوتی ہے۔ کیونکہ یہ مصائب و آلام کی دُنیا سے حقیقی مخلصی کی بجائے ایسی مخلصی کا ذریعہ ہے جس کا وجود محض ظاہری ہے + لیکن یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ "غلطی" اور "جُرم" میں بہت فرق ہے۔ اور مسیحی دُنیا کے مُفتی اس بات کے خواہش مند ہیں کہ ہم خودکُشی کو جُرم تصوّر کریں +

مسیحیت کا لُبِ لباب یہ حقیقت ہے۔ کہ زندگی کا سب سے بڑا مقصد جسمانی ایذا یا صلیب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسیحیت خودکُشی کو اس مقصد کے حصول کی راہ میں حائل سمجھ کر مذموم قرار دیتی ہے۔ حالانکہ پرانے زمانے

کے لوگ اس سے کمتر مقاصد پر نظر رکھنے کے باعث اسے جائز سمجھتے بلکہ فضیلت دیتے تھے۔ لیکن خودکشی کے خلاف اس دلیل کو معقول تسلیم کرنے میں ہمیں پوگ اور سنیاس کا قائل ہونا پڑیگا۔ یعنی یہ دلیل ایک اس قدر بلند اخلاقی معیار کے مطابق تسلیم کی جاسکتی ہے۔ جتنا فلاسفۂ یورپ نے اپنے لئے کبھی مقرر نہیں کیا۔ اگر ہم یہ بلند معیار نظر انداز کر دیں تو اخلاقی نقطۂ نظر سے خودکشی کے خلاف کوئی مضبوط دلیل موجود نہیں رہتی۔ موحدانہ مذاہب کے مُفتی خودکشی کے خلاف جس جوش و خروش کا اظہار کرتے ہیں۔ اس کی تائید انجیل کی کسی آیت سے نہیں ہوتی اور نہ اس میں معقولیت کا شائبہ موجود ہے۔ حتیٰ کہ ایسا معلوم ہونے لگتا ہے۔ کہ اس ہٹ دھرمی کی تہ میں ضرور کچھ بھید ہے۔ عین ممکن ہے۔ کہ ان لوگوں کے خیال میں کسی شخص کے اپنے ہاتھوں اپنی زندگی کا خاتمہ کر دینے میں اس ہستی کی توہین مضمر ہو۔ جس کا فرمان ہے کہ "دُنیا میں کوئی چیز بُری نہیں"۔ اگر یہی بات ہے۔ تو اس سے ان مذاہب کے اندھا دھند تسلیم و رضا کی ایک اور مثال ہاتھ آتی ہے۔ یعنی وہ خودکشی کی مذمت محض اس لئے کرتے ہیں۔ کہ کہیں یہ ہمیں خدا کی درگاہ سے مردود نہ کر دے۔

عام طور پر دیکھا جاتا ہے۔ کہ جب زندگی کا خوف بڑھتے بڑھتے موت کے خوف پر غالب آجاتا ہے۔ تو انسان اپنی زندگی کا خاتمہ کر ڈالتا ہے۔ لیکن موت کا خوف کچھ آسانی سے مغلوب نہیں ہو جاتا۔ بلکہ عدم آباد کے دروازے پر پاسبان کی طرح راستہ روک کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ اگر زندگی کا خاتمہ محض منفی فعل ہوتا۔ یعنی ہستی سلب ہو گئی اور بس۔ تو شاید اب تک ہر انسان اپنی زندگی کا خاتمہ کر چکا ہوتا۔ لیکن اس میں اثبات کا پہلو بھی موجود ہے۔ یعنی اتلافِ جسم۔ اور اس سے انسان جھجکتا ہے۔ کیونکہ انسان کا جسم اس کی زندگی کی خواہش کا ثبوت ہے۔

تاہم اس پاسبان کا مقابلہ عموماً اتنا دُشوار نہیں ہوتا۔ جتنا دُور سے نظر آتا ہے۔ اور اس کی وجہ وہ اختلاف ہے۔ جو روحانی اور جسمانی تکالیف میں قائم ہے۔ جب ہم کسی سخت جسمانی عارضے میں مبتلا ہوں۔ تو دوسری تمام تکلیفوں سے بے پروا ہو جاتے ہیں فقط تندرست ہونے کا خیال دامن گیر رہتا ہے۔ اسی طرح سخت رُوحانی تکلیف میں ہم پر جسمانی درد کا اثر نہیں ہوتا۔ ہم اسے بالکل حقیر سمجھتے ہیں۔ لیکن اگر یہ روحانی تکلیف پر غلبہ حاصل کر لے

تو ہماری توجہ دوسری طرف سے ہٹا دیتا ہے اور اس طرح گونہ اطمینان کا موجب بن جاتا ہے +

یہی احساس ہے۔ جو خودکشی کو آسان بنا دیتا ہے کیونکہ اس میں جو جسمانی تکلیف شامل ہوتی ہے وہ اس شخص کی نگاہ میں نہایت ہی حقیر رہ جاتی ہے۔ جو سخت روحانی عذاب سے کراہ رہا ہو۔ یہ بات اس حالت میں خاص طور پر نمایاں ہوتی ہے۔ جب کوئی شخص محض خلقی کمزوری اور حد سے بڑھی ہوئی تلخ مزاجی کے باعث خودکشی کرتا ہے۔ ایسے لوگوں کو اپنے جذبات پر قابو پا لینے کے لئے کسی خاص کوشش کی ضرورت نہیں ہوتی اور نہ خودکشی کرنے کے لئے ہی انہیں کسی اکساہٹ یا ترغیب کی حاجت ہوتی ہے۔ بلکہ جس شخص کے سپرد ان کی حفاظت کا کام ہوتا ہے۔ جونہی وہ چند منٹ کے لئے غیر حاضر ہو یہ فوراً اپنی زندگی ختم کر ڈالتے ہیں +

جب کسی بھیانک خواب میں انتہائی خوفناک موقع آتا ہے۔ تو ہماری آنکھ کھل جاتی ہے۔ اور تمام شب تار و ڈراونی شکلیں ناپید ہو جاتی ہیں۔ زندگی بھی ایک خواب ہے۔ اس میں بھی جب انتہائی خوفناک موقع آکر ہمیں خواب کا سلسلہ منقطع کرنے پر مجبور کر دیتا ہے تو وہی کچھ ہوتا ہے۔ جو پہلے خواب کی حالت میں ہوا کرتا ہے +

خودکشی کو ایک تجربہ بھی تصور کر سکتے ہیں یعنی انسان فطرت کے سامنے ایک سوال پیش کر کے اسے جواب دینے پر مجبور کرنے کی کوشش کرتا ہے، وہ سوال یہ ہے: "موت انسان کی ہستی اور مختلف اشیاء کی ماہیت کے متعلق اس کے علم میں کیا تغیر پیدا کرتی ہے"؟ لیکن یہ تجربہ بے ڈھنگا سا ہے۔ کیونکہ اس میں انسان کی اس قوت کا پہلے ہی خاتمہ ہو جاتا ہے جو سوال کر کے جواب کی طالب ہوتی ہے +

(شوپن ہار) ہری چند اختر

اَنَا

(از مصورِ فطرت خواجہ حسن نظامی صاحب قبلہ)

عربی لفظ ہے۔ مَیں کے معنی رکھتا ہے۔ اَنتَ اس کے مقابلے کا لفظ ہے۔ جس کے معنی تُو کے ہیں +

حضرت منصورؒ نے اناالحق کہا تھا۔ سُولی پر چڑھا دیئے گئے۔ ان کے لفظ میں اَنَا تھا اور حق تھا۔ اور انہی دو کے جوڑ نے اہلِ سیاست کو اور اہلِ شریعت کو منصورؒ کا خونی بنا دیا +

دیکھو تو اَنَا کا لفظ اکیلا ہو تو بے خطا ہے۔ بے قصور ہے۔ اور حق کا لفظ بھی اکیلا ہو تو معصوم ہر گناہ سے اور ہر ایک کا محبوب ہے۔ اور سب سچوں کا مطلوب ہے +

اکیلا اَنَا بولا جائے تو بولنے والا معناً اس کا شریک ہو جاتا ہے۔ مگر کوئی اس کو نہ بولے فقط کاغذ پر لکھ دے تو کسی کو اعتراض کی گنجائش نہ ہو۔ کہ اَنَا الحقّ مراد ہے یا اَنَا الباطل مراد ہے۔ اَنَا آسمان مقصد ہے یا اَنَا زمین۔ اَنَا جبل کہتا ہے یا اَنَا نمل۔ اَنَا الاسود کہتا ہے یا اَنَا الابیض غرض مخلوق میں کوئی چیز بھی جب اَنَا کہتی ہے تو دو کے معنی سے حکم لگایا جاتا ہے۔ ورنہ اکیلا انا ہر حکم سے آزاد رہتا ہے

حضرت موسےٰؑ کا ذکر قرآن مجید میں ہے کہ انہوں نے ایک درخت کی آواز سُنی اَنا اللہ رب العالمین۔ میں اللہ ہوں سب کا رَبّ۔ مگر اس درخت کو نہ حضرت موسےٰؑ نے سُولی دی۔ نہ کسی موسوی نے فتوے لگایا نہ آج تک کفر ساز جماعتوں نے اس درخت کے کفر پر زبان کھولی + البتہ ایک بولتی ہوئی صورت بشری پیکر منصور نے اناالحق کہہ دیا تو مجرم بن گیا سولی دے دیا گیا۔ یہ تو انسان تھا جو اشرف المخلوقات ہے۔ جمادات۔ نباتات۔ حیوانات سے اعلےٰ شان رکھتا ہے۔ تیسرے درجے کی گھٹیا چیز نباتات نے اَنَا اللہ رب العالمین کہہ دیا تو کچھ نہیں کہ اس کا دعوائے ذاتی تھا۔ اس نے اللہ کہا جو اسم ذات ہے اور نباتات سے اعلےٰ و افضل انسان نے اناالحق کہا صفاتی دعوائے رکھا کہ حق اسم صفت ہے تو سولی کا سزاوار سمجھا گیا یہ کیسا انصاف ہے کیسی حق پرستی ہے + موسوی جائیں طور کے درخت کو تلاش کریں جس نے خدائی کا دعویٰ کیا تھا اور اُس کو شریعت کی سزا دیں ورنہ میں ان سب پہ منصور کے قتل کا دعویٰ کرونگا کہ انہوں نے میرے ایک ہمجنس بھائی کو بے گناہ سولی دیدی۔ اور پھر ان سب مُفتیوں کو سولی کی سزا دلواؤں گا۔ انا معصوم ہے حق بے گناہ ہے۔ اگر یہ دونوں مل گئے تو کیا غضب ہو گیا۔ آؤ سب شاعر اور سب لٹریری آدمی مل کر منصور کے قتل بیگناہی کی داد چاہیں اور ہر ایک اپنی اپنی رائے مخزن میں ظاہر کرے +

مَردُ کی خواہش

اس دُنیا سے دُور، بہت دُور، آسمان کے ایک ستارے میں ایک دُنیا آباد ہے۔ جہاں ایسے ایسے کرشمے موجود ہیں جو ہمارے خواب وخیال میں بھی نہیں آسکتے +

اُس دُنیا میں ایک مَرد اور ایک عورت رہتے تھے۔ ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو اپنی دُنیا کی دل فریب وادیوں، شاداب کوہساروں کی سیر کرتے پھرنا ان کا ہر وقت کا مشغلہ تھا۔ اور دوستی بھی تھی ....

ستارے کی دُنیا میں یوں تو ہزارہا عجائبات تھے۔ لیکن سب سے عجیب اور نرالی چیز ایک گنجان جنگل تھا۔ جہاں درخت ایک دوسرے کے پاس پاس۔ اَور اُن کی شاخیں اَور پتے آپس میں اس طرح گھتم گتھا ہو رہے تھے۔ کہ سورج کی روشنی اور چاند کی چاندنی کا یہاں مطلق گزر نہ ہوتا تھا۔ اس لئے دن ہو یا رات وہاں ہر وقت اندھیرا چھایا رہتا تھا +

اس جنگل کے درمیان ایک قربان گاہ تھی۔ رات کے سنّاٹے میں اگر کوئی تنِ تنہا وہاں جاتا اور قربان گاہ کی سیڑھیوں پر دوزانو بیٹھ جاتا۔ اور اپنے سینے کو ننگا کر کے اُسے پتھروں سے اتنا زخمی کرتا کہ سنگ مرمر کی سیڑھیاں خُون سے بھر جاتیں۔ تو ایسے وقت میں وہ مجروح جو کچھ بھی طلب کرتا اُسے مِل جاتا تھا +

عورت، مَرد کو سچّے دل سے چاہتی اور اُسے راحت پُہنچانے کے لئے ہمیشہ طرح طرح کی تجویزیں سوچا کرتی تھی۔ اُس کی سب سے بڑی خوشی یہ تھی۔ کہ جس طرح سے بھی ہو سکے مرد کو خوش کرے اور اُس کی مسرّتوں میں اور زیادہ اضافہ کر دے +

ایک رات جب سمندر کے کنارے وہ مرد کے سر کو اپنی آغوش میں لئے بیٹھی تھی مَرد سمندر کے پانی میں، چاند کا رقص دیکھ دیکھ کر، موجوں کے زمزمے سُن سُن کر، میٹھی نیند سو گیا۔ اُس وقت عورت نے مرد کے سَر کو آہستگی کے ساتھ اپنی آغوش سے رکھ دیا۔ اَور اُس گھنیرے جنگل کی طرف چل دی۔ ماہتاب نور کی بارش کر رہا تھا۔ اَور درختوں

کے پتّوں سے شعاعیں نکلتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں سمندر کی لہریں نقرئی نظر آتی تھیں۔ لیکن جنگل میں حسبِ معمول اندھیرا تھا۔ عورت نے جی کڑا کر کے جنگل میں قدم رکھا۔ اُس کے سر پر درختوں کی شاخیں دست و گریبان ہو رہی تھیں۔ اور قدموں کے پاس سوکھے ہوئے پتّوں پر کہیں کہیں چاندنی کا کوئی ننھّا سا داغ نظر آجاتا تھا۔ لیکن جوں جوں آگے بڑھتی جاتی تھی۔ اندھیرا اَور بھی گہرا ہوتا جاتا تھا۔ ٹٹولتی ٹٹولتی آخر جب وہ جنگل کے وسط میں پہنچ گئی تو اُسے سنگِ مرمر کی سفید قربان گاہ نظر آئی۔ اس جگہ اس بلا کا سکوت چھایا ہؤا تھا۔ کہ پتّے کے ہلنے کی آواز بھی سُنائی نہ دیتی تھی۔ وہ سہمی ہوئی، قربان گاہ کی سیڑھیوں پر گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی۔ اور دھیمی دھیمی آواز میں پرستش کرنے لگی۔ مگر کچھ جواب نہ ملا۔ اب اُس نے اپنے سینے پر سے کپڑا ہٹا دیا۔ ایک دو دھارا تیز پتھر اُٹھالیا۔ جو پاس ہی پڑا ہؤا تھا۔ اور اپنے نازک سینے پر زور زور سے ضربیں لگانے لگی۔ ایک ہی دو ضربوں میں اُس کے سینے سے خون کے فوّارے چھوٹنے لگے۔ اور آن کی آن میں مرمری سیڑھیاں خون سے سُرخ ہو گئیں۔ ساتھ ہی ایک آواز آئی:" تو کیا چاہتی ہے"؟

عورت نے کہا:" ایک مرد ہے جسے میں پیار کرتی ہوں۔ میں اُسے کوئی اچھے سے اچھا تحفہ دینا چاہتی ہوں"۔

پھر آواز آئی۔" کیسا تحفہ"؟

وہ بولی:" یہ تو میں بھی نہیں جانتی لیکن چاہتی ہوں۔ کہ اس خون کے صلے میں اُسے کوئی ایسی چیز مل جائے۔ جو اُس کی خواہش کے عین مطابق ہو اور جسے حاصل کرکے اُس کا دل باغ باغ ہو جائے"۔

جواب ملا:" جا! تیری دعا قبول ہوگئی وہ چیز اُسے مل جائے گی"۔

یہ سُن کر عورت وہاں سے اُٹھی۔ اپنا زخمی سینہ کپڑے سے چھپا کر، ہاتھ سے دبا لیا۔ تاکہ خون نہ بہے۔ پھر وہ تیز تیز قدم اُٹھاتی ہوئی واپس آنے لگی۔ سوکھے ہوئے پتّے اُس کے پاؤں کے نیچے آکر چُر چُر ہو رہے تھے۔ جنگل سے باہر چاندنی میں، ہَوا کے ہلکے خوشبودار جھونکے سرسرا رہے تھے۔ اور دُور سے ساحل کی ریت جگ مگ جگ مگ کرتی نظر آتی تھی۔ عورت کا دل خوشی سے معمور تھا۔ وہ بے تحاشا دوڑنے لگی۔ چاہتی تھی جس قدر جلد ممکن ہوسکے، پہنچے۔ اور مرد کو یہ مژدہ سُنائے۔ لیکن جب ذرا قریب پہنچی تو یکایک ٹھہر گئی۔

س نے دیکھا۔ کہ سطحِ آب پر کوئی بڑی سی چیز
ل چل رہی ہے۔ بہت حیران ہوئی۔ اس سے
پہلے یہ نظارہ کبھی نہ دیکھا تھا۔ آنکھوں پر اوٹ
ر کے غور سے دیکھا۔ تو معلوم ہوا۔ جیسے ایک
شتی پانی پر تیزی سے بہی جا رہی ہے۔ اور اس
میں انسانی قد و قامت کا کوئی سایہ کھڑا ہے
چہرہ تو نظر نہ آتا تھا۔ مگر اس شبیہہ کو فوراً پہچان
گئی۔ کشتی بلا کی تیزی سے بہی جا رہی تھی۔ نظر آ
رہا تھا جیسے اسے کوئی بھی چلا نہ رہا ہو۔ بلکہ کسی
پوشیدہ طاقت کے زور سے آپ ہی آپ بہی
جا رہی ہو۔ صاف صاف کچھ بھی دکھائی نہ دیتا
تھا۔ اس پر طرہ یہ کہ کشتی لحظہ بہ لحظہ دور ہی دور
ہٹتی جاتی تھی۔ تاہم دھندلکے میں معلوم ہو رہا
تھا۔ جیسے اس کشتی کے سرے پر ایک اور سایہ
بھی بیٹھا ہوا ہے + عورت نے پوری تیزی
سے دوڑنا شروع کیا۔ مگر جب وہ کنارے
پر آئی تو کشتی کہاں سے کہاں پہنچ چکی تھی۔ عورت
نے بے تابی سے اپنے ہاتھ پھیلا دئے۔ اس
کے ساتھ ہی سینے کا بند بھی کھل گیا۔ زخموں سے
خون کے قطرے ڈھلک رہے تھے۔ اور چاند
کی کرنیں انہیں بوسے دے رہی تھیں +
اتنے میں پیچھے سے کسی نے پوچھا۔
"کیوں۔ کیا ہوا؟"

عورت نے چلا کر کہا:- "اپنے سینے کا
خون بہا کر میں نے اس کے لئے سب تحفوں سے
اچھا تحفہ خریدا اور اسے دینے آئی ہوں۔ پر
وہ تو مجھ سے بھاگا جا رہا ہے +
آواز نے ملائمت سے کہا:- "تیرا تحفہ
تو اس کی خواہش کے مطابق اسے مل چکا ہے" +
عورت نے چلا کر پوچھا:- "کیا؟"
آواز نے جواب دیا:- "یہی کہ تجھ سے
کنارہ کرلے۔ تجھے چھوڑ دے" +
عورت نے اس کا کچھ جواب نہ دیا۔
اب کشتی روپہلی دھند میں مدھم ہوتے ہوتے
غائب ہو گئی تھی۔ آواز نے پوچھا:- "کیا تو
راضی ہے؟"
وہ بولی:- "ہاں میں راضی ہوں۔ راضی
ہوں" +
ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ لانبے
لانبے کھلے بال کبھی اس کے مجروح سینے پر
لوٹتے تھے۔ کبھی عریاں گردن پر۔ وہ سمندر
کے نیلے خوش رنگ پانی کو ٹکٹکی لگائے دیکھ
رہی تھی۔ سمندر کی تند لہریں دور دور سے آکر
اس کے قدموں پر لوٹتی تھیں۔ اور ٹوٹ جاتی
تھیں۔ پھر صدہا چھوٹی چھوٹی لہریں بن جاتی تھیں +

(غلام عباس)

نقصِ تربیت

(از جناب ایچ احمد فخری۔ پانی پتی)

گرمی کا موسم اور۔ دوپہر کا وقت ہے آفتاب عالمتاب نصف النہار کی بلندی پر پہنچ چکا ہے۔ اور اپنی روشن اور تابناک شعاعوں سے اس تیرہ و تار خاکدانِ عالم کو کرۂ نار بنا رہا ہے۔ اس وقت ہر جاندار انسان یا حیوان گرمی کی شدت سے بے تاب ہے۔ اور چاہتا ہے کہ کسی ایسی جگہ جا کر پناہ لے۔ جہاں قدرے آرام نصیب ہو۔ ایسی حالت میں ایک غریب اور بے آزار کُتا سڑک کے کنارے ایک نالی میں سر چھپائے پڑا ہے۔ ایک کم سن اور نابالغ لڑکا اُدھر سے گزرتا ہے۔ کُتّے کو دیکھ کر پتھر اُٹھاتا ہے۔ اور اس زور سے کُتّے کے سر پر مارتا ہے۔ کہ بیچارہ بے تحاشا چیختا چلاتا دوڑا چلا جاتا ہے ٭

خدا کی شان۔ بچہ اور معصوم بچہ۔ جس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہ فطرت کا سچا فرزند اور قدرت کا حقیقی پرستار ہے۔ جس کی بابت مشہور ہے کہ وہ معبدِ کائنات کے اُن مقدس مقامات تک جانے کا مجاز ہے جہاں بالغ النظر ہستیوں کے پَر جلتے ہیں۔ اب وہی بچہ ہے اور یہ سنگدلی۔ اب وہی معصوم ہے اور یہ ستم شعاری۔ جس کو دیکھ کر دیرینہ مشق ستم آزما طبائع بھی لرز جاتی ہیں۔ اور نہایت سخت اور کروہ الفاظ میں اپنے جذباتِ نفرت و حقارت کا اظہار کرتی ہیں ٭

دماغ محوِ حیرت ہے۔ کہ اس کے کیا معنی؟ عجیب منظر ہے۔ معصوم خاطی ہے۔ اور خاطی معصوم ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ معاملہ کیا ہے۔ مگر حقیقت میں یہ کوئی تعجب خیز امر نہیں۔ ایک معمولی واقعہ ہے۔ جو اسی طرح ہوتا رہا ہے۔ اور ہمیشہ ہوتا رہے گا۔ دُنیا عالمِ اسباب ہے۔ مساوی اسباب سے مساوی نتائج برآمد ہونگے۔ اس کے خلاف ہرگز نہ ہوگا۔ بچہ معصوم ہے۔ اس کا دل اور دماغ معصیت کے جذبات سے معرّا ہیں۔ وہ اپنے والدین کے جذبات اور حسیات کا آئینہ ہے۔ وہ اپنی سوسائٹی کے اخلاق و عادات کا نمونہ ہے۔ وہ خود زیرِ تعلیم ہے

وہ ایک زندہ لوح ہے۔ جو ہر قسم کی نقش پذیری کے لئے آمادہ ہے۔ یہ اس کے معلموں کا کام ہے۔ کہ اس کے لوح دل کو جس قسم کے نقش ونگار سے چاہیں آراستہ کر دیں۔

اولین اور بہترین معلم والدہ ہے۔ جو مولود کی تعلیم و تربیت کا بار اُس وقت اپنے ذمے لیتی ہے۔ جب اُسے خود اپنی ذمے داری کا احساس نہیں ہوتا۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ مولود اپنی والدہ کے جسم کا ایک جزو ہوتا ہے۔ اس کی ہستی کوئی الگ اور مستقل ہستی نہیں ہوتی۔ والدہ کے اقوال و افعال۔ اس کے جذبات و خیالات۔ اس کے اخلاق و خصائل مولود کے جسم و جان پر اس قدر گہرا اثر کرتے ہیں۔ کہ عمر بھر قائم رہتا ہے۔ اور کسی طرح مٹائے نہیں مٹتا۔ مبارک ہیں وہ لوگ جن کو اس زمانے میں ایسی تعلیم نصیب ہو۔ جو اُس کی آئندہ زندگی کے لئے مفید اور کارآمد ثابت ہو۔ مگر ایسا بہت کم ہوتا ہے اگر ہو بھی تو محض اتفاقی ہے۔ ایام رضاعت میں بچے کو جو تعلیم دی جاتی ہے۔ وہ ایک طرف تو اُسے کافی بزدل اور کم ہمت بنا دیتی ہے۔ دوسری طرف نہایت سنگ دل اور شقی القلب۔ ابھی اس معصوم کو اپنی ہستی کا شعور نہیں ہوتا۔ کہ اُسے ایک طرف تو یہ تعلیم دی جاتی ہے۔ کسی کے طمانچہ مارے۔ کسی کا مُنہ چڑائے۔ کسی کو بدزبانی سے یاد کرے۔ اور دوسری طرف یہ سبق پڑھایا جاتا ہے۔ کہ نادیدہ وہمی اور خیالی باتوں سے ڈرے۔ اور ڈر کر کبھی ماں کی گود اور کبھی باپ کی آغوش میں پناہ لے۔ اس منزل سے ذرا آگے بڑھتا ہے۔ تو فرض شناس معلموں کی محبت اس کے ہاتھ میں ایک چابک دیتی ہے۔ بے زبان جانداروں پر مشق ستم کراتی ہے۔ کبھی در و دیوار اس کی جفا کاری کا تختۂ مشق بنتے ہیں کبھی میز کرسی وغیرہ اس کی ستم شعاری کا نشانہ ہوتے ہیں۔ اس درجے سے آگے قدم نکالتا ہے۔ تو نشو و نما سے مجبور ہو کر ماں کی گود سے وہ فرش پر گھٹنوں چلتا ہے۔ رستے میں تکئے سے ٹکراتا ہے کسی چیز سے چوٹ کھاتا ہے۔ اور ننھا سا ہونٹ نکال کر بسورنے لگتا ہے ماں محبت سے بے قرار ہو کر دوڑتی ہے۔ بچے کو چھاتی سے لگاتی ہے۔ تکئے کو کوستی اور فرش کو صلواتیں سناتی ہے۔ اور بچے کو ناکردہ گنہگاروں کو ستانے کی عملی تعلیم دیتی ہے جب یہ مرحلہ بھی طے کر چکتا ہے۔ تو آموختہ سبق کی مشق و مزاولت جانداروں پر شروع کرتا ہے۔ کبھی کم آزار گھریلو جانور۔ کبھی ہم عمر

بچّے اس کی بے دردیوں کا شکار ہوتے ہیں۔ اسی طرح درجہ بدرجہ اور منزل بہ منزل یہاں تک ترقی کر جاتا ہے۔ کہ تھوڑی دیر کے لئے اپنے معلموں کے لئے بھی باعثِ ننگ و عار ہوتا ہے۔

ہمارے مُلک میں جہاں کتّا دیکھتا ہے کہ کسی شخص نے جھک کر زمین سے پتھر اُٹھایا ہے۔ تو فوراً بھاگ جاتا ہے۔ یہی حال قریب قریب اکثر ملکوں کا ہے۔ کہ جہاں کُتّے کو اس قسم کا کوئی شُبہ پیدا ہوا۔ اور وہ بھاگا۔ مگر دیکھنے والے کہتے ہیں۔ کہ جاپان میں یہ کیفیت نہیں۔ وہاں کُتا دیکھتا ہے۔ اور آرام سے لیٹا رہتا ہے۔ وہ سر مو جنبش نہیں کرتا۔ وہ جانتا ہے۔ یہ سب کچھ جو کیا جا رہا ہے۔ میری آزار دہی کے لئے نہیں کیا جا رہا۔ اس کا ذاتی اور نسلی تجربہ تمام دُنیا کے مہذب اور متمدن دُنیا کے کُتوں کے تجربے سے مختلف ہے۔ وہاں یہ رسم نہیں کہ کسی جاندار یا بے جان کو بے وجہ تکلیف دے کر اپنے حیوانی جذبات کو تسکین بخشی جائے۔ وہاں کی تعلیم قابلِ تقلید ہے۔ معلّم اوّلے یعنی والدہ اپنے لختِ جگر کو ایک طرف تو رحم و انصاف کی تعلیم دیتی ہے۔ اور جبر و تشدّد سے نفرت و حقارت پیدا کرتی ہے۔ دوسری طرف خوف اور بزدلی کے کمینہ جذبات کو بیخ و بُن سے اُکھاڑ پھینکتی ہے۔ غرض ہر پہلو سے اپنے نورِ نظر کے لوحِ قلب کو اس قسم کے نقش و نگار سے مرصع کرتی ہے۔ جو تہذیبِ انسانی کے لئے مایۂ فخر و ناز ہیں۔ تعلیم کے اوّلین زمانے سے اخلاقِ فاضلہ کا اکتساب اور عاداتِ فاسدہ کا استیصال اس کے معلّم کا فرض ہوتا ہے۔ اُسے اپنی ذمّے داریوں کا احساس ہے۔ اسے اپنی اور مولود کی موجودہ اور آئندہ ضرورتوں کا علم ہے۔ اسے معلوم ہے اور خوب معلوم ہے کہ وہ ایک معلّم کی حیثیت رکھتی ہے اور ادائے فرائض میں سعی و کوشش کا کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھتی۔ وہ اپنے اندر تمام محاسن جمع کرتی ہے۔ اور تمام معائب سے اپنی ذات کو پاک کرتی ہے۔ یہاں تک کہ جب وہ نو آئند ہستی ایک الگ اور مستقل صورت اختیار کرتی ہے۔ تو وہ ملکہ اخلاقِ حسنہ کی جیتی جاگتی تصویر اور ملکاتِ فاضلہ کی زندہ کتاب بن جاتی ہے۔ وہ کوشش کرتی ہے کہ شاگرد کی تعلیم و تربیت کچھ اس انداز سے ہو۔ کہ ایک طرف تو وہ رحم و شجاعت کا پُتلا ہو۔ دوسری طرف ظلم و ستم کا دُشمن۔ اُس کو سکھایا جاتا ہے کہ بزرگوں کا ادب و احترام ملحوظ رکھے۔ اسے

بنایا جاتا ہے۔ کہ ضعیفوں اور ناتوانوں کی حمایت کرے۔ اس کے سامنے صداقت اور راست بازی کی دلکش تصویر کچھ اس انداز سے کھینچی جاتی ہے۔ کہ دل پر نقش ہو جاتی ہے +

قانون الٰہی کا اقتضا ہے۔ کہ دُنیا میں ناگوار واقعات بھی کم و بیش پیش آئیں۔ ایسی حالت میں معلّم کا یہ رویّہ ہوتا ہے۔ کہ بچّے سے تو وہی ہمدردی کی جائے۔ جس کا وہ مستحق ہے مگر نا کردہ گناہ تکیئے کو موردِ عتاب نہ بنایا جائے۔ اس سے بچّے کے دل پر ناجائز ستم کاری کا نقش بیٹھ جائے گا۔ انصاف اور رحم کا جذبہ مغلوب ہو جائے گا۔ ہوتے ہوتے وہ سنگدل اور کور باطن ہو جائے گا۔ اس کے خلاف اگر تکیئے و فرش کو بھی اسی ہمدردی میں شریک کر لیا جائے۔ تو بچّے کے دل پر رحم و انصاف کے جو اعلےٰ و ارفع جذبات اور مشیّت الٰہی کی اطاعت کے جو بیش بہا خیالات پیدا ہونگے اُن کا اندازہ کچھ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو اس قسم کی تعلیم کے بانی ہیں۔ وہ بچّے جو قدرت کے سچّے فرزند اور فطرت کے اصلی پرستار گنے جا سکتے ہیں۔ وہ جو معبد عالم کے حقیقی مؤید ہیں۔ جن کو عبادت کائنات کے مقدس ترین مقامات تک جانے کا حق حاصل ہے۔ وہ بچّے جن کی نظریں حُسن مطلق کے جمال جہاں آرا سے روشن ہیں جسکے جلوۂ ناز سے جُدا ہونے پر دُنیا گریاں و نالاں ہوتی ہے۔ جو نَے کی طرح جُدائی کی شکایت کرتے ہیں۔ جو بچپن کے ساختہ قانون کو شباب میں اور شباب سے گزر کر ضعیفی میں اپنی زندگی کا اسی طرح دستور العمل بنائے رکھتے ہیں۔ جس طرح صغر سنی کے معصوم اور بے گناہ زمانے میں۔ وہ بچّے ہمارے مُلک کے بچّے نہیں۔ ہمارے مُلک کے بچّے تو جفا شعاری اور بُزدلی کے مجسّم نمونہ ہیں +

رباعیات گرامی

آن ختم رسل شاه عرب ماه عجم
آن موج نخستین ز دریای قدم
وز تابش آفتاب محشر چه غم است
دستی من و دامن رسول اکرم

[illegible] ست اعراب
ما را دل و سینه و داغ ماه عرب است
با [illegible] شکن سینه بی‌تاب
[illegible] دوست
[illegible] ست بگفتنی بعجم [illegible] عین عرب است
رحمت است که پرده‌دار [illegible] است

فاران دگرست و کوه سینا دگرست
موسیٰ دگر و شمع [illegible] موسیٰ دگرست
[illegible] بیت عرب
موسیٰ و مصطفیٰ چه [illegible] دگرست
ساحل دگر است عین دریا دگرست

[illegible] قاف طلبی
صبح ازلست و درس ما [illegible] نسبی
[illegible] سببی
با [illegible] دوست [illegible] شاهی ما
و فاتحه ست شهنشاهی ما
جمله قصه است که آن فخر رسول عربی

کرشن کماری

(۱)

چتون یہ کہہ رہی ہے کسی خُردسال کی
اچھا شباب آنے دو، پھر دیکھنا ہمیں

کرشن کماری، نہ معلوم کن لطافتوں اور نزاکتوں کا مرقع تھی، کہ بچپن ہی سے اس میں شوخیٔ شباب کی جھلک نظر آتی تھی۔ اس کے ہر انداز میں بلا کا جوبن تھا۔ اور تیز خط و خال اس کی دلی و دماغی قابلیتوں کے آئینہ دار تھے وہ ننھی، معصوم اور حسین راج کماری والئِ میواڑ کے باغ کی ایک ہی کلی تھی۔ جس سے سارے خاندان کی اُمیدیں وابستہ تھیں +

(۲)

رعنائیٔ صورت سے مسخر تھا زمانہ۔
ہر ایک پلک نیچہ، ہر تین کٹاری +

راج کماری کے بڑھتے ہوئے جمال کا شُہرہ، شدہ شدہ، مُلک کے ہر کونے میں ہونے لگا۔ مختلف علاقوں کے راج کمار اور شہزادے اس "حُسنِ شہرۂ آفاق" پر آنکھیں لگائے ہوئے تھے۔ یہی نہیں۔ بلکہ اس حُسنِ مجسم کے دل افروز افسانوں نے انہیں اس قدر مشتعل اور بے خود کر دیا تھا۔ کہ اس کا یقینی نتیجہ کُشت و خُون اور مُلک کے تمام صوبوں میں بدامنی اور اس کے ہیبت ناک نتائج کے سوا کچھ نہ تھا۔ جس کا اثر اس سے بھی دُور، کئی ایک بھرے گھروں کو ویران، اور آباد شہروں کو سُنسان کر دیتا۔ یعنی ایک راج کماری کے لئے اس قدر بے گناہ جانیں موت کے گھاٹ اُتار دی جاتیں۔ اس قدر خانماں بے چراغ کر دئے جاتے۔ اور اس قدر مال و متاع نذرِ آتش کر دیا جاتا۔ صرف یہ ہی نہیں۔ اس کے علاوہ بھی کئی ایک مصائب و آلام مُلک کی خوش گوار فضا کو مکدر بنانے کے لئے منتظر تھے!

یہ تمام باتیں والئے میواڑ کی "پختہ کار اور محتاط" آنکھیں مستقبل کے پردے میں صاف طور پر دیکھ رہی تھیں۔ وہ ان تمام ہولناک اثرات سے بالکل باخبر تھا۔ اور راج کماری کی وجہ سے ملک پر آنے والی اس آفت کا

خیال اسے دن رات کھائے جا رہا تھا +

(۳)

"زہر کا پیالہ"......... اس کے نام ہی نے حرم بھر میں ایک شور بپا کر دیا + نازک دل محلوں میں رہنے والی رانیاں، جو بظاہر خفیف سے خفیف "تکلیف" تک کے نام سے ناواقف تھیں، ہر طرف ہراساں پھر رہی تھیں۔ ان کے لئے "زہر کا تصور" ہی "زہر کا اثر" رکھتا تھا۔ مگر آہ! اس نوجوان حسین، اور معصوم کرشن کماری کے دل کی مسرت کا اندازہ کون کر سکتا ہے۔ جس نے اپنے پتا کے بھیجے ہوئے زہر کے پیالے کا بصد خوشی اپنے نازک لبوں سے خیر مقدم کیا۔ اور اُسے "امرت" جان کر پی گئی!!!

کنھیا لال ثاقب

زبانِ آرزو

(از جناب شیخ عبد اللطیف صاحب تپش بی۔ اے)

ہمارے دوست جناب تپش کا کلام عام طور پر عالمانہ ہوتا ہے آپ عام سطح سے بے انتہا بلند اُڑتے ہیں۔ لیکن اہلِ نظر جانتے ہیں۔ کہ یہ اُستادانہ اور پختہ رنگِ سخن کس قدر مشکل ہے۔ (ایڈیٹر)

خموشی کو مری سازِ زندۂ رنگیں نوا کر دے
صدائے تارِ شکستہ ہوں مُطربِ آشنا کر دے

بقدرِ جلوۂ بے باک اگر شوقِ نمائش ہے
مجھے بے تابِ نظارہ باندازِ وفا کر دے

بقائے آرزو دشوار ہے بے ربطیٔ دل سے
نوائے شوق کو تمہیدِ آہنگِ فنا کر دے

یہ اُفتادِ جنوں آئینۂ صحرا نہ بن جائے
یہی حیرت کا نقشہ ہے تو مجھ کو نقشِ پا کر دے

کہیں ہوتی نہیں یوں پرسشِ ضبطِ جنوں یارب
خموشی کو مری ہنگامۂ روزِ جزا کر دے

رادھا کی کنٹھی

(از جناب میاں ایم اسلم صاحب)

تھوڑی مدت کا ذکر ہے۔ گنگا کے کنارے ایک چھوٹا سا گاؤں آباد تھا۔ لوگ خوش حال تھے اور کھیتی باڑی کرتے تھے۔ صبح سویرے دریا پر اچھی خاصی رونق ہوتی تھی۔ عورتیں اور مرد اشنان کرتے۔ گنگا مائی کو پھول چڑھاتے مچھلیوں کو آٹا دیتے۔ بوڑھے بوڑھے گیانی کنارے پر بیٹھ کر آنکھیں بند کئے پہروں پوجا پاٹ میں مصروف رہتے +

گاؤں سے کچھ فاصلے پر نیم کے بڑے بڑے پیڑوں کے درمیان شیوجی کا چھوٹا سا مندر تھا۔ اس مندر اور دریا کے درمیان برگد کا ایک عظیم الشان پیڑ تھا۔ جس کے نیچے ایک ٹوٹی پھوٹی بارہ دری تھی۔ ایک بوڑھا سادھو۔ اُس کی بیوی اور ان کا ایک لڑکا اس بارہ دری کے مکین تھے۔ لڑکے کا نام رام پیارے تھا۔ اور اس کی عمر نو دس برس کے درمیان تھی۔ اس کا گورا رنگ سنہری بال اور موٹی موٹی آنکھیں دیکھنے والوں کو بھلی معلوم ہوتی تھیں +

اس گاؤں میں ایک زمیندار رتو نام رہتا تھا۔ جو عام طور پر چودھری رتو کہلاتا تھا۔ چودھری کی بیوی کو مرے کئی سال گزر چکے تھے۔ لیکن اس کی یادگار ایک بھولی بھالی لڑکی رادھا تھی۔ جس کی عمر اس وقت سات آٹھ سال کے لگ بھگ ہوگی۔ یہ لڑکی چھوٹی سی عمر میں معصومیت اور حسنِ قدرت کی ایک من موہنی مورت نظر آتی تھی۔ رتو کو اپنی بیٹی سے اتنی محبت تھی۔ کہ اس نے دوسری شادی نہ کی۔ اور جب تک رادھا چلنے پھرنے کے قابل نہ ہوگئی۔ وہ اُسے گود میں اُٹھائے اُٹھائے پھرتا رہا + جب کچھ سیانی ہوئی۔ تو رتو اُسے سادھو کے پاس چھوڑ دیتا۔ اور آپ کام کاج میں مصروف ہوجاتا +

رادھا سارا دن رام پیارے کے ساتھ ادھر اُدھر کھیلتی پھرتی۔ شام کے وقت رتو اُسے گھر لے جاتا۔ کبھی کبھی رام پیارے بھی ساتھ جاتا۔ سادھو اور اُس کے چھوٹے سے کنبے کا کھانا

دونوں وقت رتو کے گھر سے آجایا کرتا۔ بوڑھا سادھو اور اُس کی جورو رادھا سے بے حد محبت کرتے۔ دیکھنے والے اُسے ان ہی کی بیٹی سمجھتے تھے +

سادھو کی عمر اسی طرح گزری تھی۔ وہ اکثر گیان دھیان میں مصروف رہتا۔ بوڑھے اور فقیر منش دہقان شام کے بعد اُس کے پاس آبیٹھتے اور دیر تک پند نصیحت کی باتیں سُنا کرتے + سادھو رام پیارے اور رادھا کو بھی پاس پاس بٹھا کر طرح طرح کی کہانیاں سُناتا۔ اور اُن کے معصوم دلوں میں ہمدردی، رحم، اور فیاضی کے جذبات پیدا کرنے کی کوشش کرتا +

برگد کے پیڑ پر کسانوں نے اپنے بچوں کے کے لئے جھولے ڈال رکھے تھے۔ رادھا اور رام پیارے بھی یہیں جھولا جھولتے۔ اور ایک دوسرے کو باری باری جھُلاتے +

رام پیارے بارہ (۱۲) سال کا ہوا۔ تو اُس کی آنکھیں دکھنے آئیں۔ اور یہ آشوب اتنا بڑھا کہ آخر بے چارہ آنکھوں کی نعمت سے محروم ہوگیا بوڑھے ماں باپ کو قدرتی طور پر صدمہ ہوا۔ بیچاری ماں بچے کی بے کسی کا خیال کر کے رویا کرتی۔ لیکن سادھو اُسے ہمیشہ تسلی دیتا اور کہتا۔ جو بھگوان کرے سو ہو۔ کیوں روتی ہے!

لیکن سب سے زیادہ صدمہ معصوم رادھا کے دل پر تھا۔ اُس کے معصوم دل میں ہمدردی کی لہریں مار رہی تھی۔ وہ رام پیارے کا ہاتھ پکڑ کر حسبِ عادت اُس کے ساتھ ساتھ ادھر اُدھر گھُوما کرتی۔ کبھی کبھی جھُولے پر بٹھا کر آہستہ آہستہ جھُلاتی + رام پیارے بھی جہاں رادھا اُسے کھڑا کر دیتی۔ وہیں سے کھڑے ہو کر رادھا کو جھُولاتا + سادھو اور اُس کی بیوی بارہ دری کی ٹوٹی ہوئی محرابوں میں بیٹھے معصومیت کا یہ نظارہ دیکھتے رہتے +

مصیبت تنہا نہیں آتی بھادوں کے مہینے گاؤں میں ہیضہ پھیلا۔ سادہ لوح دہقانوں نے اس بلا سے نجات پانے کے لئے سبھی جتن کئے گنگا کی پوجا کی۔ شوجی کے پجاریوں کو بھوجن کھلائے۔ غریبوں کو دان دیا۔ لیکن ہیضے نے اس قدر زور پکڑا کہ چار پانچ موتیں ہر روز ہو جاتیں +

بوڑھا سادھو اور اُس کی بیوی ایک ہی روز بیمار ہو کر بیکنٹھ کو سدھار گئے۔ چودھری رتو اور گاؤں والوں نے مل کر ان دونوں کی ارتھی بڑی عزت سے اُٹھائی۔ گھی چندن وغیرہ ہون کیا۔ اور لاشیں گنگا کے آغوش میں سُلا دیں +

اس روز رتو اور رادھا دونوں نے رام پیارے کے پاس بارہ دری میں رات بسر کی + بیچارہ اندھا اب دُنیا میں اکیلا رہ گیا تھا۔ رتو نے چاہا۔ کہ اس کو اپنے گھر لے چلے۔ مگر نابینا نے منت سے یہ خواہش ظاہر کی۔ کہ مجھے اسی جگہ رہنے دو۔ جہاں میں کھیل کود کر اتنا بڑا ہوا ہوں +

پھول کھلے اور مُرجھائے۔ مہینے اور موسم گزرتے گئے + رام پیارے اُسی اُجڑی ہوئی بارہ دری میں مقیم رہا۔ اب وہ ایک خوب صورت جوان تھا۔ لیکن آنکھوں سے معذور۔ اس کی اُمیدوں کی ابتدا اور انتہا صرف رادھا تھی + رادھا بھی اب وہ پہلی سی ننھی مُنی رادھا نہ رہی تھی۔ بلکہ یہ دہقان دوشیزہ اس وقت حُسن و صورت میں اپنا ثانی نہ رکھتی تھی۔ اُس کے نازک نازک گلابی ہونٹ برگ گل کو شرماتے تھے۔ اس کا پیارا پیارا چہرہ چاند کو مات کرتا تھا۔ آنکھیں ایسی خوب صورت تھیں جیسے کنول کی کٹوری میں شبنم کے قطرے رکھے ہوں + گاؤں کی نیک دل بوڑھی عورتیں محبت سے اس کو حُسن کی دیوی کا اوتار کہا کرتی تھیں۔ لیکن عام عورتوں کو یہ ناگوار معلوم ہوتا تھا۔ کہ اتنی بڑی جوان لڑکی ابھی باپ ہی کے گھر میں بیٹھی ہے +

نابینا رام پیارے سے یوں تو سارا گاؤں ہمدردی اور پریم رکھتا تھا۔ لیکن در اصل ماں باپ کے بعد صرف رادھا ہی اُس کی خبر گیراں تھی۔ اگرچہ رادھا کو اب گھر کا سارا کام کاج کرنا پڑتا تھا۔ مگر وہ دو تین بار رام پیارے کے پاس ضرور پہنچ جاتی۔ اور دیر تک وہاں بیٹھی اپنی باتوں سے اُس کا دل بہلایا کرتی تھی + اس کا معمول تھا کہ صبح سویرے دودھ دوہ کر رام پیارے کے لئے لاتی۔ بارہ دری میں جھاڑو دے کر جگہ صاف کرتی۔ دونوں وقت کا کھانا پاس بیٹھ کر کھلاتی۔ کبھی کبھی اس کا سر دھو کر بالوں میں کنگھی کرتی۔ کپڑے میلے ہوتے تو دھو کر صاف کر دیتی تھی + ہر شام چراغ روشن کرتی اور ٹہلیا میں تازہ پانی بھر کر نابینا کے پاس رکھنا اور پھر اُس کے بستر کی سلوٹیں نکال کر اپنے گھر کو لوٹ آنا کبھی ناغہ نہ ہوتا تھا + گاؤں کے سادہ دل کسان یہ سب کچھ دیکھتے اور صرف اتنا کہہ کر خاموش ہو رہتے۔ "رادھا کو سادھو کی اشیرباد ملی ہے" +

رتو اب بوڑھا ہو چکا تھا۔ کھیتی باڑی کا کام ایک ساجھی کے سپرد کر رکھا تھا۔ ایک دن اپنے گھر کے دالان میں بیٹھا ناریل کے دَم

لگا رہا تھا۔ کہ ایک پڑوسی پاس آ بیٹھا۔ اور باتوں باتوں میں بولا۔ "چودھری چھوکری جوان ہو گئی ہے۔ جوان بیٹی باپ کے گھر بیٹھی بھلی معلوم نہیں ہوتی۔ زندگی کا کیا بھروسا ہے۔ اب اسے کہیں ٹھکانے ہی لگا دو۔ ہونا تو وہی ہے۔ جو رام کرے"۔ رتو نے ناریل کے لمبے لمبے گھونٹ لگا کر کھانستے ہوئے جواب دیا۔ بھائی ٹھیک کہتے ہو۔ رام اچھا ہی کرینگے۔ رادھا کی ماں تمہیں معلوم ہی ہے کتنی نیک تھی۔ رادھا بھی مجھے اس دُنیا کی چھوکری معلوم نہیں ہوتی۔ آگے جو بھگوان کی مرضی۔ بھائی اس دھرتی پر سیوا ہی میں بھلا ہے" +

رام پیارے کو اب اس قدر مشق ہو چکی تھی۔ کہ اگرچہ بارہ دری کے آس پاس سے کوئی نہ کوئی گزرتا ہی رہتا تھا۔ لیکن وہ رادھا کے پاؤں کی چاپ فوراً پہچان لیتا۔ جب تک رادھا اُس کے پاس بیٹھی رہتی۔ وہ بہت خوش رہتا۔ لیکن اُس کے جاتے ہی مصیبت اُس کی جان کی لاگو ہو جاتی۔ وہ کبھی کبھی دل میں سوچتا۔ اب رادھا کیسی ہو گی؟ کئی بار اُس نے یہ سوال رادھا سے پوچھنا چاہا۔ لیکن شرم نے کچھ پوچھنے نہ دیا +

ایک دن وہ اُسی خیال میں بیٹھا تھا۔ کہ رادھا کے قدموں کی آہٹ پا کر بول اُٹھا "تم آگئیں رادھا" +

"ہاں۔ رام پیارے کہو کچھ کام ہے"؟

"نہیں نہیں کام تو کچھ نہیں۔ آؤ بیٹھو" +

رادھا بیٹھ گئی اور بولی۔ "رام پیارے شاید میرے دیر میں آنے سے تم کو تکلیف ہوتی ہے۔ کیا کروں گھر کا دھندا پیچھا نہیں چھوڑتا" +

رام پیارے نے جواب دیا۔ "رادھا تم میرے لئے بڑی کٹھن اُٹھاتی ہو۔ تم مجھے شوجی کے مندر میں کیوں نہیں چھوڑ دیتیں۔ میں لوگوں کے ٹکڑوں سے پیٹ پال لیا کروں گا" +

رادھا نے تعجب سے اُس کی طرف دیکھا۔ اور بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ "رام پیارے ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ تم ہمارے گھر کیوں نہیں اُٹھ چلتے"؟

رام پیارے نے کہا۔ "نہیں نہیں اچھا تو مجھے روٹی گوالے کے ہاتھ بھیج دیا کرو" +

رادھا نے جواب دیا۔ "آج معلوم ہوتا ہے۔ کہ تم مجھ سے ناراض ہو گئے ہو" +

رام پیارے بولا۔ "نہیں ناراض نہیں رادھا۔ میں دُکھی ہوں" +

رادھا نے کہا۔ "ناراض نہیں تو ایسی باتیں

کیوں کرتے ہو"؟

رام پیارے شاید کسی سوچ میں چلا گیا تھا۔ اس نے یکایک کہا: "ایک بات پوچھوں رادھا۔ تم برا تو نہ مانوگی۔ میں کئی روز سے کچھ پوچھنا چاہتا تھا"۔

رادھا نے نہایت سادگی سے رام پیارے کی انگلی پکڑلی۔ اور اُسے ہلا ہلا کر کہا "پھر پوچھتے کیوں نہیں"؟

"پوچھوں رادھا۔ اچھا بتلاؤ۔ پھر تھوڑی دیر ٹھہر کر اور ہنس کر بولا۔ اچھا بتاؤ تمہارا قد کیسا ہے"؟

رادھا کے چہرے پر شرم کی سرخی چھا گئی۔ مگر اُس نے سادگی سے جواب دیا "میرا قد؟ رام پیارے تمہیں شیوجی کے مندر والے وہ بوٹے یاد ہیں"؟

"ہاں یاد ہیں۔ یاد ہیں ٹھیک۔ اور پوچھوں رادھا۔ نابینا نے ہنستے ہوئے کہا: "اور تمہاری آنکھیں"؟

رادھا بھی ہنستی ہوئی بولی: "میری آنکھیں۔ شوجی کے پجاری کی وہ ہرنی یاد ہے؟ رام پیارے وہی جسے ہم ہر روز ہری ہری گھاس کھلایا کرتے تھے"۔

رام پیارے ہنسنے لگا۔ اور ایک دو بار سر ہلا کر بولا "سمجھ گیا۔ سمجھ گیا۔ اور تمہارا چہرہ"؟ یہ کہہ کر نابینا کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

رادھا بڑے غور سے نابینا کی طرف دیکھ رہی تھی اس نے بھی ایک قہقہہ لگایا۔ پھر وہ دونوں ہاتھ اُس کے شانوں پر رکھ کر بولی۔

"بتلاؤں رام پیارے! اس چاند کی طرح۔ جس کی چاندنی میں ہم دونوں کھیلا کرتے تھے"۔

یہ کہہ کر رادھا خود بخود شرما گئی۔ سر نیچے جھک گیا۔ اندھے نے ایک ٹھنڈا سانس بھرا۔ اس پُرلطف گفتگو کے بعد جس میں ایک نابینا نوجوان کی تمناؤں کا رنگ بھرا تھا۔ دونوں خاموش ہوگئے۔

"میں جاتی ہوں رام"۔

"ایک بات اور پوچھوں رادھا......

وہ سرخ دانوں کی کنٹھی؟ وہی جو تم ہر وقت گلے میں پہنے رہتی تھیں"۔

"یہ ہے میرے گلے میں۔ کیوں"؟

"رادھا یہ کنٹھی مجھے دے دو۔ میں اکیلا بیٹھا گھبراتا ہوں۔ اسی سے بیٹھا دل بہلایا کروں گا"۔

"کنٹھی سے دل بہلایا کروگے"؟

رادھا اب شرما گئی۔ اُس نے گلے سے کنٹھی اُتار دی۔ اور نابینا کے ہاتھ میں دے کر

پانی کا گھڑا بھرنے کے بہانے جلد جلد کوئیں کی طرف چلی گئی +

رام پیارے کنٹھی لے کر مسکرایا۔ اور خود بخود بولا :۔

"بوٹا سا قد۔ ہرن کی سی آنکھیں۔ چاند سا چہرہ۔ اور یہ کنٹھی !"

"جب تم چلی جاؤگی رادھا۔ تو شیوجی کے مندر کے سامنے والے بوٹوں کی یاد۔ پجاری کی ہرنی کی آنکھوں کا تصور اور چاند کا خیال۔ پھر یہ کنٹھی میری تنہائی کی ساتھی ہوگی۔ اور میں سمجھوں گا۔ رادھا مجھ سے دُور نہیں" +

"رام پیارے" کی زندگی۔ اُس کا سُکھ۔ اُس کی خوشی جو کچھ بھی تھی "رادھا" تھی۔ وہ ہر وقت "رادھا" کی کنٹھی کے دانوں کو شمار کیا کرتا اور ہر دانے کے ساتھ اس کے مُنہ سے "رادھا" کی آواز نکلتی۔ وہ اس خیال سے بہت خوش ہوتا کہ سرو قد۔ آہو چشم اور چاند ایسی خوبصورت "رادھا" اس کی غمگسار رہے۔ وہ آنکھوں سے محروم تھا۔ لیکن اس کا دل اس دہقان دوشیزہ کی اُلفت سے بسا ہوا تھا۔ "رام پیارے" "رادھا" کی کنٹھی گلے میں ڈالے "رادھا" کے بچھائے ہوئے بستر پر "رادھا" کی یاد میں سو جاتا۔ وہ "رادھا" کا نام لیتا ہوا جاگتا۔ اور "رادھا" کے انتظار میں راہ کی طرف کان لگائے "رادھا" کے آنے کی گھڑیاں گنا کرتا +

اور رادھا اپنے گھر اُٹھتی بیٹھتی۔ سوتی جاگتی "رام پیارے" کے خیال سے باتیں کیا کرتی + گاؤں کے بوڑھے بوڑھے لوگ اب بھی جو کبھی "رادھا" کا ذکر آتا۔ تو یہی کہہ دیتے :۔

"رادھا کو سادھو کی اشیرباد ملی ہے"

ایک روز "رام پیارے" اپنے خیالات میں اس قدر محو تھا۔ کہ اُسے "رادھا" کے آنے کی جو محض دل لگی کے لئے نہایت دبے پاؤں چپ چاپ اس کے پاس آ بیٹھی تھی خبر تک نہ ہوئی۔ نابینا اس وقت اپنی قسمت کا گلہ کر رہا تھا :۔

"ہے! .... ایشور! مجھے آنکھوں سے کیوں محروم کر دیا...... میرے من کے باغ میں ایک سُندر پھول کھِلا۔ وہی پھول میرے اُجڑے ہوئے دل کی رونق ہے۔ اس پھول کی باس سے میری آتما مہک رہی ہے۔ لیکن ہے پرمیشور افسوس میں اُس کے دیکھنے سے محروم ہوں ...... پرماتما! پرماتما +

راوھا زمیندار کی بیٹی۔گھرانے والی۔
گُنبے والی۔اور مَیں کون ؟ ایک
دُکھیا۔اندھا۔اپاہج۔اے دھرتی
کے مالک! اے بے آسروں کے
آسرے! اندھے بھکاری کی فریاد سُن۔
مجھ قسمت کے مارے کو اُس نگری میں
پُہنچا دے۔ایسی نگری میں پُہنچا دے
جہاں وسواس۔چِنتا۔اور خوف کا گزر
نہ ہو" +

"رام پیارے" نے اپنی انتہائی بیکسی کو محسوس
کرتے ہوئے زور سے سینے پر ہاتھ مارا +

"ایسا مت کرو" رادھا نے اس کا ہاتھ
پکڑ لیا۔اور بول اُٹھی "کیا کرتے ہو" +

"تم آگئیں رادھا ؟ تم کب آئیں ؟"

"دکھیا رے! میں توکب سے تمہارے
پاس بیٹھی ہوں .. تم اتنی چِنتا کیوں کرتے ہو۔
بھگوان کرپا کرینگے .... ٹھیک ہے۔رادھا زمیندا
کی بیٹی۔گھرانے والی۔گُنبے والی۔سبھی کچھ۔لیکن
رام پیارے ....

"رادھا تمہارے چرنوں کو نہ چھوڑے گی۔
رام جی.....رادھا کی دُنیا۔رادھا کی زندگی۔
اور رادھا کا سُکھ.....صرف تم ہو۔رام پیارے
رادھا اپنے رام سے جُدا نہیں ہو سکتی" +

نابینا نے یہ محبّت بھرے الفاظ سُن کر سر
جُھکا دیا۔اور رادھا اپنے نازک نازک ہاتھوں
سے اس کے بال سنوارنے لگی +

ساون کا موسم تھا۔بارشیں کثرت سے
ہو رہی تھیں۔تیز ہوائیں چلتی تھیں۔بادل گرجتے
تھے۔اور بجلیاں کوندتی تھیں۔ہر طرف پانی
ہی پانی نظر آتا تھا۔لیکن یہ چیزیں "رادھا" کو
رام پیارے کے پاس دن میں دو تین بار
جانے سے روک نہ سکتی تھیں۔گاؤں میں چرچا
تھا۔گنگا کناروں سے باہر بہہ رہی ہے۔اور
سیلاب کا رُخ گاؤں کی طرف ہو رہا ہے۔رادھا
خود دریا کی جانب گئی۔گنگا کی تلاطم خیز لہروں
کو دیکھ کر اس کا دل سہم گیا۔واپس آکر رام پیارے
کو خطرے سے آگاہ کیا۔اور اپنے گھر لے چلنے
کو کہا۔لیکن رام پیارے اس خیال سے۔کہ
بارہ دری سطح زمین سے کچھ اونچی ہے اور پانی
کے اوپر تک چڑھ آنے کا احتمال نہیں۔گاؤں
جانے پر رضامند نہ ہوا۔لیکن اگلے روز بارہ دری
کے چاروں طرف پانی ہی پانی نظر آنے لگا۔جو
لحظہ بہ لحظہ بڑھتا جاتا تھا۔رادھا جب تیسری بار
شام کے وقت اس کا کھانا لے کر آئی۔تو اس نے
بڑی منت اور محبت سے گھر اُٹھ چلنے کے لئے

اصرار کیا۔ آخر کچھ پس و پیش کے بعد اُس نے
کل صبح رادھا کے ہمراہ گاؤں چلنے کا وعدہ
کیا۔ رادھا رام پیارے کے پاس بہت دیر تک
بیٹھی اپنی پیاری پیاری باتوں سے اس کا دل
بہلاتی رہی۔ جب وہ گھر کو لوٹی تو فضا بالکل تاریک
تھی بجلی کالے کالے بادلوں میں سے نکل نکل کر
چشمک زنی کر رہی تھی۔ کالی گھٹائیں تُلی کھڑی
تھیں۔ لیکن بوندا باندی بند تھی +

رادھا نے سونے سے پیشتر کوٹھڑی سے
نکل کر آسمان کی طرف دیکھا۔ اور پھر پلنگڑی پر جا کر
پڑ رہی + آدھی رات گزر چکی تھی۔ کہ دریا کی طغیانی
نے وہ زور پکڑا کہ گاؤں کی حالت خطرناک ہوگئی۔
جا بجا مکانات گر رہے تھے۔ لوگوں کا شور و غل
بچوں کی چیخ پکار۔ ہر طرف سے سُنائی دے
رہی تھی۔ بھلا ایسی حالت میں رادھا کو نیند کہاں
باہر نکل کر جو دیکھا تو بارش ہو رہی تھی۔ بجلی کی
چمک بادل کی گرج دل ہلا دیتی تھی۔ لیکن رادھا
"دل ہے پرائے بس میں" کہتی ہوئی چپ چاپ
گھر سے نکلی۔ دو چار قدم جاتے جاتے کپڑے
بالکل بھیگ گئے + گلی کوچوں میں پانی گھٹنوں کے
برابر چل رہا تھا۔ گاؤں سے باہر نکلی تو پانی اور
بھی زیادہ گہرا ملا۔ اندھیرے میں گرتی پھسلتی
برابر آگے بڑھی جا رہی تھی۔ اتنے میں بجلی اس
زور سے کوندی کہ آنکھیں چکا چوند ہوگئیں۔
رادھا نے چلّا کر آواز دی" رام پیارے"
لیکن اس محبّت بھری آواز کا جواب بادل
کی ایک خوفناک گرج نے دے دیا۔ رادھا
اب پانی کی تیز رَو پر مچھلی کی طرح تیر رہی تھی۔
رات کی تاریکی۔ شدّت کی بارش۔ اور پانی کی
کثرت کے باعث اُسے کچھ معلوم نہ تھا کہ وہ
کدھر جا رہی ہے۔ اس نے پھر ایک بار پوری
قوّت سے پانی کی سطح پر اُبھر کر آواز دی"رام
پیارے" لیکن اس بار بھی بادل کی ایک
مہیب گرج جواب میں سُنائی دی۔ رادھا
متلاطم خیز گنگا کا کب تک مقابلہ کرتی۔ اس کی طاقت
سلب ہو رہی تھی۔ اور وہ بار بار "رام پیارے"
کو پکارتی تھی۔ آخر اسی پیارے نام کا جپ
کرتی ہوئی وہ پانی کی تیز رَو کے ساتھ بہہ گئی +

کچھ روز بعد طغیانی کم ہوئی اور پانی اُتر گیا۔
جہاں گاؤں آباد تھا وہاں چند ٹوٹے پھوٹے
کھنڈر نظر آتے تھے۔ مندر کا پتہ تھا نہ بارہ دری
کا نشان۔ گاؤں والوں میں سے اکثر لقمۂ نہنگِ
اجل ہوگئے۔ جو بچے وہ ایک ٹیلے پر پناہ گزیں
تھے۔ جب چلنے پھرنے کے لئے راستہ نکلا۔
تو ایک روز کسی گوالے کو اتفاقاً درختوں کے ایک

جھنڈ میں جو تباہ شدہ گاؤں سے چار پانچ میل کے فاصلے پر تھا۔ بڑی بڑی جھاڑیوں کے بیچ دو لاشیں ریت اور کیچڑ میں دبی ہوئی ملیں۔ یہ دونوں لاشیں پاس پاس پڑی تھیں۔ گاؤں والے یہ خبر پاکر وہاں پہنچے۔ تو انھوں نے لاشوں کو باہر نکالا۔ ان میں سے ایک "رادھا" تھی۔ اور دوسرا "رام پیارے"۔ رام پیارے کے ہاتھ میں اب تک "رادھا کی کنٹھی" تھی۔ لوگوں نے ان دونوں کو ایک رسّی سے اکٹھا باندھ کر گنگا کے آغوش میں ڈال دیا۔

(طبعزاد)

"سکوت"
حضرتِ چغتائی کا ایک منظر

مغربی اور مشرقی مصوری میں باعتبارِ فن سب سے بڑا فرق Perspective یا علم المرایا کا ہے۔ مشرقی مصور تیسری جہت کو ناظر کے تخیل پر چھوڑ دیتا ہے۔ اور مغربی تمام جزئیات اکتا دینے والی تفصیل کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مغربی ستہ جہت تصویر کو بس ایک نظر دیکھ لینا کافی ہوتا ہے۔ اور مشرقی دو جہت تصاویر کو جب دیکھو ایک نیا عالم نظر آتا ہے۔

ہندوستانی اور ایرانی مصوری میں مناظر کی تصاویر بہت تھوڑی ہیں۔ ہاں چین اور جاپان کے بعض عہدِ مصوری ایسے نمونوں سے مالا مال ہیں۔ اس کمی کی وجہ غالباً یہی ہے۔ کہ تیسری جہت یا فاصلہ نیچر سے کچھ اس طرح وابستہ ہے۔ کہ مناظر کی سی خارجی شے میں اس کا نہ ہونا کچھ ناگوار سا ہو جاتا ہے۔

حضرتِ چغتائی کی یہ تصویر ہر چند کہ اُن کے فن کا کوئی ایسا امتیازی کارنامہ نہیں مگر مصوری کے اس دورِ احیا میں بوجہ ندرت بہت بڑا اہمیت ہے۔ مصور نے مینار کی طرح استوار درخت کو جو فضائے اعلیٰ کی لامتناہی بلندیوں میں گم ہو جاتا ہے۔ ایک ہرنوں کے جوڑے کے ساتھ پیوست کر دیا ہے۔ اور اس طرح ان سیماب فطرت صحرائیوں کو بالدوام سکوت آشنا کر دیا ہے۔ ہرنوں کا جوڑا یوں محوِ راز و نیاز ہے کہ گویا صیاد ایک نقطِ بے معنی ہے۔ اور درخت نشز و نما سنبھالے سپاہی کی طرح پہرہ دے رہا ہے۔ یہ ہے کمالِ فن کہ مصور نے نیچر کی ہر طاقت کو اپنی جذباتی فضا میں غرق کر دیا ہے۔ اور تمام منظر پر سکوت کا رنگ چھا گیا ہے۔ تاثیر ایم اے

پنجاب

حقوق بحق دارالاشاعت پنجاب محفوظ

ابوالاثر حفیظ جالندھری

وہ بلندی جس پہ ہیں نورانیوں کی بستیاں
برف کی آبادیاں برفانیوں کی بستیاں۔
نغمے سوتے ہیں جہاں خاموشیوں کے ساز میں
محو تھا میں بھی وہیں اک روز خواب ناز میں
دفعتاً ٹوٹا مرے مجبور خوابوں کا طلسم
بن گئی ہستی مری یکسر ربابوں کا طلسم
گرمی رفتار نے چھیڑا۔ مجھے مضراب سے
گونج اٹھے کہسار میرے نغمۂ بیتاب سے
میں اُتر آیا فرازِ کوہ سے گاتا ہوا۔
اپنی متوالی روش میں ٹھوکریں کھاتا ہوا۔
پاسبانوں نے بہت گھیرا مجھے۔ روکا مجھے
یعنی ہیبتناک دیووں نے عبث ٹوکا مجھے
کچھ نہ بن آیا میری سعیِ عمل کا سامنے
میری رَو میں بہ گئے جو آئے تجھ کو تھامنے
ابر نے آنسو بہا کر مجھکو رُخصت کر دیا!
اور اپنے موتیوں سے میرا دامن بھر دیا
دولت کہسار لے کر دامنِ سیلاب میں
آخرکار آ بسا میں خطۂ پنجاب میں
مدتیں گذری ہیں اس فردوس میں بہتا ہوں میں
یہ پریزادوں کی وادی ہے یہاں بہتا ہوں میں
اس زمیں پر چاہنے والے مرے آباد ہیں۔
شاد ہیں دونوں کنارے ہر طرح سے شاد ہیں

ان کے دل روشن ہیں سچی دوستی کی آگ سے
ان کے گیتوں کی صدا ملتی ہے میرے راگ سے
میرا افسانہ بندھا ہے ان کے افسانوں کے ساتھ
جسطرح سے شمع وابستہ ہے پروانوں کے ساتھ!
حسن وصورت۔ عشق والفت کا نہیں کال اس جگہ
ہر طرف آباد ہیں سوہنی مہینوال اس جگہ
تیرتے ہیں میری موجوں پر کئی کچے گھڑے
روز دکھلاتے ہیں۔ اک الفت نئی پکے گھڑے
یہ ہوا لہروں سے جو محو شکست و بست ہے
ہر نئے رانجھے کی میٹھی بانسری سے مست ہے
ہر دوشیزہ دیکھتی ہے مجھ میں نقشہ ہیر کا۔
بن گیا ہوں آئینہ میں ہیر کی تصویر کا
گھیرتی ہیں مجھ کو ان سادہ دلوں کی ٹولیاں
بھولی بھولی صورتیں ہیں میٹھی میٹھی بولیاں
اپنے بچوں کی طرح سے پالتا ہوں میں انہیں
جو طلب کرتے ہیں یہ دے ڈالتا ہوں میں انہیں
میرے بچوں کی طرح آتے ہیں میری گود میں
کھیلتے ہیں اور سو جاتے ہیں میری گود میں
ان کو طوفانِ حوادث سے بچا لیتا ہوں میں
اپنے دامانِ محبت میں چھپا لیتا ہوں میں
مختصر یہ کہ الفت ہے مجھے پنجاب سے
خوش ہوں میں پنجابیوں کی سوزشِ بیتاب سے

گوکل کی شام

(از پنڈت ہری چند صاحب اختر بی۔ اے)

یہ نظم اس سے پیشتر تہذیب نسواں میں درج ہو کر کئی رسائل و اخبارات میں نقل کیجا چکی ہے۔ لیکن مخزن میں درج کرنا ضروری سمجھا گیا ہے۔ کیونکہ دوسرے صفحے پر اس نظم کی ایک پُر لطف پیروڈی ناظرین کی ضیافت طبع کے لئے پیش کی جا رہی ہے۔

ایڈیٹر

گوکل کے جھونپڑے ہیں۔ جمنا کا ہے کنارا ۔۔۔ اے دیدۂ تصور کر لے پھر اک نظارا۔
مغرب میں رفتہ رفتہ اک شام بن رہی ہے ۔۔۔ پریوں کی سبز وادی گلفام بن رہی ہے
سیندور مل لیا ہے خورشید نے جبیں پر ۔۔۔ جمنا نے اوڑھ لی ہے اک سُرخ زرد چادر
پچھم سے آ رہی ہیں مستی بھری ہوائیں ۔۔۔ پورب پہ چھا رہی ہیں۔ نیلو فری گھٹائیں
سبزہ لہک رہا ہے۔ کلیاں چٹک رہی ہیں ۔۔۔ گوکل کی چھوٹی چھوٹی گلیاں مہک رہی ہیں
کھیتوں سے آ رہی ہیں کچھ رس بھری صدائیں ۔۔۔ اک کیفِ سرمدی سے معمور ہیں فضائیں۔
چھوٹا سا ایک لڑکا بنسی بجا رہا ہے ۔۔۔ اُلفت کے بھولے بسرے نغمے سُنا رہا ہے
پیغامبر گُلوں کے مے میں بسے ہوئے ہیں ۔۔۔ یعنی ہوا کے جھونکے لے میں بسے ہوئے ہیں
کچے گھروں کے باہر کچھ گوپیاں کھڑی ہیں ۔۔۔ اک دو یہاں کھڑی ہیں۔ اک دو وہاں کھڑی ہیں
یہ بھولی بھولی شکلیں۔ یہ منتظر نگاہیں ۔۔۔ یہ گرم گرم آنسو۔ یہ سرد سرد آہیں۔
کیوں ہُوک اُٹھ رہی ہے۔ آرام کیوں نہیں ہے؟ ۔۔۔ شام آ گئی ہے۔ لیکن گھنشام کیوں نہیں ہے

اے بیوقوف اختر دکھڑے ہیں یہ پُرانے۔
یہ بھید کون سمجھے۔ یہ راز کون جانے؟

ڈیک پر ایک صبح

(از جناب جگل کشور بدر)

ڈیک لاہور سے گیارہ میل کے فاصلے پر ایک ندی ہے۔ جہاں چند بے تکلف دوست مثلاً جناب سالک۔ جناب تاجؔ جناب بدرؔ اور خاکسار راقم الحروف مچھلی کا شکار کھیلنے جایا کرتے تھے۔ تو قریب ہی کالا شاہ کاکو ایک گاؤں ہے جو ریلوے سٹیشن بھی ہے۔ اُن دنوں لاہور میں اختر صاحب کی نظم "گوکل کی شام" زبان زد خاص و عام تھی۔ ڈیک کے ادیب شکاری بھی اُٹھتے بیٹھتے اسی کا ورد کیا کرتے تھے۔ ایک دن جناب بدرؔ اس نظم کی ساحرانہ گلوگیری سے ستیا کر ندی کے کنارے ہری ہری گھاس پر لیٹ گئے۔ اور چند منٹ کی "شکار خراش" موسیقی کے بعد یہ نظم کہہ ڈالی یہ ہے اس نظم کی پر لطف شانِ نزول۔

ایڈیٹر

ہیں پیڑ کیکروں کے اور ڈیک کا کنارا
او مچھلیوں کے رسیا کر لے پھر اک نظارا
مشرق کے آسماں پر جھاڑو سی پھر رہی ہے
چھڑکاؤ بھی ہوا ہے۔ شبنم جو گر رہی ہے
خورشید نے اُفق کے گھونگٹ سے سر نکالا
اور ڈیک نے بھی شب کا چولا اُتار ڈالا۔
پانی نہیں ہے۔ اس میں نیلم پگھل گیا ہے
گھنشام یا نہا کر باہر نکل گیا ہے۔
مرغابیوں کے ٹولے ہر سمت اُڑ رہے ہیں
دکھن سے آ رہے ہیں پچھم کو مڑ رہے ہیں
کلیاں چٹک رہی ہیں۔ سبزہ لہک رہا ہے
اور کالا شاہ کاکو سارا مہک رہا ہے۔
پُل پر سے ریل چھک چھک کر کے گذر رہی ہے
روشن فضا دھوئیں سے تاریک کر رہی ہے
اِک سنگدل شکاری بنسی لگا رہا ہے
پھیلا کے دامِ اُلفت مچھلی پھنسا رہا ہے
سرکنڈے نسبول کے رہ رہ کے ہل رہے ہیں
گویا یہ مچھلیوں کے پیغام مل رہے ہیں!
ریتی پہ زخم خوردہ کچھ مچھلیاں پڑی ہیں
اک دو یہاں پڑی ہیں۔ اِک دو وہاں پڑی ہیں
سیماب وار ان کا رہ رہ کے تلملانا۔
پانی کی سمت اُچھلنا اور پیچ و تاب کھانا
اِک روگ یہ لگا ہے۔ جس کی دوا نہیں ہے
منہ تو کھلا ہوا ہے۔ پر کیچوا نہیں ہے
بیہودہ بدرؔ بس کر جھگڑے ہیں یہ پرانے
مچھلی کی بیکسی کو مچھلی ہی خوب جانے

تازہ غزلیں

مرزا یاس یگانہ لکھنوی

دستِ دعا سے اُٹھا پردہ جو درمیان تھا — اُٹھتی ہے آنکھ کیونکر اب تک بھی دیکھتا ہے
آغوش میں اب اُن کو کیا کھینچتی ہے دُنیا — بیگانگی نے جن کو اپنا بنا لیا ہے
منزل کی فکر کیوں ہو جب تو ہوا و ریں ہوں — پیچھے نہ پھر کے دیکھوں کعبہ بھی ہو تو کیا ہے
غواص رمزِ فطرت ساحل کے پاس پہلے — غوطے لگا رہا تھا اب غوطے کھا رہا ہے

جناب محمد دین تاثیر ایم اے

بیٹھا ہوں میں فریبِ تمنا لئے ہوئے — دُنیا میں ایک اور ہی دُنیا لئے ہوئے
موسیٰ چلا ہے لرزہ بر اندام سوئے طور — ہر موئے تن میں ذوقِ تماشا لئے ہوئے
محرابِ میکدہ میں ہے ساقی جھکا ہوا — ساغر بدست دوش پہ مینا لئے ہوئے
بیٹھا تو ایک فتنۂ دوراں بغل میں ہے — اُٹھا تو ایک حشرِ تماشا لئے ہوئے
ق
پروانہ جل کے دل کی مرادوں کو پا گیا۔ — اور شمع رہ گئی رخِ زیبا لئے ہوئے
آئے بھی وہ چلے بھی گئے بزمِ ناز سے — بیٹھا رہا میں دل میں تمنا لئے ہوئے
جلنا تھا طور جل گیا موسیٰ کا کیا گیا۔ — حضرت تو آگئے یدِ بیضا لئے ہوئے

تاثیر میرے نام کا اقبال دیکھنا۔
اقبال بھی ہے میری تمنا لئے ہوئے[1]

---

[1] علامہ اقبال کے دو اشعار سے تلمیح ہے ؎

اقبال میرے نام کی تاثیر دیکھنا — میں جس کے ساتھ ہوں اُسے ممکن نہیں شکست
میں بلبلِ نالاں ہوں اِس اجڑے گلستاں کا — تاثیر کا سائل ہوں محتاج کو داتا دے

سید ذوالفقار علی صاحب (ممبر بورڈ آف ایگزیمنرز دہلی)

تقدیر میں ہے گردش تقدیر دیکھنا
پھر ہو گیا ہوں مائل تدبیر دیکھنا!

سمجھے ہو تم شباب کو اک خواب دلفریب
اس خواب دلفریب کی تعبیر دیکھنا!

ظالم تیری نگہ کا ہدف غیر کیوں بنے
بیکار چھوڑنا نہ کوئی تیر دیکھنا!

لب بند ہیں جبیں پہ شکن رنگ اڑا ہوا
کھینچی ہے میں نے درد کی تصویر دیکھنا

عنوان "عشق" تحت میں "ناکام" اور بس
یارو میرا نوشتۂ تقدیر دیکھنا

کچھ بجلیاں سی کوند رہی ہیں گھٹاؤ نہیں
پیدا ہوئی ہے آہ میں تاثیر دیکھنا

وہ ہیں۔ کہ خواب ناز ہے۔ میں ہوں کہ بار بار
اٹھ اٹھ کے جانب فلک پیر دیکھنا

مولانا توحید ہوشیارپوری

ہمارے دل کا آخر شیخ کوئی رازداں کیوں ہو
کسی کا سر کسی کا در تمہیں آزار جاں کیوں ہو

وہ ہرجائی کہاں قید تعین کا کہاں جھگڑا
ہر اک ذرے میں کعبہ ہے یہاں کیوں ہو وہاں کیوں ہو

کوئی انصاف ہے دیکھو ہمیں اور ہم کو ترساؤ
یہی ہے شوق نظارہ تو آخر پھر نہاں کیوں ہو

نہیں جاتے نہیں پڑھتے نمازیں جا کے مسجد میں
میرا دل گر نہیں اینٹوں کا گھر ان کا مکاں کیوں ہو

انا الحق حق نہ تھا ناحق سہی منصور جھوٹا تھا
نفخت فیہ من روحی کا قرآں میں بیاں کیوں ہو

سڑی سودا زدہ ننگ خلائق بیخبر بے خود
میاں توحید کے افکار کا پھر امتحاں کیوں ہو

ملک عبدالحمید صاحب حمید

دل آزادگاں زنجیری عشق بتاں کیوں ہو
گرفتار طلسم حیرت آباد جہاں کیوں ہو

جلا کر خاک کر دے اس کو بھی اے برق ناکامی
رہا جب میں نہ گلشن میں تو میرا آشیاں کیوں ہو

امیدیں مٹ چکیں ساری مدد اے مرگ مایوسی
چمن ہی جب ہوا ویراں تو اسکا باغباں کیوں ہو

بہار دیدۂ خونبار جب تک لالہ افشاں ہے
ہمارا گلشن امید تاراج خزاں کیوں ہو

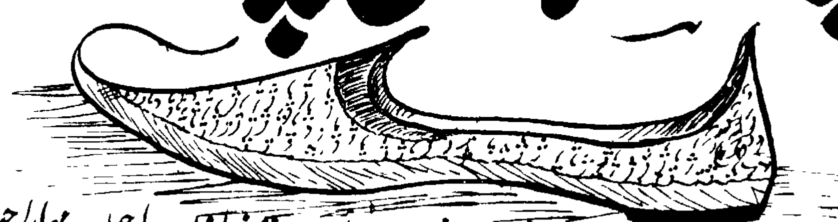
میرے رونے کا باعث کچھ بھی ہو جائے اجی جاؤ
جو ہو نا آشنائے عشق میرا رازداں کیوں ہو

حمید اسرار حسن و عشق سے دنیا ہے نامحرم
کسی کے سامنے افسانۂ فرقت بیاں کیوں ہو

عید کے لئے بہترین تحفہ

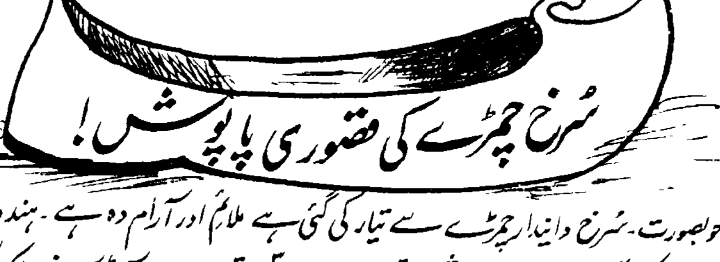
ایم-اے-بوٹ شاپ سوہا بازار لاہور کی تیار کردہ!

پوٹھوہاری پاپوش!



یہ ایک نہایت ہی خوبصورت - اور بےنظیر پاپوش ہے - نوابوں - رئیسوں - زمینداروں - راجوں - مہاراجوں کی زینتِ لباس - قابلِ دید - آپ نے ایسی عمدہ پاپوش ملاحظہ نہ کی ہوگی قیمت عہ روپیہ سے لیکر ۵ روپیہ تک

شہر لاہور کا لاثانی تحفہ!



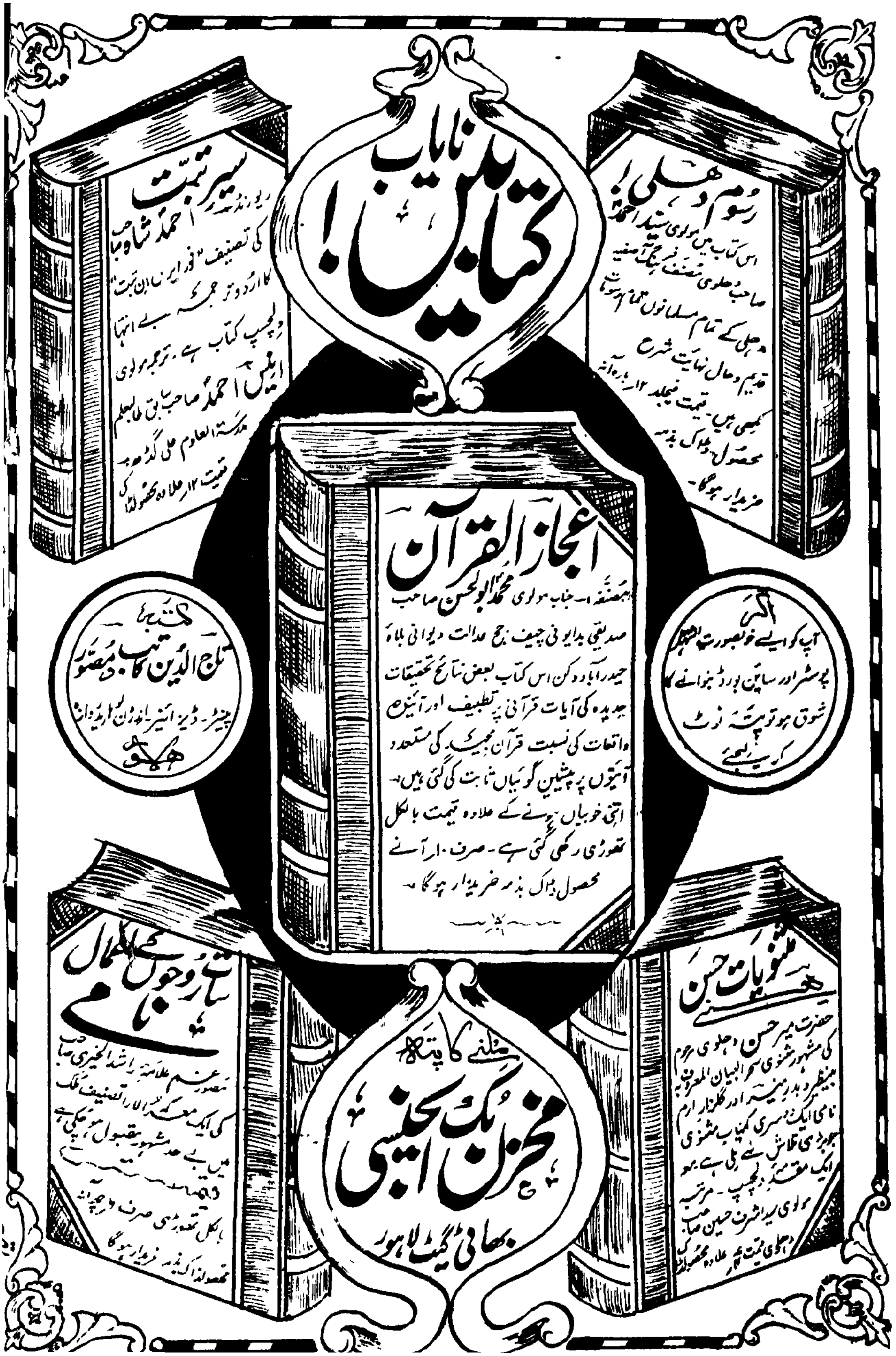
نہایت ہی خوبصورت - سُرخ دانیدار چمڑے سے تیار کی گئی ہے ملائم اور آرام دہ ہے - ہندوستان کی تمام پاپوشوں سے اعلیٰ - وزن میں ہلکی - مگر مضبوطی میں بے مثل - قیمت صرف تین روپے آٹھ آنے ایک کارڈ ارسال کر کے مکمل فہرست مع جنتری ۱۹۲۷ء و کیلنڈر ۱۹۲۷ء مفت منگوائیں - نوٹ :- پاؤں کا ماپ کاغذ پر خاکہ بنا کر ارسال کریں -

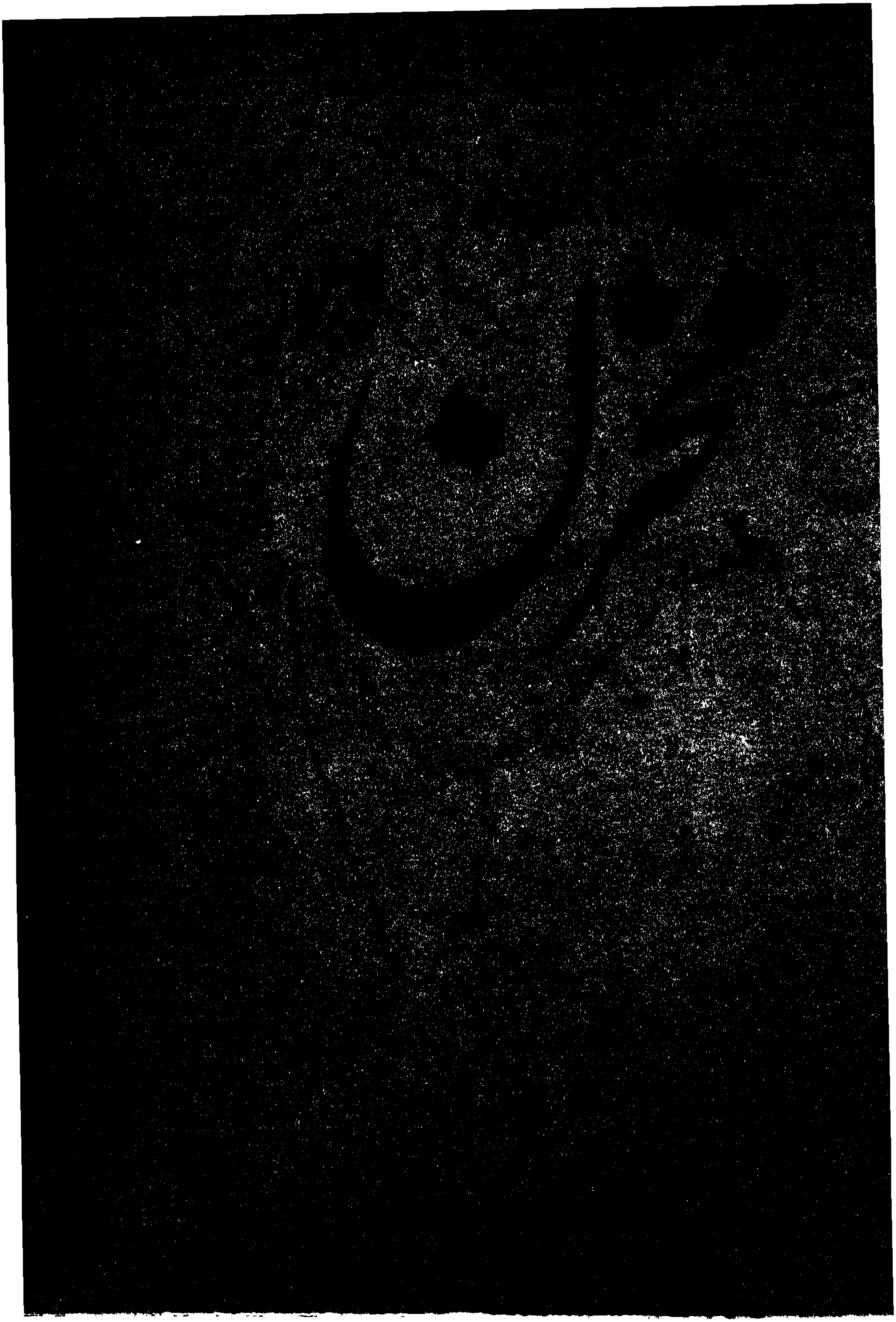
ملنے کا پتہ

ایم-اے-بوٹ شاپ سوہا بازار لاہور

کتابت تاج الدین کاتب مصور - ڈیزائنر پینٹر اندرون لوہاری دروازہ لاہور

آپکو اگر ایسے خوبصورت پوسٹر اشتہار ڈیزائن بنوانیکا شوق ہے - تو پتہ نوٹ کر لیجئے


نایاب کتابیں!
سیر تبت
ریورنڈ احمد شاہ صاحب
کی تصنیف "ٹور اِن تبت"
کا اردو ترجمہ ہے۔ بے انتہا
دلچسپ کتاب ہے۔ ترجمہ مولوی
ایس احمد صاحب
مدرسۃ العلوم علی گڑھ
قیمت ۱۲ علاوہ محصولڈاک
رسوم دہلی
اس کتاب میں مولوی سید احمد
دہلوی مصنف فرہنگ آصفیہ
صاحب نے تمام رسومات
دہلی کے تمام مسلمانوں
قدیم و حال نہایت شرح
لکھی ہیں۔ قیمت مجلد ۱۲ بارہ آنہ
محصول ڈاک بذمہ
خریدار ہوگا۔
اعجاز القرآن
مصنفہ:- جناب مولوی محمد ابو الحسن صاحب
صدیقی بدایونی چیف جج عدالت دیوانی بلدہ
حیدرآباد دکن اس کتاب بعض نتائج تحقیقات
جدیدہ کی آیات قرآنی پر تطبیق اور آئندہ
واقعات کی نسبت قرآن مجید کی متعدد
آیتوں پر پیشین گوئیاں ثابت کی گئی ہیں۔
اتنی خوبیاں ہونے کے علاوہ قیمت بالکل
تھوڑی رکھی گئی ہے۔ صرف ۱۰ آنے
محصول ڈاک بذمہ خریدار ہوگا۔
کتبہ
تاج الدین کاتب مصور
پینٹر۔ ڈیزائنر۔ اندرون اکبری دروازہ
لاہور
اگر
آپ کو ایسے خوبصورت اشتہار
پوسٹر اور سائن بورڈ بنوانے کا
شوق ہو تو پتہ نوٹ
کر لیجیے
مثنویات حسن
حضرت میر حسن دہلوی مرحوم
کی مشہور مثنوی سحر البیان المعروف بہ
بینظیر و بدر منیر اور گلزار ارم
مثنوی
مولوی سید اشرف حسین صاحب
دہلوی قیمت ۱۲ علاوہ محصول
ملنے کا پتہ
مخزن بک ایجنسی
بھاٹی گیٹ لاہور





موت کا قافلہ

دورِ جدید

رجسٹرڈ ایل نمبر ۲۰۹۷

مخزن لاہور

قیمت سالانہ للعہ

ممالکِ غیر سے ۹ شلنگ

بذریعہ وی پی للعہ

فی پرچہ ۶ ر

جلد ۱ | بابت ماہ اپریل سنہ ۱۹۲۷ء | نمبر ۲

تصاویر (۱) موت کا قافلہ۔ (۲) نواب مرزا داغ

صفدر علی خان خوشنویس پیامیری کاتب مخزن

گیلانی الیکٹرک پریس لاہور میں باہتمام بابو نظام الدین پرنٹر چھپا۔ اور میاں ظہور الدین پبلشر نے دفتر مخزن لاہور سے شائع کیا

شذرات

مخزن کا پہلا نمبر کس حد تک مقبول ہوا۔ اس کا ذکر خود ستائی پر محمول کیا جائے گا۔ اس لئے ہم اس سے پرہیز کرتے ہیں۔ لیکن اُن حضرات کا شکریہ ادا کرنا نہایت ضروری ہے۔ جنہوں نے اس کارِ دشوار میں ہماری معاونت کی۔ اہلِ قلم معاونین کا شکریہ جنہوں نے مضامین لکھے۔ معاصرین کا شکریہ جنہوں نے ریویو فرمائے۔ احباب کا شکریہ جو توسیعِ اشاعت میں کوشاں ہیں +

حضرتِ اصغر گونڈوی آج کل پنجاب اور یو۔ پی کے رسائل میں گُل بازی بن رہے ہیں۔ ہمیں آپ سے شرفِ نیاز حاصل ہو چکا ہے۔ آپ کی تصنیف "نشاطِ رُوح" بھی نظر سے گزری ہے۔ ہمارے خیال میں اصغر صاحب کم سخن اور مرنجاں مرنج آدمی ہیں۔ شعر سے ذوق رکھتے ہیں۔ صاف اور سُلجھا ہوا شعر بھی کہہ جاتے ہیں۔ اُن کے مجموعۂ کلام میں لفاظی اور تراکیبِ غریبہ کی کثرت ہی سہی لیکن ایسے اشعار بھی تو ہیں جن پر کسی طرح بے معنی ہونے کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ اس لئے ہم حیران ہیں۔ کہ اُن کے متعلق ادبی رسائل کا لمبی چوڑی اور سراسر ہجو ملیح سے بھری ہوئی تحریرات کا شائع کرنا کس بنا پر ہے! یہ تمسخر آلود واہ واہ کسی طرح داد نہیں کہی جا سکتی۔ اسے بیداد کہتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہو گا۔ کہ "نشاطِ رُوح" کے اچھے اشعار بھی نظروں سے گر جائیں گے اور اس کا غریب مصنف اگر احساس رکھتا ہے۔ تو اپنے آپ کو ان مداحیہ تعریفوں کا اہل نہ سمجھ کر شعر کہنا ترک کر دے گا۔ یا اگر وہ بہت ہی سادہ دل ہے تو اور زیادہ مہمل گو ہو جائے گا۔ اور یہ ادبی نقصان ہے۔ ہمیں اس تمسخر طریقے کے خلاف لکھنے کی ضرورت اس لئے محسوس ہوتی ہے کیونکہ اول تو ہم کسی شریف آدمی کا اس حد تک بنایا جانا پسند نہیں کرتے۔ دوسرے ان تحریرات میں بعض مشاہیر اور قابلِ تعظیم بزرگوں کا نام حفظِ مراتب کا لحاظ کئے بغیر نہایت بے تکلفی سے لیا جاتا ہے۔ جو کسی طرح مستحسن نہیں +

مثال کے طور پر ہم ایک مقامی ہم عصر کا چھوٹا سا فقرہ حُبت نقل کرتے ہیں:۔

"نشاطِ روح" کی فنی حیثیت اردو شاعری میں سب سے ارفع ہے۔ اور خالص شاعری۔ صحیح شاعرانہ جذبات۔ پرواز، شعریت، لطافتِ فکر اور رعنائی خیالات کے اعتبار سے آج کل کے مشہور شعراء حسرت، اقبال، فانی، جگر، عزیز وغیرہ اصغر کی گرد کو بھی نہیں پہنچتے + فارسی میں بھی حافظ کے سوا کوئی ایسا رنگین نوا شاعر نظر نہیں آتا جس کو جنابِ اصغر کے مقابلے میں پیش کیا جا سکے"+

یہ ہے اس اندازِ مزاح کا ادنے نمونہ جو اصغر صاحب سے روا رکھا جاتا ہے +

ہماری استدعا ہے۔ کہ معاصرین کرام اصغر صاحب کی شاعری پر رحم کریں۔ صرف گرمیٔ محفل کے لئے کسی کو دین دُنیا سے کھو دینا کہاں تک جائز قرار دیا جا سکتا ہے +

ایڈیٹر

مخزن

دورِ جدید

مدنیّات

(از پرنسپل عبداللہ یوسف علی سی۔ بی۔ ای۔ ایل ایل ایم کنٹب)

(ترجمہ از جناب محمد دین صاحب تاثیر ایم۔ اے۔)

(گذشتہ سے پیوستہ)

شہریّت کے اصول کی توضیح کے لئے ایک شہری کے دن بھر کے پروگرام پر شرح لبط سے بحث کی گئی ہے۔ اگر اس شہری کے یہاں بچے ہیں تو پھر ان کی تعلیم کا سوال درپیش ہوتا ہے۔ شاید وہ کسی میونسپل سکول میں تعلیم پا رہے ہوں۔ اب اُسے یہ دیکھنا ہے۔ کہ کیا جو تعلیم انہیں دی جا رہی ہے۔ وہ مقامی ضروریات کے مناسب ہے۔ اور تعلیم کا ارفع تر مقصد یعنی بچوں کو بہتر مرد یا عورت بنانا اس میں شامل ہے یا نہیں۔ کیا اسکول کا محلِ وقوع آبادی

کے تمام مرکزوں کی سہولت کے مطابق ہے۔ کیا تمام شہریوں سے ایک سا برتاؤ ہوتا ہے۔ یا کوئی جتھا کوئی قلیت یا اکثریت کسی کمزور قوم کے راستے میں روڑے اٹکاتی ہے۔؟ بچوں کی صحت کا خیال کس قدر رکھا جاتا ہے۔ کیا ٹیکے کے انتظامات تسلی بخش ہیں؟ کیا ڈاکٹر آسانی سے دستیاب ہوسکتے ہیں۔ اور لوگ ان کا خرچ برداشت کرسکتے ہیں؟ کیا ہسپتال محض چند عمائدین کے صحت خانے ہیں۔ یا ان کا عوام سے بھی تعلق ہے۔ اور کیا عوام ان کی امداد یا ان کو استعمال کرتے ہیں؟ بالخصوص زچگی کے متعلق کیا آسائشیں ہیں؟ اور مادران قوم کی نگہداشت تمام ملک کا مقدس فرض سمجھا جاتا ہے یا نہیں۔ اور پھر ایسے معاملات میں جہالت اور معاشرتی تعصبات کا مقابلہ کرنے کے لئے کیا ترکیب کی جاتی ہے؟ پھر سیاست دانی کے ذرائع سے اقتصادی رکاوٹوں کو راستے سے ہٹایا جاتا ہے؟

شہری زندگی کی صحت کے زیادہ بالواسطہ شعبوں کا تعلق بیماری کی روک تھام سے ہے۔ بلدیاتی منڈی (مارکیٹ) کے انتظامات اگر اچھے ہیں۔ تو اس ذریعے سے لوگوں میں اچھا صحت مند سامان خوردنی بکفایت تقسیم ہوگا۔ کھانے پینے کی چیزوں کا معائنہ خود غرضانہ تجارت کا کافی سدّ باب کرسکتا ہے۔ مغرب کے تمام ترقی یافتہ بلدیاتی مرکزوں میں دودھ پر تمام پبلک کی نظر رہتی ہے۔ ستھری خوراک اچھی طرح پکی ہوئی ایک ایسی چیز ہے۔ جو ہر جماعت کے لوگوں کو ہر وقت میسر آسکے۔ تو شہر کی صحت کی بنیاد اس سے استوار ہوسکتی ہے۔

جب ہمارا شہری رات کو سونے لگتا ہے۔ تو حفاظت کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ جس شہر کا انتظام اچھا ہے وہاں چوکیداری کا انتظام الگ الگ لوگوں کا نہیں ہوتا۔ اب دیکھنا یہ ہے۔ کہ آیا پولیس کا انتظام نہ صرف تجسس جرائم کے متعلق۔ بلکہ جرائم کی روک تھام کے لئے تسلی بخش ہے یا نہیں؟ کیا شہری پولیس کو اپنا معاون تصور کرتے ہیں۔ یا شہریوں اور اُن لوگوں کے درمیان جنہیں شہر کے امن وامان کا محافظ ہونا چاہئے ایک دائمی کشاکش رہتی ہے؟

اقامت کے انتظامات کے متعلق ہندوستانی بلدیے ابھی تک مغربی ممالک سے بہت پیچھے ہیں۔ لیکن ہر بلدیے کی تعمیرات کے ضمن میں کچھ نہ کچھ قوانین ہوتے ہیں۔ جو نہایت ناکافی ہوتے ہیں۔ اور ان پر بہت کم عملدرآمد ہوتا ہے۔ اچھے رہائشی مکان جہاں روشنی اور ہوا کا خاطر خواہ انتظام ہوتا ہے۔ اور پھر رہائش کے مطابق جگہ ایک ایسی ضرورت ہے۔ جس کا پورا کرنا عالی شہری کا فرض منصبی ہے۔ مکانوں کی تعمیر گلی کوچے کے مطابق۔ اور پھر تمام زمین کے محل وقوع کے مطابق ہونا بھی ایک ویسی ہی اہم ضرورت ہے۔ لیکن اگر تمام عمارتیں اس تسلی بخش طریق سے بنائی جائیں۔ تو بھی شہر کی نقشہ بندی کا سوال طے نہیں ہوجاتا ہمیں

پارکوں اور باغات کی ضرورت ہے۔ جو شہر کا پھیپھڑا کہلاتے ہیں۔ اور ہوا کو مصفا رکھتے ہیں۔ یہ ایسی جگہ ہونے چاہئیں۔ کہ ان تک ہر حیثیت کے شہری امیر ہوں یا غریب پہنچ سکیں۔ بالخصوص غربا۔ کہ ان کے جائے اقامت کی جگہ کم فراخ ہوتی ہے۔ یہ کھلی جگہیں اس طرح بنی چاہئیں۔ کہ ان سے صحت۔ مسرت اور جمالیات کے مقاصد ثلاثہ پورے ہوسکیں +

مگر یہ شہری ذمے داری کے اعلے مراتب ہیں۔ اور جدید ہندوستان میں ان کی طرف بہت کم توجہ مبذول کی جاتی ہے۔ شہری زندگی کی مکمل نشو و نما کے لئے میونسپل عجائب خانوں، غناخانوں، تصویر گھروں، اور فنون جمیلہ کے جملہ شعبوں کی ترقی کے لئے اور مرکزوں کا ہونا لازمی ہے۔ شاید یہ باتیں ابھی ہندوستان کی شہری زندگی کے افق سے بہت دور ہیں۔ لیکن ہو سکتا ہے۔ کہ ساری پبلک عمارتیں زیادہ خوشنما اور شہری زندگی کا نمونہ ہوں +

ہمارے ٹون ہال عام طور پر بہت بھدّے بنے ہوئے ہوتے ہیں۔ اور بہت نامناسب موقع پر تعمیر کئے جاتے ہیں۔ ان سے کام بھی فقط دفتر کا لیا جاتا ہے۔ کمرے تاریک گندے اور بدنما ہوتے ہیں۔ اور بیٹھنے کا انتظام بہت لغو ہوتا ہے۔ اور ستم ظریفی دیکھئے۔ کہ ایسے ماحول میں صحت اور صفائی اور دیگر آسائش زندگی کے اسباب پر لیکچر دیئے جاتے ہیں۔ بعض مغربی شہروں میں میئرز پارلرز[۱] ہوتے ہیں۔ یہ گویا صدر بلدیہ کا ایک کمرہ ہوتا ہے۔ جہاں کچھ تفریح اور کچھ باہمی مشاورت ہوسکتی ہے۔ اور اس طرح شہری لوگ آبائے شہر (سٹی فادرز[۲]) کے ساتھ ملتے جلتے رہتے ہیں +

سوشل اجتماعات اور سوشل زندگی کے معاملے میں ہم لوگ ترقی یافتہ قوموں سے صدیوں پیچھے ہیں۔ اور سماجی زندگی شہری زندگی کا اوّلین دروازہ ہے۔ یہاں تک کہ شہری صفات بھی سماجی صفات ہی سے پیدا ہوسکتی ہیں +

پچھلے وقتوں میں جب شہر شہر کی سلطنت الگ تھی۔ اُس وقت شہریوں کا آپس میں بہت میل جول ہوتا تھا۔ اور اقتصادی معیار ایسا تھا۔ کہ اعلے اور ادنے میں کچھ بہت امتیاز نہیں تھا۔ مگر اب شہر مُلکی سلطنتوں کا ایک جزو پریشان ہوتا ہے۔ اور پھر شہر اتنے بڑے بڑے ہیں۔ کہ شہر کی ایک جماعت کو دوسری جماعت سے عمر بھر سابقہ نہیں پڑتا۔ کئی شہر بالخصوص ہندوستان کے شہر تو بالکل ایک بے تماشا سا مجموعہ ہوتے ہیں۔ جن میں محض ایک مصنوعی دفاتری سلسلہ ہوتا ہے۔ جس سے کچھ لوگ باہم منسلک ہوجاتے ہیں +

City Fathers [۲] Mayor's Parlour [۱]

ان تکالیف کو دیکھ نمائندہ حکومت اور نمائندہ ادارات کا انتظام کیا گیا۔ ہمارے یہاں ان کی ترویج ابھی حال میں ہوئی ہے۔ اور لوگ اس کے نظریاتی پہلو سے بھی ابھی ابھی آشنا ہوتے ہیں۔ اس لئے یہ اور بھی ضروری ہے۔ کہ ہم اس مسئلے کو بنظر تحقیق دیکھیں اور اس کے ماخذ مغرب کے طریقہ کا اور مناسب ترمیمات پر غور کریں۔ تاکہ ہم ان سے پورا پورا فائدہ اُٹھا سکیں اور ان کے ذریعہ سے شہری زندگی اور شہری ادارات کے اصلی مقاصد کو پورا کر سکیں۔ تجربہ جس قدر چھوٹے پیمانے پر ہو گا۔ شہری سپرٹ اُسی قدر زیادہ نمایاں طور پر کام کرتی نظر آئے گی۔ ہم اسے کسی چھوٹی سی کلب یا سوسائٹی میں بھی دیکھ سکتے ہیں۔ اور ملکی پیمانے پر مشاہدہ کرنا ہو۔ تو پھر کسی قصبے یا گاؤں یا شہر کو لیا جائے۔ جہاں میونسپل انتظام بھی ہو۔ لیکن ملکی تقسیم سے گریز کرنا چاہئے۔ ایک بات کے متعلق میں اہل الرائے حضرات کو متنبہ کرنا چاہتا ہوں۔ کہ آج کل کونسلوں وغیرہ کی بدولت ملکی تقسیم بہت جاذب توجہ ہے۔ اور یہ بالکل ممکن ہے۔ کہ یہ صوبہ جاتی جذبہ یہاں تک ترقی کر جائے۔ کہ ہم وطن سے مراد ہندوستان نہیں بلکہ پنجاب۔ یو۔پی یا بنگال لینے لگیں ہمارا ملک خواہ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو۔ قدرت نے اسے ایک یگانگت دے رکھی ہے۔ اور ہمیں چاہئے کہ حُبِ قومی کے جذبے کی ترویج کے لئے اس سے پورا پورا فائدہ حاصل کریں +

ہمیں یہ بھی جاننا چاہئے۔ کہ شہری کی وفاداری کے مختلف مدارج ہوتے ہیں۔ چاہئے۔ کہ وہ ان سب مدارج کو باہم ملا سکے اور اختلافات کو ایک واحد ہمہ گیر جذبے میں غرق کر دے۔ کیونکہ صوبہ جاتی غرور سے بالاتر نہ ہو سکے۔ تو پھر ہم ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے + اور ایسی چھوٹی چھوٹی ریاستیں بن جائیں گی جو بیرونی غیر قدرتی دباؤ کے ہٹ جانے پر آپس میں ہمیشہ برسرِ پیکار رہیں گی +

اب جو وفاداری کے مختلف مدارج کا ذکر آگیا ہے۔ تو میں اس مسئلے کے ایک اَور پہلو پر بھی روشنی ڈالنا چاہتا ہوں۔ تمام منتظم جماعتوں میں مختلف گروہ ہوتے ہیں۔ جن کے مقاصد الگ الگ ہوتے ہیں۔ یہ گروہ مذہبی۔ صنعتی، سماجی، جمالیاتی یا ضروریات کے مطابق کئی اَور قسم کے ہو سکتے ہیں +

مختلف تاریخی وجوہ سے یہ ثابت ہوتا ہے۔ کہ ہماری نظروں میں مذہبی گروہوں نے زیادہ اہمیت حاصل کر لی ہے۔ اس فرقہ واری نے اتنا تفرقہ پیدا کر دیا ہے۔ کہ تمام شہری زندگی کی ہم آہنگی زیر و بالا ہو گئی ہے۔ حق تو یہ ہے۔ کہ ہر شہری اپنی مذہبی رائے کا حق رکھتا ہے۔ اور سچا مذہب تو نام ہے فطرتِ انسانی کے ارفع ترین اجزا کے ارتقا کا + ایسے مقدس کام میں محض اختلاف آرا پر جذبات کو برہم کرنا اور

وحشیانہ کشتی پر آمادہ ہونا شہریت کے سخت منافی ہے۔ معاملہ فہم آدمی اپنا چلن اس طرح استوار کر سکتا ہے۔ کہ وہ مختلف مقاصدِ حیات کی پیروی کرتا ہُوا۔ اُن سب میں تناقص پیدا ہونے نہ دے۔ اور شہریت کی فضا کو پُرسکون بنائے رکھے۔ یہ نتیجہ جب ہی پیدا ہو سکتا ہے۔ کہ آدمی روحِ مدنیت سے سرشار ہو۔ اور ہر وقت محتاط رہے۔ کہ لبریز جام کسی غیر متوقع ٹھیس سے چھلک نہ جائے +

اس سلسلے میں جمعیت بین الاقوام کا تذکرہ ناگزیر ہے۔ یہ جمعیت اب محض نظریاتی حالت سے گزر کر ایک ٹھوس حقیقت بن چکی ہے۔ اور ہر چند کہ اس سے مستقبل قریب یا بعید میں جنگ و جدل کا نیست و نابود ہو جانا یقینی نہیں۔ اور نہ یہ ضروری ہے۔ کہ اس کی بدولت دُنیا کے تمام لوگ ایک دم میں بھائی بھائی بن جائیں۔ مگر یہ ہے۔ کہ اس نے ممالکِ عالم میں بین الاقوامی تعاون کی ایک روح پھونک دی ہے۔ جس پر آئندہ ایک رفیع الشان عمارت استوار ہو سکتی ہے +

یہ تو روحِ مدنیت کے مختلف عملی شعبوں کا ایک خاکہ تھا۔ اب میں چند اصولی باتوں کا ذکر کر کے اور اُن سے چند کلیّے استنباط کرتا ہوں +

(باقی باقی)

میاں ایم اسلم کی تصانیف

میاں ایم اسلم صاحب کی لکھی ہوئی کتابیں ریویو کے لئے موصول ہوئی ہیں۔ کہانیوں کی یہ کتابیں بچوں کے لئے لکھی گئی ہیں۔ ہم نے انہیں مزے لے لے کر پڑھا۔ ہمیں بے انتہا پسند ہیں۔ مفصّل تبصرہ آئندہ نمبر میں کیا جائے گا۔ فی الحال کتابوں کے نام لکھنے پر اکتفا کیا جاتا ہے:۔

چار سہیلیاں قیمت ۸، غزال قیمت ۱۰، ساربان ۴، نورِ ہدایت ۴، خطِ تقدیر ۴، ارمغانِ عرب ۶، حکایاتِ عرب ۴، پیمانِ وفا ۵، امانت ۳، انتقام ۳، بلقیس ملکۂ صبا ۳، گیارہ کتابوں کا سٹ تین روپے ۱۲ میں دستیاب ہو سکتا ہے + نسیم بک ڈپو بازار بارود خانہ لاہور سے منگوائیں +

ایڈیٹر

یہ عید ہماری عید نہیں

یہ عید ہے روزہ داروں کی   محبوبِ خدا کے پیاروں کی
جن کی طاعت مشکور ہوئی   پروان چڑھی منظور ہوئی
سجدوں نے جبینیں چمکائیں   منّت کی مرادیں بر آئیں
محنت کا شجر پھل لایا ہے   دن فضلِ خدا کا آیا ہے
یہ بخشش کی اُمّید کا دن
یاروں کے لئے ہے عید کا دن

رحمت کی گھٹائیں چھائی ہیں   قبلے کی طرف سے آئی ہیں
وا ہیں توحید کے میخانے   اور گردش میں ہیں پیمانے
ساقیٔ ازل کی چوکھٹ ہے   مستانِ اَلَست کا جمگھٹ ہے
یہ سب اللہ کے دیوانے   شمعِ وحدت کے پروانے
توحید کے نغمے گاتے ہیں
مل مل کر عید مناتے ہیں

ہم بدقسمت ہم بے چارے   آزارِ فرقت کے مارے
عید آئی۔ یہ کیسے مانیں   ہم عید کی خوشیاں کیا جانیں
یثرب سے نہیں پیغام آیا   غربت میں ماہِ صیام آیا
محبوب کے در سے دُور رہے   لاچار ہوئے مجبور رہے
جب نورِ خدا کی دید نہیں
یہ عید ہماری عید نہیں

ابوالاثر حفیظ جالندھری

سکندر کا حملہ ہندوستان پر

(ماخوذ از پلوٹارک)

یونان کا جوان فاتح سکندر اعظم لڑکپن ہی سے ہندوستان جنت نشان کی تعریفیں سُن سُن کر بیتاب ہو چکا تھا۔ راستے میں جو سلطنتیں پڑتی تھیں۔ اُن کے فتح ہونے کی دیر تھی۔ کہ فوج ظفر موج کو لے کر منزلیں مارتا ہوا سندھ کے کنارے آن پہنچا۔ اور دریا کو عبور کر کے راجہ ٹکشل کی عملداری میں دلیرانہ چلا آیا +

راجہ ٹکشل کی سلطنت کے متعلق مشہور تھا۔ کہ طول و عرض میں مصر کے برابر ہے۔ اور سرسبز چراگاہوں اور ثمردار درختوں سے پٹی پڑی ہے۔ خود راجہ ٹکشل کی دانشمندی اور معاملہ فہمی کا شہرہ عام تھا + جب سکندر اس کی سلطنت میں داخل ہوا۔ تو راجہ ٹکشل مقابلے کی بجائے سکندر سے ملاقات کرنے نکلا۔ اور اُسی کے روبرو جا کر کہنے لگا۔ "اگر تم ہمارے دیس میں ہمارا آن اور جل چھین لینے کو نہیں آئے۔ تو پھر ہم کیوں آپس میں کشت و خون کریں + دانشمندوں کے نزدیک تو یہی ایسی چیزیں ہیں۔ جن پر انسان لڑائی کے لئے مجبور ہو جاتا ہے۔ باقی رہی دولت و حشمت۔ بعض لوگ ان کو بھی بڑی چیز سمجھتے ہیں۔ تو مہاراج اگر میں آپ سے زیادہ صاحب مقدور ہوں تو بخوشی میری دولت میں سے اپنا حصہ الگ کر لیجئے۔ لیکن اگر تقدیر نے آپ کو مجھ سے زیادہ بخشش رکھا ہے۔ تو شوق سے مجھے اپنا شکر گزار بنا لیجئے" +

راجہ کی تقریر سُن کر سکندر ایسا خوش ہوا۔ کہ اُسے گلے سے لگا لیا۔ چمک کر بولا "راجن سمجھتے ہو۔ کہ ہمارا تمہارا جو مقابلہ ہے۔ اس میں تم پُرتکلف الفاظ اور اخلاق سے کام لے کر سکندر سے بازی لے جاؤ گے؟ یہ نہ ہونے پائے گا۔ تم بااخلاق سہی لیکن سکندر بھی ہمت میں تم سے کم ثابت نہ ہوگا" +

ادھر راجہ نے سکندر کو تحفے تحائف نذر کئے۔ اُدھر سکندر نے بیش قدر اور بیش قیمت تحائف سے راجہ کو لاد دیا۔ ساتھ ہی زر نقد بھی عطا کیا۔ چنانچہ راجہ ٹکشل سے لڑائی ٹل گئی۔ اور سکندر تسخیر کی نیت سے پنجاب کی طرف بڑھا +

سکندر کے ہندوستان میں داخل ہونے کی خبر ہر طرف پھیل گئی تھی۔ دلاور ہندوستانی بھارت ورش کی حفاظت کے لئے تیار ہو گئے۔ اور سکندر کے راستے میں جو شہر پڑتے تھے۔ وہاں کے راجاؤں کے ہاں ملازم ہو گئے۔ اور اس جرأت اور بے جگری سے یونانی فاتح کا مقابلہ کیا۔ کہ وہ ان کی شجاعت کا قائل ہو گیا +

ایک شہر جب بہت عرصے کے محاصرے کے بعد بے بس ہو گیا۔ تو شہر والوں نے صلح کی گفتگو کرنے کی غرض سے ایک ایلچی سکندر کے پاس بھیجا + سکندر کا جی بھی نہ چاہتا تھا۔ کہ شہر کے محافظ سورمیروں کو موت کے گھاٹ اُتارے۔ کہلا بھیجا۔ تمہاری دلاوری ہمیں اس قدر بھائی ہے۔ کہ چاہتے ہیں تمہیں اپنے سایہ عاطفت میں لے لیں +

شہر میں مقابلے کی سکت تو باقی ہی نہ تھی۔ ادھر ملی سکندر سے داد بہت سے مجبور رہا در شہر سے نکل آئے۔ اور گفت و شنید کی غرض سے سکندر کی فوجوں کے مقابل ایک پہاڑی پر جمع ہو گئے۔ وہاں پہنچ کر معلوم ہوا۔ کہ سکندر انہیں اپنی فوج میں شامل کرنا اور بھارت واسیوں ہی سے لڑوانا چاہتا ہے۔ ہندوستانی بیروں کی غیرت و حمیت کو یہ کب گوارا ہو سکتا تھا۔ ارادہ کر لیا۔ کہ رات کے اندھیرے میں چپ چپاتے اپنے اپنے گھروں کو چل کھڑے ہوں گے + لیکن کسی طرح سکندر کو بھی ان کے اس ارادے کی خبر مل گئی۔ اسی وقت انہیں پہاڑی پر گھیر لیا۔ اور اُن سب کا کام تمام کر دیا۔ اور پھر بے بس شہر کو فتح کر ڈالا + یہ وعدہ خلافی سکندر کی شجاعت اور شہرت پر ہمیشہ ایک دھبہ بنی رہے گی +

پنجاب پر اس زمانے میں راجہ پورس حکمراں تھا۔ سکندر کو بڑھتے دیکھا۔ تو فوجیں لے کر بڑی آن بان سے مقابلے کو نکلا۔ اُدھر سے سکندر اپنی ہمت و بسالت دکھانے آ رہا تھا۔ اِدھر سے راجہ اپنی غیرت و شجاعت کا امتحان دینے جا رہا تھا۔ دریائے جہلم پر آمنا سامنا ہو گیا۔ اور دریا کے کناروں پر دونوں نے اپنی فوجوں کے پرے جما دیئے + پورس نے دریا کے کنارے جنگی ہاتھیوں کی لمبی صف جما دی۔ کہ اگر غنیم دریا پار کرنے کی کوشش کرے تو ہاتھی انہیں قریب آتے ہی دریا میں دھکیل دیں۔ یا کچل کر کام تمام کر ڈالیں + حفاظت کا انتظام اس قدر پختہ تھا۔ کہ یونانیوں کے لئے دریا پار کرنا تقریباً ناممکن ہو گیا تھا +

سکندر دوسرے کنارے پر پڑا پڑا عاجز آ گیا۔ کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا۔ کہ کیونکر دریا پار کرے۔ اور دشمن تک پہنچ سکے۔ اتفاق کی بات ایک روز رات کو طوفان باد و باران آیا۔ ہر طرف کاجل سی تاریکی پھیل گئی

سکندر نے اس موقعے کو غنیمت سمجھا۔ دشمن کو کچھ نظر نہ آ سکتا تھا۔ چُپ چپاتے فوج کا ایک حصہ اپنے ساتھ لیا۔ اور کنارے کنارے بہت دُور جا کر ایک مقام پر کشتیاں دریا میں ڈال دیں + طوفان میں جہلم اُبلا پڑ رہا تھا۔ لیکن یہ جوں توں کرکے ایک ٹاپو میں پہنچ گیا۔ جو دریا کے درمیان تھا + اس وقت طوفان کا وہ زور ہوا۔ کہ بہادروں کے دل بھی دہل گئے۔ بادل یوں گرج رہے تھے۔ گویا لاکھوں توپیں ایک ساتھ چھوٹ رہی ہیں۔ مینہ دھائیں دھائیں پڑ رہا تھا۔ زناٹے کی ہوا چل رہی تھی۔ چڑھا ہوا دریا شائیں شائیں بہہ رہا تھا۔ لیکن سکندر نے حوصلہ نہ ہارا۔ اور پھر فوج کو لے کر دریا میں اُتر گیا + کشتیاں ڈانوا ڈول ہو رہی تھیں۔ مگر یہ ہمت کا دھنی گھٹا ٹوپ اندھیرے اور طوفان کے جوش و خروش میں اپنے ساتھیوں کو ہمراہ لئے بڑھا چلا جا رہا تھا + کنارے کی زمین ایسی نرم اور پھسلواں ہو رہی تھی۔ کہ قدم جمائے نہ جمتے تھے۔ کہتے ہیں اس وقت بے اختیار اس کی زبان سے نکلا۔ میرے یونان کے رہنے والو! تمہیں یقین بھی نہ آئے گا۔ تمہاری داد حاصل کرنے کو میں کیسی جان جوکھوں میں سے گزر رہا ہوں +

سکندر یہاں سے سواروں کو ساتھ لے کر خود آگے بڑھا۔ اور پیدل فوج کو پیچھے رکھا۔ تھوڑی دیر بعد پورس کو بھی خبر مل گئی۔ کہ طوفانی رات دغا دے گئی۔ دشمن نے دریا کو عبور کر لیا۔ اُسی وقت جنگی رتھیں۔ اور ہزار سوار مقابلے کے لئے بھیج دئے۔ لیکن سکندر نے ذرا سی دیر میں اس تمام فوج کو کاٹ کر رکھ دیا۔ اور رتھوں پر قبضہ کر لیا + پورس کو جب معلوم ہوا۔ کہ خود سکندر اپنی فوجوں کے ساتھ ہے۔ تو اپنی پوری قوت سے دشمن پر ٹوٹ پڑا۔ صرف تھوڑی سی فوج پیچھے رہنے دی۔ کہ اگر سکندر کے باقی سپاہی دریا پار کرنا چاہیں۔ تو اُنہیں روکے رکھے +

پورس کی فوج کے درمیانی حصے میں سامنے کے رُخ ہاتھی بڑھے آ رہے تھے۔ سکندر نے سوچا۔ ہاتھیوں سے پیش پانا مشکل ہے۔ چنانچہ اپنی فوج کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ کہ ہاتھیوں سے بچ کر ایک دائیں طرف سے دھاوا بولے۔ اور دوسرا بائیں طرف سے۔ دشمن کے قریب آتے ہی دونوں حصوں نے اس بے جگری سے حملہ کیا۔ کہ ہندوستانیوں کے قدم اُکھڑ گئے۔ اور وہ دونوں پہلوؤں سے سمٹ کر درمیان میں اپنے ہاتھیوں کے گرد جمع ہو گئے۔ اور اب ایسی خوفناک دست بدست لڑائی شروع ہوئی۔ کہ جہلم کا کنارہ میدان محشر کا نمونہ بن گیا۔ ہتھیاروں کی چمک سے آنکھیں مچی جاتی تھیں۔ لڑنے والوں اور مرنے والوں کے شور سے کان پڑی آواز نہ سنائی دیتی تھی۔ بے بس ہاتھی چنگھاڑ رہے تھے۔ زخمی اور بیتاب گھوڑوں کی ہنہناہٹ نے شورِ قیامت

برپا کر رکھا تھا۔ تیر موسلا دھار مینہ کی طرح سَن سَن کر رہے تھے۔ سر دھڑ سے جُدا ہو رہے تھے۔ جگہ جگہ خون کے فوّارے چھوٹ رہے تھے۔ اپنی اپنی عزت و حُرمت کے سوا اَور کوئی خیال پیش نظر نہ تھا۔ اور اس خیال پر بے دھڑک جانوں پر جانیں قربان ہو رہی تھیں۔

پورس قد کا بہت لمبا اور نہایت تنومند شخص تھا۔ اس کی سواری کا خاص ہاتھی بھی ڈیل ڈول میں بہت بڑا تھا۔ لیکن اس پر بیٹھا ہؤا پورس ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے کوئی گھوڑے پر سوار دکھائی دیتا ہے۔ ہاتھی ایسا سمجھ دار تھا۔ کہ تمام جنگ کے دوران میں نہایت احتیاط سے پورس کی حفاظت کرتا رہا۔ کیا مجال جو کوئی دشمن قریب بھی پھٹکنے پائے۔ جب پورس بے شمار تیروں سے زخمی ہو کر نڈھال ہو گیا۔ تو ہاتھی بیٹھ گیا۔ کہ کہیں مالک کو بہت بلندی سے گر کر چوٹ نہ آجائے۔ اور پھر سونڈ پھرا کر اس کے جسم سے تیروں کو نکالنے لگا۔

آٹھ گھنٹے اس گھمسان کا رن پڑا۔ کہ کُشتوں کے پُشتے لگ گئے۔ لیکن غربت کی موت کے خیال نے یونانیوں کے لہو میں ایسی آگ بھڑکا رکھی تھی۔ کہ وہ جان توڑ کر لڑ رہے تھے۔ اور دم بدم ان کا پلّہ بھاری ہوتا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ وہ قطعی طور پر غالب آگئے۔ پورس کی فوج کو شکست ہوئی۔ اور یہ بہادر راجہ گرفتار کر لیا گیا۔

جب اسے سکندر کے روبرو لائے۔ تو سکندر نے پوچھا "کہو راجن اب تم سے کیسا سلوک کریں"؟

پورس نے نڈر ہو کر جواب دیا:"جیسا سلوک بادشاہ بادشاہوں سے کیا کرتے ہیں"۔

بے بس راجہ کا یہ جواب جس سے اس کی عالی ظرفی اور شجاعت ظاہر تھی۔ سکندر کے دل کو ایسا لگا کہ اس کا مُلک اسی کو واپس کر دیا۔ اور اس کے علاوہ اِدھر اُدھر کے دوسرے ممالک بھی فتح کر کے اس کی مملکت میں شامل کر دئے۔

سکندر پورس سے بازی تو جیت گیا۔ لیکن اس مقابلے سے ہندوستانیوں کی دلاوری اور شجاعت تمام یونانیوں کے دل پر نقش ہو گئی۔ سکندر کا ارادہ آگے بڑھ کر تمام ہندوستان کے تسخیر کرنے کا تھا۔ مگر فوج کو گنگا[1] پار کرنے اور اَور بھی طاقت دار راجاؤں سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ نہ ہؤا۔ چنانچہ انہوں نے آگے بڑھنے کے خیال کی مخالفت کی۔ سکندر کو فوج کے انکار سے اتنا قلق ہؤا۔ کہ اپنے خیمے ہی میں پڑا رہتا۔ اور کہتا۔ "یہاں سے واپس جانے کے یہ معنی ہیں۔ کہ ہم نے شکست کا اعتراف کر لیا۔ اور اگر تم نے گنگا پار نہ کیا۔ تو جو کچھ اب تک کیا ہے۔ سب میری نظروں میں غارت ہو جائے گا"۔

لیکن کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی۔ فوج وطن لوٹ جانے کے لئے بے تاب ہو رہی تھی۔ سپاہی اس کے

---

[1] غالباً پلوٹارک کا مطلب ستلج سے ہے۔ ایڈیٹر

خیمے کے دروازے پر جمع ہو جاتے۔ اور رو رو کر واپسی کی التجا کرتے تھے + ادھر دوستوں نے بھی طرح طرح سے سمجھایا۔ اور سکندر مراجعت پر مجبور کر دیا گیا + سوچا۔ زمین کی تو بہت سیر کی۔ اب دریاؤں میں سے گزر کر سمندر کے راستے واپس چلنا چاہیئے۔ چنانچہ بیڑا بنانے کا حکم دیا۔ کشتیاں بن کر تیار ہوگئیں۔ ان میں سوار ہو کر مزے سے دریا دریا روانہ ہوا۔ کہیں کہیں کشتیوں سے اُتر جاتا۔ اور کنارے کے شہروں کو مطیع کر لیتا + ایک جگہ تو اسی شوق میں جان کے لالے پڑ گئے +

منٹگمری کے ضلع میں راوی کے کنارے کے لوگ اُس زمانے میں جنگ جوئی کے لئے مشہور تھے۔ دریا کے قریب ان کا ایک قلعہ تھا۔ سکندر نے فوجیں کشتیوں سے اُتار قلعے پر حملہ بول دیا + قلعے والوں نے دروازے بند کر لئے۔ اور دیواروں پر سے تیر برسانے شروع کر دیئے۔ مگر یونانی فوج کے تیراندازوں نے انہیں بہت جلد دیوار پر سے ہٹا دیا۔ اور سب سے پہلے خود سکندر سیڑھی لگا کر قلعے کے اوپر چڑھ گیا + دیوار پر چڑھنے کی دیر تھی۔ کہ سیڑھی ٹوٹ گئی۔ اور سکندر اوپر اکیلا رہ گیا + ادھر دشمنوں نے اندر سے تیروں کی بوچھار باندھ دی۔ سکندر سے اَور کچھ تو بن نہ پڑا۔ دست بدست لڑنے کو اندر دشمنوں کے اژدہام میں کود پڑا + خیریت گزری۔ کہ پیروں ہی کے بل نیچے پہنچا۔ ورنہ جان جانے میں کسر نہ تھی + اسلحہ ایسے جگ مگ جگ مگ کر رہے تھے۔ کہ معلوم ہوتا تھا۔ جیسے اس سے نور کی شعاعیں پھوٹ پھوٹ کر نکل رہی ہیں + اک ذرا دیر کو پنجابی مرعوب ہو کر گھبرا گئے۔ مگر اس اثنا میں سکندر کے دو اَور ساتھی دیوار پر چڑھ کر اندر کود پڑے + اب پنجابی چونکے اور انہوں نے ہلہ کر کے تیروں اور تلواروں اور برچھیوں سے ان یونانیوں کا کام تمام کرنا چاہا + ایک تیرانداز نے ایسا تاک کر تیر چلایا۔ کہ زرہ میں سے گزر کر سکندر کی پسلی میں گڑ گیا۔ اس وار سے سکندر کے حواس غائب ہو گئے۔ اور وہ ایک گھٹنے کے بل زمین پر آ رہا + دشمن خنجر لے کر جان لینے کو جھپٹا۔ مگر سکندر کے زخمی ساتھیوں نے ہمّت کر کے اپنے بادشاہ کی جان بچالی +

تینوں یونانی جان توڑ کر لڑتے رہے۔ مگر کب تک۔ ایک گرز سکندر کی گردن پر ایسا پڑا۔ کہ اس نے تیورا کر دیوار کا سہارا لیا۔ مگر دشمن کو پیٹھ پھیر نہ دکھائی سینہ ان کے سامنے ہی تانے رہا۔ اس نازک موقعے پر باقی فوج دروازوں میں سے اندر گھس آئی۔ سکندر کو اُٹھا کر خیمے میں لے گئے۔ اور تیر جسم میں سے نکالنے کی کوشش کی۔ لیکن اس کی انی ہڈی میں کچھ اس طرح پیوست ہو چکی تھی۔ کہ کسی طرح نہ نکل سکا۔ آخر اوپر ہی سے کاٹ ڈالا گیا۔ اور ایک پنجابی تیر کی انی فاتح اعظم کے جسم ہی میں رہ گئی +

سکندر کئی روز تک صاحبِ فراش رہا+ آخر جب فوج اسے دیکھنے کو بہت بیتاب ہوئی۔ تو علالت ہی میں چادر اوڑھ کر باہر نکل آیا+ دیوتاؤں کو قربانیاں وغیرہ چڑھا کر فوج پھر کشتیوں میں سوار ہوگئی۔ اور آگے سفر شروع ہوا+

راستے میں سکندر نے پھر بہت سے شہر اور مُلک فتح کر ڈالے۔ سات مہینے تک تو دریا ہی کے راستے سفر جاری رہا۔ اس کے بعد بیڑا دریا سے سمندر میں چلا گیا+ سمندر میں ایک جزیرے پر سکندر اُتر کھڑا ہوا وہاں دیوتاؤں سے دعا کی۔ کہ جہاں تک میرا قدم پُہنچا ہے۔ اس سے آگے کوئی فاتح نہ پہنچنے پائے+ اس کے بعد بیڑا تو سمندر کے راستے یونان روانہ کیا۔ اور خود فوج کو ساتھ لے کر بلوچستان کے پہاڑی علاقے میں سے وطن کو چل دیا+

سکندر ۳۲۷ قبل مسیح میں ہندوستان پر حملہ آور ہوا تھا+

(سید امتیاز علی تاج)

ایک آرزو

شرابِ درد سے دل اے خدا مخمور ہو جائے
ترانہ ہائے دردانگیز سے مسحور ہو جائے

تڑپ کے واسطے برقِ تپاں مستور ہو جائے
جلانے کے لئے منظور برق طور ہو جائے

حصولِ کیفِ آزادی تمنائے مئے عشرت
خیالِ شاہدِ نازک خیالاں دُور ہو جائے

نظر افروز نظارے تجلی ریز تنہائی
سکوں آمیز اندازِ تکلم دُور ہو جائے

نہ ہو نغمات کی دُنیا نہ ہو جذبات کا عالم
ترنم راگ کا سوئے عدم کافور ہو جائے

تلاشِ حُسنِ فطرت آرزوئے بیخودی کیا ہے
مرے دل میں بجائے یاس کے ناسور ہو جائے

غم و آلام کی دُنیا ہو اور ہوں حضرتِ فائق
خدایا کس طرح میری دعا منظور ہو جائے

میر زمان خاں فائق سلطوی

مَیں اور میرا ہمسفر

(ابو رشید عبد المجید خاں صاحب سالک مدیر افکار و حوادث)

لاہور سے جو ٹرینیں پٹھان کوٹ کی طرف جاتی ہیں۔ ان میں امرتسر یا زیادہ سے زیادہ بٹالے کے سٹیشن تک مسافروں کا ہجوم رہتا ہے۔ لیکن اس کے بعد اس ہجوم میں تخفیف ہونے لگتی ہے۔ یہاں تک کہ پٹھان کوٹ پہنچتے پہنچتے ٹرینوں کے بعض کمرے بالکل خالی ہو جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ چونکہ یہ برانچ لائن ہے ہر ذلیل سے ذلیل اور نکمے سے نکمّے سٹیشن کو بھی اپنے قیام سے مشرّف فرماتی رہتی ہے۔ یہاں تک کہ مسافر کو حیاتِ انسانی کی بجائے دوام کا احساس ہونے لگتا ہے۔ اور میرؔ کا یہ شعر پوری طرح سمجھ میں آجاتا ہے۔ کہ ؎

موت اک زندگی کا وقفہ ہے۔
یعنی آگے چلیں گے دم لے کر +

آج سے دو سال پیشتر کا ذکر ہے۔ میں ایک ایسی ہی ٹرین میں سوار ہو کر پٹھان کوٹ جا رہا تھا۔ لاہور سے امرتسر تک اور امرتسر سے بٹالے تک تو اچھی خاصی چہل پہل رہی۔ مسافروں کی دھکا پیل کے علاوہ ایک خصوصیت یہ بھی تھی۔ کہ جا بجا سیاساتِ ملکی پر گفت و شنید بھی سُنائی دے رہی تھی۔ جس کا اکثر حصّہ گو بیخبری اور خیال آرائی کا ایک افسوسناک ملغوبہ تھا۔ لیکن اس سے کم از کم اتنا تو ثابت ہوتا تھا۔ کہ اس نواح کے باشندوں کو ان معاملات سے دلچسپی ضرور ہے۔ جب ٹرین بٹالے سے آگے بڑھی۔ تو اوّل مسافروں کی کمی کے باعث۔ دوسرے ان کی جبلی انقطاع پسندی کے سبب سے۔ جسے واضع نے ایک ضرب المثل میں یوں بیان کیا ہے کہ "پہاڑی میت کس کے۔ بھات کھایا اور کھسکے"۔ ٹرین کے کمروں میں زیادہ تر سکوت کا تسلط رہنے لگا +

درمیانی سٹیشنوں پر ٹرین میں سوار ہونے والے مسافر کم تھے۔ اور اُترنے والے زیادہ یعنی آمدنی سے خرچ زیادہ ہو رہا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا۔ کہ دینا نگر کے سٹیشن پر ٹرین کا وہ کمرہ جس میں مَیں بیٹھا تھا۔

خالی ہوگیا۔ اور میں بالکل تنہا رہ گیا۔ یا کم از کم مجھے خیال ہوا۔ کہ میں تنہا ہوں +

جن خوش قسمت لوگوں کو اس قسم کا اتفاق ہوا ہے۔ وہ خوب جانتے ہیں۔ کہ رات کے وقت جب ٹرین ویران میدانوں میں سے چھکا چھک چھکا چھک کرتی ہوئی چلی جا رہی ہو۔ کسی خالی کمرے میں سفر کرنا کس قدر خوشگوار ہوتا ہے۔ اور کامل آزادی کے وہ چند لمحے اس قدر بیش بہا ہوتے ہیں۔ کہ ہزار سوراج بھی ان پر قربان کر دیئے جائیں۔ تو ان کی قیمت ادا نہ ہو سکے۔ جہاں جی چاہے بیٹھئے کوئی روکنے والا نہیں۔ جدھر سے جی چاہے گزر جائیے۔ کوئی تیوری چڑھا کر دیکھنے والا نہیں۔ اپنے آپ سے باتیں کیجئے۔ اور حضرتِ دل سے وہ تمام تذکرے کر ڈالیئے۔ جواب تک صیغہ راز میں تھے کوئی آپ کی آواز نہ سُنے گا۔ اگر حکومت کے خلاف کوئی شکایت ہو۔ تو کھڑے ہو کر آواز بلند نہایت دھواں دھار اور تیز و تند تقریر کیجئے۔ اور "دفتری حکومت کی اقتدار پرستانہ حرکات" کے خلاف پھیپھڑوں کے پورے زور سے "صدائے احتجاج" بلند کیجئے۔ کوئی کمبخت سی آئی ڈی کا آدمی آپ کی تقریر نقل نہ کر سکے گا۔ اور دفعات ۱۲۴ الف اور ۱۵۳ الف بالکل بیکار اور بے سود رہ جائیں گی۔ کیونکہ ٹرین کا خالی کمرہ حرّیت۔ مساوات اور جمہوریت کے اعتبار سے امریکہ و فرانس کے بھی کان کترتا ہے۔ اور کوئی طاقت اس کی آزادی میں خلل انداز نہیں ہو سکتی +

اگر آپ لغو حرکتوں کے عادی ہیں۔ تو سر نیچے اور ٹانگیں اوپر کر کے کھڑے ہو جائیے۔ کوئی آپ پر ہنسنے کی جُرأت نہ کرے گا۔ جی چاہے تو گلیئے اور پُورے زور سے گائیے۔ ناچئے اور ناچتے ناچتے چکر گھنّی کھاتے کھاتے گھن چکر بن جائیے۔ لیکن شرط یہ ہے۔ کہ کوئی مسافر وہاں کیلے کا چھلکا نہ پھینک گیا ہو۔ جس معشوق کے سامنے اظہارِ محبّت کرتے ہوئے آپ کی جان نکلتی ہے۔ اُس کا تصور سامنے لاکر وفورِ اشتیاق اور جنوں شوق سے دیوانے بن جائیے۔ اور جو دل میں آئے کہہ ڈالئے۔ کوئی آپ کو دیکھنے والا نہیں۔ روکنے والا نہیں۔ پیٹنے والا نہیں +

کھڑکی کھولئے۔ اور پھر بند کر دیجئے۔ کوئی مسافر شکایت نہ کرے گا۔ ساری کھڑکیاں کھول دیجئے یا ساری بند کر دیجئے۔ یہ آپ کے منشائے مبارک پر منحصر ہے۔ جی چاہے تو اس آزادی کا لطف اُٹھانے کے لئے سارا وقت کھڑکیاں کھولنے اور بند کرنے ہی میں گزار دیجئے۔ جس کونے میں جی چاہے جا بیٹھئے بلکہ بہتر یہ ہوگا۔ کہ چند لمحے کے لئے ہر کونے میں بیٹھنے کا لطف اُٹھائیے۔ گدیلوں پر بالکل چت لیٹئے۔

یا کروٹ سے۔ یا اوندھے مُنہ۔ یہ امر صرف آپ کے اختیارِ تمیزی پر چھوڑ دیا گیا ہے +

لیکن میں نے اس رات خالی کمرے کی آزادی سے کچھ بہت زیادہ فائدہ نہ اُٹھایا۔ اس کی وجہ غالبًا یہ ہوگی۔ کہ خیال ہی نہیں آیا۔ ورنہ میں تنہائی میں طبعًا نہایت عجیب وغریب حرکتیں کرنے کا عادی ہوں۔ اس رات میری حرکات بالکل معمولی تھیں۔ جب تمام مسافر میرے کمرے سے جا چکے۔ تو میں نے اخبار ہاتھ سے رکھ دیا۔ ایک انگڑائی لی۔ ٹانگیں پھیلا دیں۔ اس کے بعد اُٹھ کے کھڑا ہوگیا۔ اور کھڑکی میں سے موسمِ گرما کی چاندنی رات کا کیف آور منظر دیکھنے لگا۔ تمام میدان جنگل۔ کھیت اور ٹیلے ماہتاب کے نورِ سیال میں شرابور ہو رہے تھے۔ اور ٹرین برابر اُڑی چلی جا رہی تھی۔ میں اس کھڑکی کو چھوڑ کر دوسری کھڑکی کی طرف گیا۔ اور اس میں سے بیرونی منظر کو جھانکنے لگا۔ اس کے بعد سگرٹ جلایا۔ اور بیٹھ کر پھر اخبار پڑھنے لگا +

عین اس وقت مجھے احساس ہوُا۔ کہ میں کمرے میں اکیلا نہیں ہوں۔ بلکہ میرا ایک ہمسفر بھی موجود ہے۔ یہ ہمسفر اس وقت میرے پاس آیا۔ اور نہایت بے تکلفی سے میری ناک پر بیٹھ گیا۔ یہ وہ پردار عیّار اور خونخوار کیڑا تھا۔ جسے ہم اور آپ عرفِ عام میں مچھر کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ میں نے اسے ہاتھ کے اشارے سے اپنی ناک پر سے اُڑا دیا۔ اس کے بعد اُس نے سارے کمرے کا ایک چکر لگایا۔ ہر کھڑکی میں سے تاک جھانک کی۔ لمپ کا طواف کیا۔ لیکن اسے ان تمام حرکات میں کچھ مزا نہ آیا۔ آخر اس نے یہی فیصلہ کیا۔ کہ سب کام چھوڑ کر اسی لمبے تڑنگے اور موٹے تازے جانور سے دل لگی کرنی چاہیئے۔ جو کونے والی کھڑکی کے پاس بیٹھا ہے۔ چنانچہ آپ نے پھر میرے حال پر توجہ مبذول کی۔ اور سیدھے آکر میری گردن پر متمکن ہوگئے +

مَیں نے ان حضرت کو پھر ایک دفعہ اُڑا دیا۔ آپ اُڑ تو گئے۔ لیکن کمرے کا ایک اَور دَورہ کر کے واپس تشریف لے آئے۔ اور نہایت بدتمیزی سے میرے ہاتھ کی پُشت پر آبیٹھے۔ اب تو میں بہت جھنجلایا۔ میں نے اس سے صاف صاف کہہ دیا۔ کہ سنو میاں مچھر۔ اگر تم اُس مچھر کی اولاد ہونے پر فخر کرتے ہو۔ جس نے نمرود کے بھیجے میں جان لیوا اختلاج پیدا کی تھی۔ تو مَیں بھی اُس شخص کی اولاد میں سے ہوں۔ جس پر نمرود کی آگ گلزار ہوگئی تھی + عالی حوصلگی کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ میں تمہیں دو دفعہ آگاہ کر چکا ہوں۔ کہ حضورِ انجانب کی ذات والاصفات اجنبیوں کی عملی دل لگی کو برداشت نہیں کر سکتی۔

اب کان کھول کر سُن لو۔ کہ میں اس کمرے کے طول و عرض کا مطلق العنان حاکم ہونے کی حیثیت سے تم کو سزائے موت دیتا ہوں۔ تمہارے خلاف بہت سے الزامات ہیں (اوّل) تم آوارہ گرد ہو۔ (دوم) تمہاری سرگرمیاں امن عامہ میں خلل ڈالنے والی ہیں۔ (سوم) تم بغیر ٹکٹ کے سفر کر رہے ہو (چہارم) تم نے اس کمرے کے بادشاہ کی ذات پر قاتلانہ حملہ کیا ہے۔ ان تمام الزامات کے ماتحت میں تمہیں سزائے موت کا مستوجب قرار دیتا ہوں۔ اور ہونے والی اپیل اور رحم کی درخواست کو خود ہی اپنے اختیارات سے نامنظور کرتا ہوں +

یہ کہہ کر میں نے اپنا دایاں ہاتھ اُٹھا کر تڑ سے بائیں پر رسید کر دیا۔ لیکن مچھر اس قدر گستاخانہ سہولت سے میرا وار خالی دے گیا۔ کہ جی ہی تو جل گیا۔ اب وہ مچھر میرا مدِّ مقابل بننے کی کوشش کر رہا تھا۔ اور یہ ذلت مجھے اندر ہی اندر کباب کئے دیتی تھی۔ میرا جذبۂ خودداری بیدار ہو گیا۔ میں نے اپنے حریف پر پے در پے حملے شروع کئے۔ کبھی ہاتھ سے اسے مارنے کی کوشش کی کبھی اخبار اُٹھا کے مارا۔ کبھی کود کر گدیلے پر جا پڑا۔ اور کبھی لمپ کے گرد اس کا تعاقب کرنے لگا۔ لڑائی میں مکر فریب سب جائز ہے اس انتظار میں کہ وہ مچھر لمپ کے طواف سے فارغ ہو کر نیچے اُترے گا۔ میں چپ چاپ سانس روکے بیٹھا رہا۔ جب وہ نیچے کی طرف آیا۔ تو میں نہایت خاموشی سے چوروں کی طرح اس کے پاس پہنچا۔ اور اپنا اخبار اس پر دفعتاً نہایت زور سے دے مارا +

لیکن میری تمام تدبیریں بالکل بے سود نکلیں۔ وہ نہایت دیدہ دلیری اور ہنرمندی سے میرے تمام وار خالی دیتا رہا۔ اور ساتھ ہی بھن بھن بھی کرتا رہا۔ گویا یہ کہہ رہا تھا۔ کہ "واہ میاں۔ تم تو مچھر سے بھی گئے گزرے نکلے"! جس طرح بچے کسی مسخرے یا دیوانے کو چھیڑ کر خوش ہوتے ہیں۔ اسی طرح یہ مچھر مجھے ستا کر خوش و خرم ہو رہا تھا۔ اور حقیقت یہ ہے۔ کہ ایک ایسے جانور سے دل لگی کرنا بہت مزے کی چیز ہے۔ جو عقل و ہوش کے دعوے کے باوجود بے بس بھی ہو اور احمق بھی۔ اگر مجھے کوئی اس قسم کا آدمی مل جائے تو میں بھی دل لگی کے لئے ہی کچھ کروں۔ جب مجھے اس مچھر کی طاقت کا احساس ہوا۔ تو جس طرح یورپین کسی محکوم قوم کی بیداری پر اس سے دوستانہ معاہدے کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ میں بھی آہستہ آہستہ اس مچھر کے ساتھ اخلاق سے پیش آنے لگا۔ کیونکہ اب اس کی حیثیت محض ایک ناچیز کیڑے کی نہ تھی۔ بلکہ ایک شخصیت اور دانا و بینا شخصیت تھی۔ جس نے اس کمرے کے قبضے و تسلط میں مجھ سے مساوی حصے کا

مطالبہ کیا تھا۔ اور مجھے ایسی حالت میں ڈال دیا تھا۔ کہ میں اس کے مطالبے کو ٹال نہ سکتا تھا۔

میرے دل میں اس مچھر کے متعلق دوستی اور محبت کے جذبات پیدا ہونے لگے۔ اور وہ علو و رفعت کا احساس جو اشرف المخلوقات ہونے کی حیثیت سے ہر انسان کے دل میں موجود ہے بالکل غائب ہو گیا آخر میں اپنے آپ کو اس مچھر سے بہتر کیونکر سمجھ سکتا تھا۔ عمر بھر میں میرا اور اس کا صرف ایک ہی مقابلہ ہوا۔ اور اس میں وہ صاف جیت گیا۔ آخر میں نے سوچا۔ کہ عالی حوصلگی سے کام لینا چاہئے۔ کیونکہ عالی حوصلگی اور رحم انسان کے بہترین خصائل ہیں۔ اگر میں نے ان خصائل حسنہ سے کام لیا۔ تو میرا رُعب و اعتماد عود کر آئے گا۔ اس وقت میری جو کچھ حالت ہے۔ وہ نہایت مضحکہ خیز ہے۔ اور اسی قابل ہے کہ اس کا مذاق اُڑایا جائے۔ لیکن اگر میں رحم سے کام لوں۔ تو اس سے بنی نوعِ انسان کا اخلاقی وقار از سر نو قائم ہو سکتا ہے۔ اور میں نہایت عزت و شان کے ساتھ پسپا ہو کر کونے والی کھڑکی کی جانب مراجعت کر سکتا ہوں۔ میں نے مچھر سے کہا۔ کہ میں سزائے موت کا حکم واپس لیتا ہوں۔ گو میں تمہارے قتل پر قادر نہیں ہو سکا۔ لیکن تمہاری جاں بخشی پر ضرور قدرت رکھتا ہوں۔ جاؤ میں نے تمہیں خدا و رسول کے لئے بخشا۔

اس دفعہ میں نے ایک ادبی رسالہ اُٹھایا۔ اور پڑھنا شروع کیا۔ مچھر صاحب آئے۔ اور بھنبھناتے ہوئے اس رسالے کے صفحے پر بیٹھ گئے۔ میں نے کہا: "احمق کہیں کے۔ اب کے تو معلوم ہوتا ہے تجھے موت ہی میرے پاس کھینچ لائی ہے۔ اب اگر میں اس قابلِ قدر ادبی رسالے کو دفعتاً بند کر دوں۔ تو تجھے تڑپنے کی بھی مہلت نہ ملے۔ اور ان دو مضمونوں کے درمیان جن میں سے ایک پر "مچھر کی سرگزشت" اور دوسرے پر "آغوشِ مچھر میں شبِ عید" کے مضامین درج ہیں۔ تیری نعش پچک کے ایک نقطہ رہ جائے لیکن میں ایسا نہ کروں گا۔ میں تیری جاں بخشی کر چکا ہوں۔ اور تجھ پر ثابت کرنا چاہتا ہوں۔ کہ دو ٹانگ کے ناطق جانور جب ایک دفعہ قول و قرار کر لیتے ہیں۔ تو اس سے پھرا نہیں کرتے۔ اس کے علاوہ اب مجھے تیرے قتل کی خواہش بھی نہیں ہے۔ جب سے میں تیری فطرت سے واقف ہوں۔ میرے دل میں تیری محبت کا جذبہ موجزن ہو رہا ہے۔ اگرچہ میں مہاتما گاندھی نہیں ہوں۔ کہ ہر جانور کو بھی بھائی سمجھوں۔ اور تجھے "بھیا مچھر" کہہ کے خطاب کروں۔ لیکن میں سمجھتا ہوں۔ کہ میرے اور تیرے درمیان ایک دُور کا رشتہ ضرور ہے۔ تقدیر اور اتفاق نے تجھے اور مجھے آج اس کمرے میں ہمسفر بنا دیا۔ تیری

حرکتوں سے میرے جذبات میں مختلف تغیرات پیدا ہوئے۔ اور میری حرکتوں سے تو نے لطف اُٹھایا۔ دونوں پر ایک دوسرے کا شکریہ واجب ہے۔ اور اس تشکر کی بنیاد اس حقیقت ثانیہ پر قائم ہے۔ کہ ہم دونو جاندار ہیں اور فانی ہیں۔ "معجزہ حیات" اور "رازِ زندگی" ایسی چیزیں ہیں۔ جن میں مَیں اور تو اشتراک رکھتے ہیں۔ مجھے یقین ہے۔ کہ تو اپنے سفر اور منزلِ مقصود سے بالکل آگاہ نہیں۔ لیکن مجھے خوب معلوم ہے مجھے کہاں جانا ہے۔ اگر غور کی نظروں سے دیکھا جائے۔ تو مَیں اور تُو بہت بڑی حد تک ایک جیسے ہیں۔ دونوں چھلاوے ہیں۔ کہ ابھی ہیں اور ابھی نہیں ہیں۔ ہم دونوں اندھیری رات میں سے نکل کر ہستی کی ٹرین کے روشن کمرے میں آنکلے ہیں۔ اور تھوڑی دیر لیمپ کا طواف کرنے کے بعد پھر اُسی رات میں غائب ہو جائیں گے۔ شاید......

اتنے میں باہر سے آواز آئی۔ "پٹھان کوٹ سٹیشن۔ سب مسافر اُتر جائیں" یہ ایک قلی کی آواز تھی۔ میں نے اس کو بُلایا۔ اپنے سوٹ کیس۔ اور بستر کی طرف اشارہ کیا۔ خود ٹوپی سر پر رکھی چھڑی اٹھائی اور موسمِ گرما کی ٹھنڈی اور خوشگوار رات میں باہر نکل گیا!

کمرے کا دروازہ بند کرتے ہوئے میں نے مُڑ کر جو دیکھا۔ تو میرا ہم سفر بدستور لیمپ کا طواف کر رہا تھا!

مکتوبِ گرامیؒ

مفتاحِ خزینۂ ادب، کلکِ حفیظ

مخزن مخزنِ اسرار، مطلع الانوار، تحفۃ الاحرار، سبحۃ الابرار، بنجائیگا کیوں نہ بنجائے حضرت حفیظ جالندھری گرامی کے ہموطن گرامی کے دستِ مخزن کے اڈیٹر ہیں مخزن خوش قسمت ہے مخزن کی دلاویزی کا دائرہ دلفریب ہے۔ مخزن کا اول آخر ہے اور آخر اول۔ مخزن کا اول جوہرِ فرد خان بہادر شیخ عبدالقادر صاحب کا رہینِ منت، اور مخزن کا آخر حضرت ابوالاثر حفیظ کا شرمندۂ احسان۔ گرامی نہ یہ نہ وہ +

اے گرامی بحیرتم چہ کسی — جادو انگیز آتشیں نفسی
منتِ عمرو زید ہاں تا چند — کس خوانِ این و آں تا چند
نظمِ دلکش بخواں بطرزِ دگر — مولدِ تست شہر جالندھر
ذرّہ آتش برستارہ چشمک ریز — خاک جالندھر است مردم خیز (گرامی)

نقّاد

ایک تھا بے وقوف ۔

کچھ عرصہ تک تو وہ امن وامان اور اطمینان سے زندگی بسر کرتا رہا۔ مگر آخر کار اُسے معلوم ہونا شروع ہو گیا۔ کہ سب لوگ اُسے احمق خیال کرتے ہیں +

بے وقوف یہ خیال کرکے بہت ہی سٹپٹایا۔ اُس نے تہیّہ کر لیا۔ کہ جیسے بھی ہو۔ اس خیال کو لوگوں کے دلوں سے نکال دینا چاہیئے +

بہت سوچ بچار کے بعد اُس کے کُند ذہن میں ایک خیال آیا۔ بے وقوف نے کسی تذبذب اور تامّل کے بغیر اُس پر فوراً عمل درآمد شروع کر دیا +

اُسے بازار میں ایک دوست ملا۔ اور ایک مشہور مصوّر کی تعریفیں کرنے لگا +

بے وقوف ایک دم کہہ اُٹھا۔" تم بھی عجیب آدمی ہو .... وہ مصوّر کب کا پُرانا ہو چکا۔ اب اُسے کون جانتا ہے .... واہ تمہیں اتنا بھی معلوم نہیں۔ مجھے تم ایسے سمجھدار سے یہ اُمید ہرگز نہ تھی۔ تم بھی گئے گزرے زمانے کے آدمی ہو"!

دوست بیچارہ کچھ بھوچکا سا رہ گیا۔ اور اُسے بے وقوف کی تائید کے سوا کوئی چارۂ کار نظر نہ آیا +

ایک اَور دوست نے اُس سے کہا۔" میں نے کل شیکسپیئر کی فلاں کتاب پڑھی ہے۔ کیا بتاؤں عجیب کتاب ہے"!

بے وقوف فوراً کہہ اُٹھا۔" وہ کتاب کس کام کی ہے شیکسپیئر کو اب کون پسند کرتا ہے .... مدّت ہوئی ہر شخص اُس کی تصانیف پڑھ چکا ہے .... واہ تمہیں اتنا بھی معلوم نہیں؟ تم بھی اگلے وقتوں کے آدمی ہو"+

یہ دوست بھی ہکّا بکّا رہ گیا۔ اور اُسے بے وقوف کی تائید کرتے ہی بن پڑی +

ایک تیسرے دوست نے بے وقوف سے کہا۔" میرا دوست ج۔ ب۔ ایک لاثانی آدمی ہے۔ میں نے آج تک ایسا مخلص انسان کبھی نہیں دیکھا"!

بے وقوف چھٹتے ہی بولا :" بھئی واہ .... وہی مشہور بدمعاش ---! جس نے اپنے تمام رشتہ داروں سے دغابازی کی - ہر ایک شخص اُسے جانتا ہے - تمہیں اتنا بھی معلوم نہیں - تم بالکل سادہ لوح ہو" +

تیسرا دوست بھی دم بخود رہ گیا - اور اُس نے بھی بے وقوف کی بات میں آکر اپنے "مخلص" دوست کو ترک کردیا +

غرضکہ بے وقوف کے سامنے جس شخص یا جس چیز کی تعریف کی جاتی - بے وقوف اُسی طریقہ سے اُس کی ہجو اور مذمت کرتا +

اس کے ساتھ بعض اوقات وہ ایک حقارت آمیز لہجے میں یہ بھی کہہ دیتا :" اور کیا تم ابھی تک اُن لوگوں پر ایمان رکھتے ہو - جو مستند مشہور ہیں "؟

اس کے دوستوں نے بے وقوف کے متعلق کہنا شروع کیا :" حاسد! کینہ توز! مگر واللہ کیا دماغ پایا ہے"!

اور بعض کہتے :" کیا دہان ہے! ...... خداداد قابلیت ہے"!

اس کا نتیجہ یہ ہوا - کہ ایک مشہور ادبی صحیفے کے مدیر نے - تنقید اور تبصرہ کے لئے اُسے اپنے ہاں ملازم رکھ لیا - اور بے وقوف نے ہر شخص اور ہر چیز پر اپنے اُسی پُرانے انداز میں جرح قدح شروع کردی +

اب وہی بے وقوف جو مستند ماہرین کے خلاف اظہارِ نفرت کیا کرتا تھا - خود ایک مستند شخص بنا بیٹھا ہے - اور مبتدی اُس کا احترام کرتے اور اُس سے خوف کھاتے ہیں - غریب مبتدی اس کے سوا اور کر بھی کیا سکتے ہیں - کیونکہ اگر وہ ایسا نہ کریں - تو اُن پر اگلے وقتوں کے لوگ ہونے کا فتوےٰ عائد کردیا جائے +

سچ ہے بُزدلوں میں بے وقوفوں کی خوب بَن آتی ہے!

(ماخوذ)　　　　بدرالدین

مخزن میں آئندہ ایک حیرت انگیز ناول مسلسل چھپنے والا ہے - یہ ناول پنجاب گورنمنٹ سے سنسر کرایا گیا ہے +

منیجر

تذکرہ نویسوں کی اہم فروگزاشتیں

(ابو العلا ایم۔ اے علی حسرت لکھنوی)

شاید یہ انسانی فطرت میں داخل ہے۔ کہ اپنی پسند اور نفس کی رہنمائی کا ہمیشہ اتباع کیا جاتا ہے۔ اس لئے بعض افعال کی کثرت ضرب المثل اور داخل عادت سمجھی جاتی ہے۔ میری نظر سے جہاں تک تذکرے گزرے اُن سب کا خلاصہ نقائص بھی طوالت کا سبب ہوگا۔ مگر مُشتے نمونہ از خروارے۔ کچھ امور قابلِ ذکر ضرور ہیں۔

بالعموم تذکرہ نویسوں میں یہ بات پائی جاتی ہے۔ کہ جس شخص پر زیادہ توجہ ہوئی۔ اُس کی تعریف کے انبار لگا دئے۔ یہ کوئی ضروری بات نہیں۔ کہ اس سے اُن کو فی نفسہٖ کوئی وابستگی ہو۔ بلکہ فطرتاً ان کا وقار اُن کے دل پر مرتکز ہے یا کلام زیادہ پسندیدہ ہے۔ حالانکہ اہلِ تذکرہ کو لازم ہے۔ کہ شاعر کا صلی حال بغیر کسی رو رعایت کے تحریر کریں۔ عداوت کا اظہار تذکرہ نویسی میں کسی طرح زیبا نہیں۔ اوّل سے آخر تک نیک نیتی ثابت ہونا چاہئے۔ انصاف کا ہر جگہ لحاظ از بس ضروری ہے۔ سب سے بڑا ستم انتخابِ کلام کی وجہ سے نماں ہو جاتا ہے۔ اس میں یا تو یہ ہوتا ہے۔ کہ اگر انتخاب اچھا ہوا تو شاعر کی ذاتی قابلیت پر پردہ پڑ گیا۔ اور اگر بدقسمتی سے بُرا انتخاب ہوا۔ تو اُمیدوں کا خون ہو گیا۔ اس لئے زیادہ مناسب صورت یہ ہے کہ بقدرِ گنجائش پوری پوری غزلیں نقل کر دی جائیں۔ تاکہ ناظرین شاعر کی استعداد کا خود اندازہ کر لیں۔ اور فن شعر کی دستگاہ و رُتبے سے کما حقہٗ ماہر ہو جائیں۔ مگر افسوس ہے۔ کہ تذکرہ نویس ایسا نہیں کرتے۔ یا تو شاعر کو فلک الافلاک پر پہنچا دیتے ہیں۔ یا قعرِ مذلت میں گرا دیتے ہیں + اور اس سے بھی زیادہ بے رحمی وہ فروگزاشت ہے۔ جبکہ بعض قابل ذکر شعراء سے چشم پوشی اختیار کی جاتی ہے۔ اصل میں شاعر کے حالات وکیفیتِ استعداد، و دستور العمل حیات اور وہ واقعات جو معاصرین کے ساتھ پیش آنے ہوں۔ تاریخ ولادت و وفات اس کے مصنفات اور حاکم وقت کا نام وغیرہ ضروری امور درج ہونے چاہئیں۔ اگر شاعر صاحبِ دیوان ہے۔ تو اس کا اظہار کر دینا چاہئے + مگر برخلاف اس کے شاعر کا یہ نام تھا۔ فلاں سے تلمذ تھا۔ اور

اُس کے یہ اشعار ہیں لکھ دئے جاتے ہیں ۔ اور اُسی نظریہ کے ساتھ کسی کے اچھے کلام کا انتخاب اور کسی کا مضحکہ خیز انتخاب کر کے ہجو ملیح کی جاتی ہے ۔ مصنف گلشن بے خار نواب مصطفٰے خاں شیفتہ نے اکثر شعرا اساتذہ کے نام تک لکھنے سے احتراز کیا ہے ۔ اور بعض کے حالات ایک ایک دو دو سطروں میں ختم کر دئے ہیں ۔ اسی طرح بعض کی ضرورت سے زیادہ تعریف کی ہے ۔ خصوصًا مومن خاں کے کلام اور حالات میں تذکرے کا بڑا حصہ صرف کر دیا ہے ۔ اسی طرح مصنف آبِ حیات شمس العلما مولوی محمد حسین آزاد نے اپنے اُستاد ذوق کی تعریفوں کے پُل باندھ دئے ہیں ۔ اور جیسا کہ سُنا جاتا ہے ۔ پہلی اشاعت تذکرے مومن خاں کا تذکرہ ہی ترک کر دیا تھا ۔ لیکن اُن کے بعض خاص احباب نے سمجھایا ۔ کہ تذکرے میں یہ سخت عیب ہے ۔ اس لئے کچھ مختصر سا حال لکھ دیا ۔ حالانکہ معاصرینِ ذوق میں سے تھے اسی طرح غالب مرحوم کے ساتھ جابجا بے انصافی کی گئی ہے ۔ نواب شیفتہ نے تذکرے میں اپنی رائے کو بھی بہت کچھ دخل کیا ہے اور بعض نامور شعرا پر طرح طرح کے الزام لگائے ہیں ۔ بیچارے اماں میاں قلندر بخش جرأت کی نسبت جو کچھ گلفشانی کی ہے ۔ وہ اہلِ نظر سے پوشیدہ نہیں ۔ ارشاد ہوتا ہے ۔ کہ یہ شخص اصول و قوانین شاعری سے بہرہ نہ رکھتا تھا ۔ نغمات خارج از آہنگ گاتا تھا ۔ اور اس کی ناموری کا باعث یہ ہوا ۔ کہ اشعار موافقِ طبائع اوباش و الواط کے کہتا تھا ۔ اس تحریر میں رنگِ رقابت جھلک رہا ہے ۔ یہ دہلی و لکھنؤ کا نہ فیصلہ ہونے والا مسئلہ ہے ۔ اگر سچ پوچھئے ۔ تو جرأت جس قدر خوش فکر و خوش گو تھا ۔ اس کا جواب ہونا مشکل ہے ۔ اس کی نازک خیالی زمانے پر ظاہر ہے ۔ کیسا سخنور اور خوش مذاق شاعر تھا ۔ عاشقانہ رنگ کہنے میں طاق بلکہ شہرۂ آفاق تھا ۔ حُسن و عشق کے معاملات عاشق و معشوق کے راز و نیاز جس شوخی و ادا بندی کے ساتھ کہہ گیا ہے ۔ یہ اسی کا حصہ تھا ۔ جرأت ایسے معاملہ بند شاعر کم گزرے ہیں ۔ چنانچہ اس سے سب کو اتفاق ہے خود شیفتہ صاحب رقم طراز ہیں ۔ ” جو مضامین درمیان عاشق و معشوق کے گزرتے ہیں ۔ اکثر موزوں کرتا تھا ۔ طبیعت ذکی رکھتا تھا ۔ اور اپنے اُستاد حسرت کا فخر تھا “ یہ دیکھنے کی بات ہے ۔ کہ جرأت کے کلام میں رطب و یابس کی بمقابلہ معاصرین بہت کمی ہے ۔ اور گو غزل گوئی میں وہ میر کا اتباع کرتا تھا ۔ مگر میر کی فصاحت اور سادگی کے ساتھ شوخی اور بانکپن کا اضافہ کچھ ایسا کیا ہے کہ خود صاحبِ طرز ہو گیا ۔ اس کا انداز بیان اسی کی ایجاد ہے ۔ اور آج تک اُسی کے لئے خاص ہے ۔ اور جس طرح اُس وقت مقبول خلائق تھا ۔ آج بھی وہی حالت ہے ۔ متاخرین میں نواب میرزا داغ نے وہ رنگ اختیار کیا ۔ اور بہت کچھ کمال کو پہنچایا ۔

چنانچہ مقبولیت کی یہ کیفیت تھی۔ کہ داغؔ کے معاصرین اپنے اپنے رنگ کو چھوڑ کے اُسی رنگ میں غوطہ لگاتے تھے۔ اور اب بھی اس کوشش سے ہاتھ نہیں اُٹھایا گیا +

علیٰ ہذا القیاس سید انشاؔ کی نسبت جو ایک بلند پایہ اور نامور سخنور تھے۔ تحریر فرماتے ہیں "وہ اُن کے کلام کی روش طریقۂ راسخہ پر نہیں ہے۔ اور علم تو اس قدر نہ تھا۔ مگر ہر فن میں کوس لمن الملکی بجاتے تھے۔ اور مشاعرات اور مطارحات سے شعرائے معاصرین کا قافیہ تنگ کر دیا تھا" حالانکہ اُن کے تبحر علمی میں شبہ کرنا تحقیق کے بالکل خلاف ہے۔ وہ علم تازہ اور طبع بلند آوازہ رکھتے تھے۔ ان کا کلام رکاکت و سقم سے بری اور عالی تھا۔ عیب سے بہت زیادہ پاک ہے۔ متقدمین میں جو موجد فنون گزرے ہیں۔ اُن کے دواوین میں اگر دیکھا جائے۔ تو صنائع و بدائع کے متعلق دس پانچ شعر تمثیلاً نظر آتے ہیں۔ لیکن ذرا انصاف کی نظر سے انشاؔ کا کلام مطالعہ کیا جائے۔ تو کوئی تحریر کیفیت سے خالی نظر نہیں آتی۔ نہ کوئی مضمون نادرست ہے۔ ہر غزل مطلع سے مقطع تک پری کی صورت ہے۔ لطفِ بیان۔ محاورے کی نمکینی۔ خوش نما ترکیبیں دل کو بے چین کئے دیتی ہیں۔ علم کے ساتھ طبیعت کی شوخی مزاج کی ظرافت بکثرت تھی۔ کہ جو چاہتے ہیں کہہ جاتے ہیں۔ اور یہ نہیں معلوم ہوتا۔ کہ روزمرہ ہی یہی ہے۔ یا تمسخر کرتے ہیں۔ جو غزلیں یا اشعار با اصول ہیں اُن کا جواب نہیں ہے۔ وہ غزلوں میں تغزّل کے اصول کی پابندی کیوں نہیں کرتے۔ اگر یہ سوال کیا جائے۔ تو وجہ صاف ہے۔ کہ اکثر غزلیں سنگلاخ زمینوں میں ہیں۔ پھر قوافی کا انتخاب اَور زیادہ سخت اختیار کیا گیا ہے ان کا اصول یا قانون کلام یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ کیسا ہی قافیہ ہو۔ اور کیسا ہی مضمون کیوں نہ ہو۔ جس برجستہ پہلو سے نظم ہو جائے ترک نہ کرنا چاہئے۔ قصائد میں بھی یہی باتیں پائی جاتی ہیں۔ کہ جا بجا شوخ مضمون نئی تراش سے لے آئے۔ کہ قصیدے کی متانت اور اصولِ وقار ہاتھ سے جاتا رہتا ہے۔ یہ قوّتِ بیانی۔ خوش فکری اور اور جوشِ مضامین کے سبب سے ہوتا ہے۔ اس سے یہ خیال کرنا کہ ان کی کم علمی اور اصول کی ناواقفیت کے سبب سے یہ باتیں پیدا ہو گئی ہیں۔ سراسر غلط فہمی ہے۔ علوم متداولہ و درسیہ میں وہ خاصی دستگاہ رکھتے ہیں۔ مثلاً یہ پوربی زبان کا مقطع ہے ؎

انشاؔ لکھاں میاں بڑے پھاجل جہین ہیں۔
صدرا پڑھیں ہیں جن سیتی طلبلم آئے کے۔

غالباً یہ لکھنا مبالغہ نہیں کہ ادبی قابلیت کے لحاظ سے سید انشاؔ جیسا جامع حیثیات امیر خسرو اور فیضی کے بعد

ہندوستان کی خاک آج تک پیدا نہ کرسکی کہا جاتا ہے۔ کہ ان کے علم کو شاعری نے اور شاعری کو مسخرے پن نے خراب برباد کیا ہے۔ یہ کہاں تک لحاظ کے قابل ہے۔ اہل نظر سے پوشیدہ نہیں +

میر سوز کے متعلق گل افشانی فرماتے ہیں۔ کہ "اُن کا کلام جادۂ مستقیمہ سے ہٹا ہوا تھا" لیکن حقیقت حال یہ ہے۔ کہ اگرچہ اُن کے کلام میں صنائع و اغراق نہیں پائے جاتے۔ لیکن عجیب شیریں زبان پائی ہے۔ اور یہی غزل کی جان ہے۔ مجلس رنگین کی بعض مجالس اور پہلے تذکروں سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ اُن کا کلام صفائی محاورہ اور لطفِ زبان کے باب میں ضرب المثل ہے۔ فارسی بندشیں۔ اضافات و تشبیہات واستعارات اُن کے ہاں بہت کم۔ لیکن محاورے کا لطف سونے پر سہاگہ ہو رہا ہے۔ اس لحاظ سے اُردو غزل گوئی میں اگر انہیں شیخ سعدی کہا جائے تو بیجا نہیں ہے۔ کیونکہ اگر زبان اسی انداز پر رہتی تو آج اُردو گو شعرا کو اس قدر دُشواری نہ ہوتی اور اُردو نظم میں ہر مضمون کے ادا کرنے کی لیاقت وطاقت پائی جاتی۔ فارسی ترکیبیں مشکل استعارے۔ بعید الفہم تشبیہیں۔ سخت و سنگین وغیر مانوس الفاظ اور بلاضرورت نازک خیالیاں داخل نہ ہوتیں۔ کلام کو رنگین اور استعارہ و تشبیہہ سے بلند کرنا آسان ہے۔ مگر زبان، روزمرہ، محاورے کے ساتھ صاف صاف مطلب ادا کرنا جس کے سُننے سے دلوں پر اثر ہو بہت دشوار اور معراجِ کلام ہے +

مثنوی میر حسن کے متعلق ارشاد ہوتا ہے۔ "قطع نظر بعض بالغز ہائے شاعری سے محاورۂ عوام میں بُری نہیں ہے" یہ الفاظ سحر البیان کی شان رفیع سے بالکل گرے ہوئے ہیں۔ صفائی بندش۔ محاورات کی فصاحت وغیرہ اس میں ایسے اسباب ہیں کہ آج تک کوئی مثنوی اُس تک نہ پہنچی۔ اس قدر دلچسپ بیان ہے۔ کہ اصل واقعہ کا نقشہ آنکھوں کے سامنے کھنچ جاتا ہے۔ اور باوجود ان مجالس کے اصول فن سے ایک شعر بھی ادھر سے اُدھر نہیں ہونے پایا۔ محض قبولِ عوام کا درجہ اُسے نہیں ملا ہے۔ بلکہ خواص نے اُسے پسند فرمایا۔ اور اُس کی توصیف میں رطب اللسان ہیں + موازنۂ انیس و دبیر میں مولوی شبلی نعمانی گلشن بہار کے مضمون کو اپنے الفاظ میں یوں ادا کرتے ہیں "میر حسن واقعہ نگاری کی وسعت میں ابتذال اور عامیانہ بول چال کی پروا نہیں کرتے" یہ میر حسن کے انتہائے کمال کی کس قدر ناقدری اور کتنا بدترین داغ بدنمائی ہے میر حسن کی خوش بیانی۔ واقعات کی دلچسپی فطری مذاق میں شرابور ہے۔ اس بیان کی صفائی۔ محاورات کا لطف ضرب المثل کی کثرت و لطافت۔ خوب صورت بندش۔ شوخیٔ مضمون۔ اثر۔ طرز ادا۔ کی نزاکت حدِ تعریف سے باہر ہے۔

آج کس کا مُنہ ہے جو تمام خوبیوں کے ساتھ ایسے پانچ شعر بھی نظم کر سکے۔ یہ مثنوی بالکل اصول فطرت کے موافق ہے۔ عاشق و معشوق کے دلوں میں پیدا ہونے والے جذبات الفاظ کی مصوری سے ادا کئے گئے ہیں۔ صاحب تذکرۂ گلستانِ سخن نے لکھا ہے۔ کہ شیخ امام بخش ناسخ بے معنی گو ہے۔ اور اس کے اشعار مہمل ہیں۔ مگر یہ الفاظ بعید از ملائم اور دائرۂ تہذیب سے خارج ہیں۔ اپنے زعم میں ازالۂ ثقالت طعن اور تخفیف شدّتِ اعتراض کے لئے یوں بیان کیا ہے۔ گویا کنایۃً اظہارِ خیال کیا ہے۔ ارمغانِ گوکل پرشاد میں محمد عیسٰے تنہا دہلوی کا مصحفی کو شاگرد اور مصحفی کا شاگرد ناسخ کو قرار دیا ہے۔ منشی شیو پرشاد بھی مقر ہے۔ کہ شیخ امام بخش ناسخ نے سرقۂ مضامین سے متقدمین کے فارسی دیوانوں کو خراب کیا ہے۔ اور آسیر اکبر آبادی نے اپنے تذکرہ میں شیخ صاحب مغفور کے ہر شعر کے مقابل ایک شعر لکھ دیا ہے۔ ایک دُشمنِ کمال نے اپنے دیوان میں ناسخ کو خود مُنڈا اور بے مرشدا لکھ دیا ہے۔ بہرنوع ایسی معتمد ہستی کے متعلق اس قدر متضاد و مختلف بیانات صاف بتاتے ہیں۔ کہ نفس کے بندے انصاف سے قطع نظر کر کے چاند پر خاک ڈالنا چاہتے ہیں۔ ناسخ کا سا اعتبار کسے نصیب ہوا۔ مخاصمین عاجز ہو کے اور اپنے اُستادوں کی زبانیں ترک کر کے ناسخ کے قدموں پر جھکے طلبِ فیض و اکتسابِ زبان حاصل کر رہے ہیں۔ ناسخ ہی کے دواوین کا فیض ہے۔ کہ زباں داں بن گئے۔ ان کے اشعار صحیح المذاق اور اہل علم کی زبانوں پر مذکور اور سخنوروں میں مشہور ہیں۔ ناواقفانِ کوچۂ شعر فہمی اُن کے معنی خیز اشعار اور صحیح المعانی کو بے معنی کہہ کے ناوانوں کو دھوکا دیتے ہیں۔ کیونکہ ادراک و فہم سے دُور ہیں۔ بالعموم ناسخ کا کلام شاعری کے ظاہری عیوب اور استقام لفظی سے پاک ہے۔ اصول کبھی ہاتھ سے نہیں جانے دئے۔ صائب کے رنگِ تشبیہہ و تمثیل کو اپنی صنعت مانوس و جدید سے ترکیب دے کے وہ خوبیٔ بیان پیدا کی۔ کہ بعض موقعہ پر بیدل و ناصر علی کا انداز بیان پیدا ہو گیا ہے۔ اُردو میں صاحب طرز قرار پائے۔ صحیح معنوں میں وہ ناسخ ہیں۔ کیونکہ ناہموار طرزِ قدیم کو نسخ کیا ہے۔ اُن کی طرف سرقۂ مضامین کی نسبت کرنا اپنی نادانی کا اظہار ہے۔ ایسا صاحبِ کمال و اعتبار جس کی تصانیف کمالِ نازک خیالی اور مضامین عالی پر مبنی ہوں۔ وہ سرقہ کا قصد کر سکتا ہے۔ توارد مضمون سے کوئی بشر خالی نہیں۔ لہذا جزئی باتوں پہ توجہ تحصیل حاصل ہے۔ نواب شیفتہ خیال بندی و موثر گافی کو پسند کرتے تھے۔ طبیعت مشکل پسند تھی۔ اس بنا پر وہ ایسے کلام و زبان کے مدّاح۔ اس لئے ناسخ و آتش کو رُتبۂ شاعری میں ہمپایہ نہیں مانتے۔ حالانکہ دونوں صاحبِ کمال ہیں۔ اور اپنے اپنے رنگ میں

جواب نہیں رکھتے۔ البتہ طبائع مختلف ہیں۔ ناسخ مضمون دقیق کی طرف مائل ہیں۔ شوکت الفاظ۔ بلند پروازی۔ نازک خیالی بہت ہے۔ لیکن اثر کم ہے۔ خواجہ صاحب کلام کی سادگی۔ محاورے کی صفائی کو پسند فرماتے ہیں۔ وہ سیدھی بات کو پیچ نہیں دیتے۔ استعارات وتشبیہات قریب الفہم کہتے تھے۔ جسے سُن کے دل پر اثر پڑتا ہے*

نواب شیفتہ نظیر اکبر آبادی کے بارے میں لکھتے ہیں۔"اس کے شعر بازاریوں کے زبان زد ہیں۔ باعتبار ایسے اشعار کے اس کا شمار شعرا میں نہیں ہوسکتا۔ مگر ہم کو کہنا پڑتا ہے۔ کہ نظیر کے ذہن رسا اور مشق سخن کا یہ عالم ہے۔ کہ مواجِ طبیعت سے متلاطم دریا کی طرح روانی پائی جاتی ہے۔ کتنی ہی سخت وسنگلاخ زمین کیوں نہ ہو۔ اس کا سمندِ فکر پامال کرنے میں عاری نہ تھا۔ نیچر کے مناظر دکھانا اس کا اصل اصول اور خیالی معرکہ آرائیوں پر وہ اس کو ترجیح دیتا ہے۔ فی الحال نظیر کا رنگ ہر دلعزیزی میں روز افزوں ترقی کر رہا ہے۔ اور یہ صرف انگریزی تعلیم کا اثر ہے۔ کہ دلوں کو قدرتی مناظر اور واقعات سے زیادہ وابستگی ہوتی جاتی ہے۔ دُنیائے اُردو میں ایسے شخص کو نظیر کے کلام میں اپنے مذاق کے موافق کچھ باتیں مل جاتی ہیں۔ اور غنیمت سمجھ کے وہ اس کی قدر کرتا ہے۔ لیکن جس کو صاحب گلشنِ بے خار اصل شاعری قرار دیتے ہیں۔ ایسی ایک بات بھی نظر نہیں آتی۔ اور اُن کی شاعری دن بدن بے کارسی ہوتی جاتی ہے۔ علامہ شبلی نے موازنۂ انیس و دبیر میں نظیر کے کلام کو سُوقیانہ ومبتذل قرار دیا ہے۔ اور اس کی حقیقت پر کوئی توجہ نہیں کی۔ کہ اپنی قادرالکلامی سے جو کہنا چاہتا ہے۔ کس صفائی سے کہہ جاتا ہے۔ اور سُننے والا محظوظ ہوتا ہے۔ اور جن لوگوں کو صاحب فن وسخنور مانا ہے۔ وہ جس چیز کا ذکر کرتے ہیں۔ اُس کی بُرائی بھلائی کو ظاہر کرنے سے عاجز ہیں۔ بلکہ اس کے مشابہ ایک اور شئے کا ذکر کرتے ہیں۔ جسے ایسی جگہ پر اچھا یا بُرا سمجھ چکے ہیں۔ بلکہ اس کے لوازمات کو شئے اوّل پر لگا دیتے ہیں۔ جس کی بعید الفہمی اور شدّت نے کلام کو خیالی باتوں سے شمع توہمات کا فرضی فانوس بنا دیا ہے۔ بہرنوع اگر بحث کی جائے تو بغیر رورعایت کے ہو۔ محاکمہ طرفداری کے ساتھ نازیبا ہے۔ تذکرہ نویسی عمدہ بات ہے مگران نقائص سے پرہیز تذکرہ میں چار چاند لگا دیتا ہے*

محمد فاتح قسطنطنیہ کے دربار میں اطالوی مصوّر

(از جناب مولوی محمد عبد اللہ صاحب چغتائی)

سنہ ۵۲ھ میں امیر معاویہؓ کی خلافت میں قسطنطنیہ کی جنگ ہوئی۔ جس میں حضرت ایوب انصاریؓ جیسے صحابی شہید ہوئے۔ جن کا مزار اب تک مرجع خاص و عام اور انتقام لینے والی قوموں کے لئے آرام حرام کرنے کا موجب بنا ہوا ہے۔ اور اُس وقت کے جغرافیۂ اسلام کی حدود کا پتہ دیتا ہے۔

اس غزوے کے بعد سلطان محمدؒ ثانی کا زمانہ آیا۔ جس نے سنہ ۸۵۷ھ میں قسطنطنیہ کو از سر تو کامل طور پر فتح کر لیا اور اسے اپنا دار الخلافہ قرار دیا۔ اُس وقت سے آج تک ترکی سلطنت کی جو صورت بھی نظر آتی ہے۔ اُسی وقت کا بیج بویا ہوا ہے۔ سلطان محمدِ ثانی اپنی جنگی قابلیت کے لئے تو مشہور رہے ہی۔ مگر اُسے فنون لطیفہ سے خاص شغف تھا۔ چنانچہ اُس کے دربار میں شعر و شاعری کے چرچے رہتے تھے۔ خود سلطان اس فن میں دستگاہ رکھتا تھا۔ اور اُس کے کلام کا ایک مختصر مجموعہ ترکی زبان میں اب بھی موجود ہے۔ جو کچھ عرصہ ہوا جرمنی میں طبع ہو چکا ہے۔ جس کا ایک نسخہ احقر نے اپنے ملک الشعرا[1] کی خدمت میں ہدیۃً پیش کیا تھا۔ اس کے مطالعہ سے یہ کسی طرح معلوم نہیں ہوتا۔ کہ یہ کسی غازی کا کلام ہے۔ ایسے جذبات کا شائبہ تک نہیں جن سے یہ اُس ہستی کا کلام ظاہر ہو جسے تاریخ میں فاتح قسطنطنیہ ہونے کا فخر حاصل ہے۔ بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس نے شاعری کو اپنے لئے وقت بے وقت کی غمگساری کا ذریعہ بنا لیا تھا۔

سلطان کے دربار میں دُور دراز کے لوگ بلا تفریق مذہب و ملت جمع تھے۔ مختلف ممالک کے سفیر تحائف لے کر باریاب ہوتے تھے۔ ایک مرتبہ وینس (اٹلی) کے سفیر نے خاص طور پر اپنے مُلک کے مشہور مصوّر "گیوٹی بیلینی" کی چند دلاویز تصاویر پیش کیں۔ اگرچہ اسلام میں تصاویر ممنوع ہیں۔ مگر ترک اعظم کے

[1] علامہ اقبال (ایڈیٹر)

دل پران کا گہرا اثر ہوا۔ اُس نے اس صنعت سے بے حد خوش ہو کر خواہش ظاہر کی۔ کہ مصوّر ترکی دربار میں حاضر کیا جائے۔

وینس کے مشہور مصوّر "جوکوپو بیلینی" کے دو فرزند تھے۔ گیوّنی بیلینی، اور جنٹائل بیلینی۔ جن میں متاخر الذکر بڑا لڑکا تھا۔ دونوں نے اپنے باپ سے مصوّری کی تعلیم اور اُس میں کمال اور خوب نام وری حاصل کی تھی۔ جب سلطان محمد کا پیغام جو اُس وقت کی یورپی ریاستوں کے لئے بمنزلۂ فرمان تھا۔ وینس پہنچا۔ تو حکومت نے جنٹائل کے لئے فیصلہ کیا۔ کہ اسے قسطنطنیہ بھیج دیا جائے۔ اطالیہ کا مشہور مصوّر تذکرہ نویس جا رج دیساری (۱۵۱۲ء-۱۵۷۴ء) اس واقعے کے متعلق یوں رقم طراز ہے:-

"وینس کی حکومت نے یہ خیال کرتے ہوئے۔ کہ گیوّنی عمر کے خاص طبقے تک پہنچ چکا ہے اور اس کے بھیجنے سے کوئی مفید نتیجہ بھی برآمد نہ ہوگا۔ مزید براں ایسے شخص سے اپنے شہر کو محروم نہ کیا جائے۔ خصوصاً ایسی حالت میں۔ جب کہ وہ وینس کے کونسل ہال میں تصاویر بنانے میں مصروف ہے۔ آخر یہ فیصلہ کیا۔ کہ اُس کے برادر جنٹائل کو اس کی جگہ روانہ کیا جائے۔ اور یہ گیوّنی کی جگہ سلطان کو ویسا ہی خوش کرے گا۔

حکم ملنے پر جنٹائل ترکی جانے کے لئے تیار ہو گیا۔ اور رؤسائے وینس نے اُسے نہایت شان سے اپنے خاص ملکی طریق پر قسطنطنیہ کی طرف الوداع کہا۔ جب وہاں پہنچا تو سفیر نے اُسے سلطان کے حضور پیش کیا۔ اور اس کا استقبال نہایت عزّت کے ساتھ کیا گیا۔ یہاں کے مراسم اُس کے لئے بالکل نئے تھے۔ جن سے وہ گھبرایا۔ اُس نے سلطان کے حضور عمدہ اور بے نظیر تصویر پیش کی۔ جسے سلطان نے کمال اشتیاق سے پسند فرمایا۔ سلطان اس امر کو بڑی مشکل سے ممکن محسوس کر کے متحیر ہوا۔ کہ فانی انسان کے اندر بھی قدرتی اشیاء کو نہایت خوبی سے تصویر کا جامہ پہنانے کی ایسی قدرت ہے"!

قسطنطنیہ میں آئے جنٹائل کو ابھی تھوڑا ہی عرصہ ہوا تھا۔ کہ اُس نے سلطان محمد ثانی کی تصویر بنائی۔ جو اس قدر مشابہ تھی کہ کرامت شمار کی گئی۔ سلطان نے اُس کے فن کے بہت سے کمالات دیکھ کر دریافت فرمایا۔ کہ آیا مصوّر خود اپنی تصویر بنانے کی جرأت بھی کر سکتا ہے؟ جس پر جنٹائل نے جواب میں عرض کیا۔ کہ تھوڑا عرصہ ہوا میں نے اپنے خدوخال

کو آئینے کے ذریعے مصوّر کیا ہے ۔ یہ تصویر بھی سلطان کے سامنے لائی گئی۔ وہ بہت خوش ہوا۔ اور ششدر رہ گیا۔ اگر مصوری ممنوع نہ ہوتی جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے۔ تو سلطان جنٹائل کو کبھی جانے نہ دیتا۔ مگر ڈرتا تھا۔ کہ مبادا عوام میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ اور کوئی دوسری صورت اختیار کرلیں۔ اُس نے ایک روز مصور کو طلب کر کے اُس کی مصورانہ مروت کا شکریہ اور اُس کی قابلیت کا کماحقہٗ اعتراف کیا۔ پھر فرمایا کہ جا او واعی تحفہ اُسے مرغوب ہو بتائے۔ تاکہ مصور کی خواہش پوری کی جائے۔ جنٹائل نرم دل اور صاف گو آدمی تھا۔ اُس نے ایک امر کے سوا کوئی خاص چیز طلب نہ کی۔ اور وہ یہ تھی۔ کہ سلطان اپنی رضامندی سے حکومتِ وینس کے پاس میرے لئے مادرِ وطن کی سفارش کردیں۔ اُس کی خواہش کے مطابق ہر ممکن طریق پر فرمان لکھ دیا گیا۔ جس کے بعد وہ نہایت عزت و احتشام سے بیش قیمت تحائف اور نواب بے (نائٹ) ہڈ) کے خطاب سے رخصت کیا گیا ۔

ترکی تذکرہ نگار مصطفٰی اختر علی آفندی ۱۵۸۸ء میں اپنی تصنیف "مناقب ہنرداں کے درمیان وینس کے تین مصوّروں کا ذکر کرتا ہے۔ جن میں سے ایک سنان بے تھا۔ جسے سلطان محمد ثانی کے ہاتھوں بہت انعام واکرام ملا تھا۔ جب جنٹائل وینس سے ترکی کی طرف روانہ ہوا تھا۔ تو اُس کے ہمراہ دو اور معاون مصور بھی تھے۔ بعض محققین نے جنٹائل ہی کو سنان بے شمار کیا ہے۔ ڈاکٹر مارٹن نے اپنی کتاب "پرشین۔ انڈین اور ٹرکش پینٹنگ" میں بھی ذکر کیا ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو جنٹائل ہی سنان بے ٹھیرتا ہے۔ ترکی تذکرہ نگار نے بیان کیا ہے۔ کیونکہ اسی کو سلطان کے ہاتھ سے بہت سا انعام واکرام حاصل ہوا تھا۔ اور وینس کے جن مصوروں کی طرف اشارا کیا گیا ہے۔ وہ جنٹائل ہی کے ہمراہ ترکی پہنچے تھے۔ اور سلطان نے مصور کو جو خطاب دیا تھا۔ ممکن ہے اسے سنان بے سے تعبیر کیا گیا ہو۔

اس سے آگے ویساری بیان کرتا ہے:-

"بے انتہا نوازشوں کے ضمن میں جو سلطان نے جنٹائل پر کیں ایک طلائی ہار ہے۔ جو خاص ترکی طریق پر بنا ہوا تھا۔ جس کا وزن قریباً ۲۵۰ تولے تھا۔ یہ ہار اس کے گلے میں ڈالا گیا تھا۔ اور اب تک وینس میں مصور کی میراث میں موجود ہے۔ قسطنطنیہ سے جنٹائل کی واپسی نہایت خوش نصیبی کی انتہا تھی۔ جب وہ وینس پہنچا۔ تو اُس کے بھائی گیونی نے تمام روسائے وینس کو

ساتھ لے کر اس کا استقبال کیا۔ اور وینس کے باشندے سلطانِ اعظم کے بخشے ہوئے اعزاز واکرام پر نازاں وخوش وخرّم تھے وہ سیدھا حکومتِ وینس کی خدمت میں باریاب ہونے کا فریضہ بجالایا۔ جہاں اُس کی بے انتہا عزّت کی گئی۔ اور مبارکباد دی گئی۔ کیونکہ وہ سلطان محمد کی خوشنودی کا باعث ہوا تھا۔ آخر حکومتِ وینس نے سلطان کے فرمان کے مطابق دوسو ۲۰۰ سکّۂ وینس اُس کے اخراجات کے لئے منظور کئے۔ جو اُسے آخر عمر تک ملتے رہے۔ جنٹائل نے قسطنطنیہ سے واپس آکر تھوڑی ہی تصویریں بنائیں اور ۸۰ برس کی عمر میں پیمانۂ عمر لبریز ہوگیا سن ۱۵۰۷ء میں رحلت کی۔ اور اپنے بھائی گیونی کے ہاتھوں کلیسا سن گیونی ای پالاؤ میں اپنے مدفن کو زینت دی" +

سلطان کی مذکورۂ بالا تصویر آجتک محفوظ ہے۔ سب سے پہلے یہ تصویر کوزن زینو (Cosen Zeno) میں موجود تھی۔ جسے برطانوی سفیر قسطنطنیہ سرہنری لیارڈ مشہور ماہر حضریات وینس سے منجملہ چند اور بے نظیر تصاویر کے خرید لایا تھا۔ ان میں سے دو تصویریں اسی مصور جنٹائل کی تھیں۔ ایک تو وہی سلطان ممدوح کی۔ اور دوسری "پرستش ماجی" کی تھی۔ سفیر مذکور کا یہ مرقع دُنیا کے بہترین مرقعوں میں شمار ہوتا ہے۔ اور اس پر جتنا فخر کیا جائے کم ہے۔ اُس نے نہایت فراخ دلی اور عالی حوصلگی سے پانچ تصویروں کا یہ مرقع نیشنل گیلری کو ہبہ کر دیا۔ کاش ہمارے ہاں بھی ایسا جذبۂ صادقہ پیدا ہوجائے اور بہت سے قومی عجائب خانے ملک کی تربیت کے لئے قائم ہوجائیں +

جو شخص مصوری سے ذرا بھی لگاؤ رکھتا ہے۔ وہ تصویر کو دیکھ کر اندازہ کرسکتا ہے۔ کہ ترک اعظم کے چہرے پر حقیقی جذبۂ استقلال قوتِ ارادی۔ ذوقِ عمل مکمل طور پر نمایاں ہیں۔ جنٹائل کے ہمعصر لیونارڈی ڈاونسی کی مشہور تصویر "مونالیزا" کے لبوں پر محض تبسم ہی رقصاں ہے۔ جو اس تصویر کی اصل خوبی سمجھی گئی ہے۔ مگر سلطان کی تصویر اُس کی تمام خوبیوں کا مرقع ہے + جنٹائل نے سلطان کی تصویر بنا کر اُسے فنون کی دُنیا میں بھی غیر فانی کر دیا ہے۔ جیسا کہ وہ تاریخ عالم میں ایک فاتح اعظم کی حیثیت رکھتا ہے۔ مگر یاد رہے کہ جنٹائل نے اتنی عظیم الشان شخصیت کو مصوّر کرکے محض اُسے ہی غیر فانی نہیں کیا بلکہ دُنیا سے خراج تحسین وصول کرکے اپنے آپ کو بھی غیر فانی بنالیا۔ ورنہ سلطان تو پہلے ہی فاتح اعظم ہونے کی حیثیت سے مشہور ومعروف تھا +

قسطنطنیہ کے قیام نے جنٹائل پر گہرا اثر کیا۔ اس کے فن میں ایک خاص اضافہ ہو گیا۔ اس نے وینس میں واپس لوٹ کر جس قدر تصاویر تیار کیں اُن میں خصوصیت سے ترکی شرفا کے لباس و عادات نمایاں کئے جو اُس نے ترکی جلسوں جلوسوں میں اور درباری اجتماعات کے ملاحظے سے اپنے تخیل میں بسائے تھے اس کی بعض تصاویر "پرستش ماجی" "فلوس سرپیازہ سن مارکو" "سینٹ مارک کا سکندریہ میں وعظ کہنا" اور خاص طور پر وزیر اعظم قسطنطنیہ کا استقبال سفیر وینس" غرض یہ سب کی سب قسطنطنیہ کی یادگار مرقع تھیں جو آج مختلف عجائب خانوں اور تصویر گھروں میں موجود ہیں۔ اس کا اثر دورِ احیاء کے مصوّروں پر بھی ہوا جسے بہت سے محققین نے تسلیم کیا ہے۔ یعنی جنٹائل کی اس شرف یابی سے اطالوی مصوّری نے وہ مشرقی اثر قبول کیا ہے جو اس سے قبل موجود نہ تھا ✣

خطاب بہ دل

اے طالبِ حقیقت و قفِ مجاز ہو جا
نقشِ خودی مٹا دے دانائے راز ہو جا

اے بے خبر یہی ہے رازِ سکونِ ہستی
راہِ طلب میں وقفِ سوز و گداز ہو جا

کھل جائے گی حقیقت اسرارِ زندگی کی
دنیائے عاشقی کا سربستہ راز ہو جا

نیرنگیٔ جہاں میں ہو محوِ حسنِ مطلق
دیر و حرم کے جھگڑوں سے بے نیاز ہو جا

چاہے جو سر بلندی مثلِ ہلالِ گردوں
محوِ نیاز ہو جا گردن فراز ہو جا

رحمت کے بادلوں سے موتی برس رہے ہیں
او معصیت کے پتلے دامن دراز ہو جا

خاموش ہیں فضائیں اے مطربِ حقیقت
رقصاں ہو ذرّہ ذرّہ یوں نے نواز ہو جا

اے درد حد سے بڑھ جا اے سوز خاک کر دے
اے دل حمیدِ مضطر کا چارہ ساز ہو جا

عبدالحمید۔ حمید۔

شہزادی کا معمہ

شہر کی فصیل میں گزرنے سے پہلے قلعہ پر قبضہ کرنا پڑے گا

جب عبدالرحمٰن نے تین معرکہ آرا حملوں کے بعد ہسپانیہ کو مطیع و منقاد کرلیا۔ تو عربوں کا ایک جرار لشکر ساتھ لیا اور بڑھ کر اشبیلیہ کے سامنے ڈیرے ڈال دئے۔ جو شاہ سانکو کی بیٹی ملکہ کیتھرائن کے قبضے میں تھا +

ملکہ کیتھرائن دعوے دار تھی۔ کہ چونکہ گزشتہ پچاس سال سے میرا باپ بالکل خودمختار فرمانروا رہا ہے۔ اور اُس نے مسلمانوں کو خراج ادا نہیں کیا۔ اس لئے نہ تو میں خراج دوں گی۔ نہ عبدالرحمٰن کی اطاعت و ماتحتی قبول کروں گی +

بادشاہ نے رسد و رسائل کی روک تھام کے خیال سے شہر کا محاصرہ کرلیا۔ اور کیتھرائن کے پاس پیغام بھیجا۔ کہ اطاعت قبول کرلو۔ اگر ایسا نہ کرو گی۔ تو اشبیلیہ کی اینٹ سے اینٹ بجا دی جائے گی۔ شہر میں لوٹ مچے گی۔ اور اس طرح برباد کردیا جائے گا۔ کہ آنے والی نسلیں وہم و گمان میں بھی اس کا نام و نشان نہ ڈھونڈھ سکیں گی +

جس وقت کیتھرائن کے پاس یہ پیغام پہنچا۔ وہ اپنے منقش دریچہ کے سامنے مسند پر فروکش تھی۔ سُنہری شعاعیں دریچے میں سے چھن چھن کر اُس کے خوبصورت بالوں سے کھیل رہی تھیں +

اُس نے جواب دیا۔ "غازی بادشاہ سے کہہ دو۔ کہ اگرچہ آپ بادشاہ ہیں۔ مگر میرے بادشاہ نہیں۔ ہم سب مسلح ہیں۔ ہمارے پاس نامور بہادر موجود ہیں۔ یہ بھی بتا دو۔ ہمارے پاس خورونوش کا اس قدر سامان موجود ہے۔ کہ آپ سارے ہسپانیہ میں سالہا سال تک جمع نہیں کرسکتے +

یہ کہہ کر وہ چپ ہوگئی۔ قاصدوں کے سردار نے مؤدب ہوکر عرض کیا:-

"کیا یہی پیغام ہے؟"

"نہیں ابھی باقی ہے۔ بادشاہ سے کہہ دو۔ کہ شاہ اشبیلیہ کی شہزادی قلعہ پر حکومت کرتی ہے"

قاصدوں کے سردار نے پھر مؤدب ہو کر پوچھا۔ "کیا سارا پیغام یہی ہے"؟

کیتھرائن ایک لمحہ خاموش رہی اور پھر بولی: "ابھی باقی ہے۔ بادشاہ سے کہہ دو۔ کہ آپ کو شہر کی فصیل میں گزرنے سے پہلے قلعے پر قبضہ کرنا پڑے گا"

قاصدوں کا سردار ماتھا سکوڑ کر مسکراتا ہوا بولا: "ملکۂ عالم گستاخی معاف یہ کس طرح ہو سکتا ہے؟ قلعہ ایک اونچی چٹان پر واقع ہے۔ اس کے اردگرد شہر بستا ہے۔ اور شہر کے گرد فصیل ہے۔ بادشاہ شہر سے پہلے قلعے کو کس طرح فتح کر سکتا ہے"؟

کیتھرائن نے اپنی لانبی پلکیں اس طرح اُٹھائیں گویا وہ اس سوال پر ناراضگی کا اظہار کر رہی تھی:-

"تم پیغام لائے ہو تاویل کرنے نہیں آئے" قاصد کو عذر پر آمادہ دیکھ کر وہ پھر بولی:-

"سامنے سے چلے جاؤ۔ اور جو کچھ اشبیلیہ کی شہزادی نے کہہ دیا ہے۔ اپنے بادشاہ سے کہہ دو"

قاصد عبدالرحمٰن کے پاس لوٹ آئے۔ اور کیتھرائن کا پیغام گوش گزار کر دیا۔ بادشاہ غضبناک تھا۔ اُس نے پیغام کے پہلے حصے کو زیادہ توجہ سے سُنا تھا۔ اور آخری حصہ نظرانداز کر دیا تھا۔

اُس نے اشبیلیہ پر تین دن تک حملہ جاری رکھا۔ کیتھرائن کے بہادروں نے مسلمان مجاہدوں کا پر زور مقابلہ کیا۔ جس سے عبدالرحمٰن کے لشکر کو بے حد نقصان پہنچا۔ بہادرانِ اشبیلیہ کے حوصلے بڑھ گئے وہ شہزادی کے جواب سے پورے مطمئن تھے۔ اور جانتے تھے۔ کہ جو پیغام اشبیلیہ کی مالکہ نے دیا ہے بالکل درست ہے۔ وہ اُس کے باپ کے نمک خوار تھے۔ اس لئے جاں نثاری کرنے کو اپنا ایمان جانتے تھے۔

جب تین روز کا متواتر حملہ ناکام ثابت ہوا۔ تو بادشاہ فوجوں کو شہر پناہ کے اور زیادہ قریب لے آیا۔ اور تین ماہ تک خاموشی سے محاصرہ کئے پڑا رہا۔ اُس نے کیتھرائن کے پاس دوبارہ پیغام بھیجا۔ اور کہوا دیا۔ کہ یاد رکھو میں اپنے عہد حکومت کا نصف حصہ اس تسخیر پر صرف کر ڈالوں گا اگر اب بھی تم اطاعت قبول کر لو۔ تو علاوہ دوسری مہربانیوں کے تمام املاک تمہیں واپس کر دیئے جائیں گے اور اگر اسی ضد پر اڑی رہیں۔ تو..........

کیتھرائن نے جواب دیا۔ "بادشاہ سے کہہ دو۔ کہ آپ قلعے پر فتح حاصل کئے بغیر شہر کے اندر

داخل نہیں ہو سکتے"۔ اس جواب کے علاوہ قاصدوں کو اَور کوئی جواب نہ ملا +

مگر یہی جواب سُن کر بادشاہ کے غصّے کی کوئی حد نہ رہی۔ وہ ہونٹ چبا کر بولا "اُس کے بہادروں پر خدا کی لعنت ہو"۔ اُس نے قاصد سے سوال کیا۔ "آیا اس ضدن شہزادی کے ہوش و حواس درست ہیں!"

قاصد نے مؤدبانہ عرض کی۔ "جہاں پناہ۔ بالکل درست ہیں۔ اگرچہ عالی جاہ اُس کے ساتھ شریفانہ برتاؤ رکھتے ہیں۔ لیکن اس قسم کا جواب کسی عورت سے غیر متوقع ہے" +

بادشاہ نے قاصد سے کہا۔ "مابدولت تم سے اس معمّے پر گفتگو کرنا پسند نہیں کرتے۔ رُخصت ہو جاؤ اور دوسرے ملاقاتیوں کو آنے دو" +

دوسرے ملاقاتیوں سے مل لینے کے بعد۔ بادشاہ نے تنہائی میں اس معمّے پر غور کرنا شروع کیا لیکن وہ اس کے حل کرنے میں ناکام رہا۔ حتّٰی کہ اس کا دماغ درد کرنے لگا۔ اب اُس کے غصّے کی کوئی حد نہ تھی +

اُس نے پھر جارحانہ اقدام کا حکم دیا۔ مگر پیشتر کی طرح اب بھی کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ بادشاہ نے تیسری بار قاصد کو بھیجا۔ مگر کیتھرائن نے پھر وہی جواب دیا۔ جو پہلے دے چکی تھی +

بادشاہ جھنجلا کر بولا "یہ کام جنّات کی فوج کے سوا اور کوئی نہیں کر سکتا"۔ وہ کھسیانہ ہو رہا تھا۔ اگر اُسے یہ خیال نہ ہوتا۔ کہ یہ ناکامی اُسے اپنی رعایا کے سامنے حقیر اور فوج کے سامنے بُزدل ثابت کر دے گی۔ تو وہ شہر اشبیلیہ پر قبضہ کئے بغیر واپس لوٹ جاتا۔ وہ گومگو کی حالت میں پڑا ہوا تھا۔ کیونکہ واپس لوٹنے میں بدنامی کا خوف تھا۔ تو دوسری طرف ایک لشکرِ جرّار کی سلامتی اور مقام کی نزاکت کا بوجھ ناقابلِ برداشت بن رہا تھا +

طرّہ یہ کہ قلعے کی فوج رنگ رلیاں منا رہی تھی۔ شہزادی کے سپاہی کھانا کھا چکنے کے بعد ہڈیاں محاصرین پر پھینک دیتے تھے۔ اگرچہ قلعے والوں کے لئے یہ طرزِ عمل مسرّت بخش تھا۔ مگر اس سے محاصرہ کرنے والے بہادروں کی سخت توہین ہوتی تھی +

اس دوران میں شہزادی کیتھرائن اپنے منقش دریچے کے سامنے اپنے مصاحبوں اور سہیلیوں کے ساتھ فروکش ہوتی۔ سورج کی زریں کرنیں اُس کے بالوں سے اٹکھیلیاں کرتیں۔ وہ کبھی مسکراتی کبھی آہیں بھرتی۔ شاید اُسے یہ فکر لاحق ہو گئی ہو۔ کہ غازی کا آئندہ طرزِ عمل کیا ہو گا۔ یا وہ میرے معمّے کو کب سمجھے گا!"

بادشاہ کی فوج میں ایک شخص غازان نامی پرہیزگاری، بہادری اور خوش طبعی میں بہت مشہور و معروف تھا۔ وہ بہادر بھی تھا۔ اور بزم آرا بھی۔ ان ہی کمالات نے اُسے بادشاہ کا قرب حاصل کرنے میں بہت مدد دی تھی +

شہزادی کیتھرائن کا پیغام غازان نے بھی سن لیا تھا۔ کیونکہ شام کی نماز کے بعد جب عرب سپاہی اپنے خیموں کے آگے آگ جلا کر بیٹھتے۔ تو اکثر اس معاملے پر گفتگو کیا کرتے تھے + غازان سب کی باتیں سُنتا۔ اور ہاں میں ہاں ملا دیتا۔ وہ دانشمندانہ انداز سے سر ہلا دیا کرتا۔ اور اپنی زبان بند رکھتا + کسی فردِ بشر نے اُسے ملکہ کیتھرائن کے معمّے کے متعلق بات چیت کرتے نہیں سُنا تھا۔ لیکن اس کا ذاتی عقیدہ یہ تھا۔ کہ شہزادی کا پیغام جنگجویانہ نہیں بلکہ صلح جُویانہ ہے +

ایک شام بادشاہ اپنی بارگاہ میں اس معمّے کو حل کرنے سے تنگ آکر کشمکش و پیچ کی حالت میں بیٹھا تھا۔ کہ خیمہ کا پردہ اُٹھا۔ اور غازان اندر داخل ہوا +

بادشاہ بول اُٹھا۔ "ہم نے تمہیں نہیں بلایا"+

غازان آداب بجا لایا۔ اور عرض پیرا ہوا۔ "اگرچہ جہاں پناہ نے مجھے یاد نہیں فرمایا۔ مگر میں بن بلائے حاضر ہو گیا ہوں"+

بادشاہ خود چاہتا تھا۔ کہ اپنے خیالات کی الجھنوں سے آزاد ہو کر کسی سے بات چیت میں دل بہلائے اس لئے مُسکراتے ہوئے گویا ہوا۔ "غازان آؤ۔ دیکھو ہم نے کتنی بڑی آفت مول لی ہے" +

بادشاہ نے نبیذ کا ایک جام غازان کی طرف بڑھایا۔ اور کہا۔ "آؤ اس خوشگوار دعوت میں شرکت کرو"+

اس شاہی اشارے پر غازان پردہ درست کر کے اندر داخل ہو گیا۔ بادشاہ نے کہا۔ "صرف یہی ایک چھوٹی سی ریاست ہماری مملکت سے باہر رہ گئی ہے۔ کیا اشبیلیہ ہی کیتھرائن کا ملجا و ماوا ہے؟"

غازان نے نبیذ کا جام خالی کرنے کے بعد عرض کیا۔ "ہاں حضور اشبیلیہ ہی شہزادی کا ملجا و ماوا ہے"+

بادشاہ نے کہا۔ "اللہ قادر و قدیر ہے۔ غازان اس شہر پر اسلامی قبضہ رہ چکا ہے اور قانوناً مسلمانوں کی ملکیت ہے۔ لیکن ہمارے حملے کے باوجود اب تک اس پر قبضہ نہیں ہوا"!

غازان نے ادب کے ساتھ جواب دیا۔ "ظلّ اللہ میں حضور کو اس امر کے لئے ملامت کرنے نہیں آیا۔ کہ اب تک حضور کا اس پر قبضہ کیوں نہیں ہوا۔ بلکہ اس وقت میں یہ بتانے آیا ہوں۔

کہ عالی جاہ اس پر کیونکر قبضہ کرسکتے ہیں"!

اب وہ اپنی عبا کو اپنے گرد لپیٹتا ہوا خیمے کے وسط میں کھڑا ہوگیا۔ اور بولا:" کیا میں عالی جاہ سے ایک سوال پوچھنے کی جرأت کرسکتا ہوں"؟

بادشاہ مطمئن ہوکر مسند پر بیٹھ گیا۔ اور بولا:" ہاں غازان میں تمہاری بات نہایت غور سے سنوں گا۔ اور اُس کا جواب دوں گا"۔

غازان نے پوچھا:" جہاں پناہ فوج کا قلعہ کیا ہوتا ہے"؟

بادشاہ نے جواب دیا:" فوج کا قلعہ! فوج کا قلعہ کیسا۔ شہر کا قلعہ کہو۔ جو اینٹوں پتھروں کا بنا ہوا بلند جگہ پر واقع ہوتا ہے۔ مگر فوج خیموں میں یا چٹیل میدان میں ہوتی ہے۔ باری تعالےٰ۔ فوج کا قلعہ کیا! کیا تمہارا سوال حل ہوگیا"؟

غازان نے دوبارہ پوچھا:" عالی جاہ فوج کا قلعہ بتائیے"۔

بادشاہ نے دوسری مرتبہ جواب دیا:" فوج کا کوئی قلعہ نہیں ہوتا۔ اینٹوں پتھروں سے بنے ہوئے شہر کا قلعہ ہوتا ہے۔ مگر فوج اینٹوں پتھروں کی نہیں ہوتی۔ اس میں آدمی بھرتی کئے جاتے ہیں۔ اُن کے گوشت سے۔ اُن کی ہڈیوں سے۔ اُن کے بازوؤں سے۔ اُن کے دماغوں سے۔ اُن کے دلوں سے۔ الٰہی فوج کا قلعہ کیا معنی۔ کیا اب بھی تمہارا سوال حل نہیں ہوا"۔

غازان نے سر ہلایا۔ اور تیسری مرتبہ پوچھا:" جہاں پناہ گستاخی معاف! میں پھر وہی سوال کروں گا۔ مجھے بتائیے فوج کا قلعہ کیا ہوتا ہے"؟

بادشاہ کو احساس ہونے لگا۔ کہ بات معنی خیز ہے۔ اب اُس نے سوچنا شروع کیا۔ اور کئی ساعت خیالات کے اتھاہ سمندر میں غوطہ زن رہا۔ غازان بھی بے حس و حرکت بادشاہ کے چہرے پر نظریں گاڑے خیمے کے وسط میں چُپ چاپ کھڑا تھا۔ آخر بادشاہ نے سر اُٹھایا۔ اور جواب دیا۔ " فوج کا قلعہ وہ مضبوط دل ہے۔ جو فوج پر حکومت کرتا ہے" آہ تو کیا اُس کا دل بھی قلعہ ہے! یہ کہہ کر بادشاہ نے غازان کی طرف دیکھا۔ گویا وہ کہہ رہا تھا:" کیا تمہارا سوال حل ہوگیا"۔

غازان بولا:" ہاں جہاں پناہ آپ نے بالکل صحیح حل بتا دیا ہے۔ اتنا کہہ کر غازان مُڑا۔ اور چُپ چاپ خیمے سے باہر جانے لگا۔ مگر بادشاہ نے اس کا دامن پکڑ لیا۔ اور چلا کر کہا:" غازان! جس طرح

شہر کا قلعہ مضبوط ہوتا ہے۔ اُسی طرح فوج پر حکومت کرنے والا قلعہ بھی مضبوط ہوتا ہے مجھے شہر کی دیواروں سے گزرنے سے پہلے قلعہ فتح کرنا چاہئے +

ملکہ کیتھرائن اپنے وسیع ہال میں منقش دریچے کے نیچے مسند پر بیٹھی تھی۔ مصاحب اور سہیلیاں حاضر تھیں۔ اور ایک افسر کسی قیدی کو اندر لانے کی اجازت طلب کر رہا تھا +

اجازت مل گئی۔ اور قیدی پیش کر دیا گیا۔ یہ قیدی جوان ملکہ نہایت خوب صورت بانکا اور رعنا جوان تھا +

وہ دو محافظوں کے درمیان کھڑا تھا۔ مگر ایک آزاد ہستی کی طرح مغرور نظر آتا تھا۔ اُس کے کالے بال۔ بڑی بڑی صاف اور روشن آنکھیں۔ فراخ شانے۔ چوڑی چھاتی۔ خوشنما مونچھیں۔ سیاہ اور تازہ وارد موئے خط ظاہر کر رہے تھے۔ کہ وہ مجرم نہیں ہے +

شاید یہ کیتھرائن کی آنکھوں کا قصور تھا۔ کہ نوجوان قیدی ان زینوں سے ہوکر دل میں اُتر گیا +

اُس نے افسر سے دریافت کیا "تم نے اسے کہاں دیکھا تھا؟"

افسر نے جواب دیا۔ "ملکۂ عالم! رات یہ جنوبی دروازے پر آیا تھا اور چلا رہا تھا۔ کہ مجھے غازی بادشاہ کے عتاب سے بچاؤ +

کیتھرائن ناک بھوں چڑھا کر بولی۔ "جب تو یہ غدار ہے" +

افسر نے عرض کیا۔ "حضور ہمیں اس نے ہمیں کچھ بتایا نہیں۔ صرف اس قدر کہا ہے۔ کہ میں اپنی سرگزشت ملکہ کے گوش گزار کر دوں گا +

یہ سُن کر کیتھرائن اپنی سہیلی سے مور کی پنکھیا لے کر چہرے کو چھپاتی ہوئی قیدی سے مخاطب ہوئی۔ "اپنا حال بیان کرو"!

قیدی بولا۔ "میں قیدی ہوں تو اپنی مرضی اور ارادے سے قیدی ہوں۔ مگر کچھ واقعات ہی ایسے پیش آئے ہیں۔ کہ مجھے حضور کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کے سوا چارہ نہیں۔ تاہم میں غدار نہیں ہوں۔ اور اپنے بادشاہ کی خیر طلبی کے سوا کچھ نہیں چاہتا" +

ملکہ کیتھرائن بولی۔" اچھا تو تمہاری یہ مرضی ہے۔ کہ تمہارا بادشاہ ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ کر واپس لوٹ جائے"+

کیتھرائن کے اس فقرے پر اُس کے بہادر مُسکرائے اور اُس کی سہیلیوں نے قہقہہ لگایا +

اجنبی نے اس رائے زنی اور ان قہقہوں کی کوئی پروا نہ کی اور بولا" بادشاہ کے دل میں میری بے انتہا قدر تھی۔ میں بادشاہ کے بغیر اور بادشاہ میرے بغیر کچھ نہیں تھا۔ وہ مجھے دانشمند اور مدبر خیال کرتا تھا۔ اُس کا خیال تھا۔ کہ جو واقعات ابھی تک ظہور میں بھی نہیں آئے مجھ پر روشن ہو جاتے ہیں۔ اور وہ میری مدد سے اُن تمام وقعات کے نتائج معلوم کر سکتا ہے + بادشاہ ہر مشکل معمہ میری مدد سے حل کر لیتا تھا۔ جن تین معرکوں میں وہ فتحیاب ہوا ہے۔ اُن تینوں میں اُس کے ساتھ مَیں تھا۔ اس کے بعد وہ مجھے اشبیلیہ لے آیا کیونکہ اُسے میرے دانشمندانہ مشورے اور طاقت سے شہر پر قابض ہونے کا یقین تھا۔ میں خودستائی نہیں کر رہا ہوں۔ وہی بیان کر رہا ہوں جو بادشاہ نے لوگوں کے سامنے اور علیحدہ طور پر بار ہا ظاہر کیا"+

کیتھرائن بولی۔" خیر ایک فرد کی رائے تمہارے متعلق اچھی ہے۔ بے شک مَیں بھی یہ سمجھتی ہوں"+

اس پر سہیلیوں نے پھر قہقہہ لگایا۔ اور بہادر مُسکرائے۔ مگر قیدی پر کچھ اثر نہ ہوا + وہ نہایت واضح طور پر اپنی داستان بیان کرتا رہا۔ یہاں تک۔ کہ اُس کی مردانہ آواز نے ملکہ کیتھرائن کی سہیلیوں کو موہ لیا۔ اور اب وہ دل ہی دل میں اس احساس سے شرمندہ ہونے لگیں۔ کہ ہم نے ایک بہادر جوان کا تمسخر کیوں اُڑایا +

جوان کہہ رہا تھا۔" وہ دن بہت نحس تھا۔ جب ملکہ کا پیغام بادشاہ کے پاس پہنچا + بادشاہ نے مجھے بلایا۔ اور پوچھا۔ کہ انسان شہر کی دیواروں ہی سے قلعہ فتح کرنے کے بعد کس طرح گزر سکتا ہے؟ میں نے کہا یہ بات بالکل مہمل ہے۔ آپ اس بات کی ذرا پروا نہ کریں + بادشاہ نے میری بات پر یقین کر کے شہر کی فصیل پر حملہ کر دیا۔ مجاہدین اسلام بے فائدہ تلوار کے گھاٹ اُتر گئے + دوبارہ آپ کا یہی جواب آیا۔ بادشاہ نے پھر مجھ سے پوچھا۔ میں نے پھر جواب دیا۔ کہ یہ باتیں بالکل بے معنی ہیں۔ آپ ان کی مطلق پروا نہ کریں۔ اُس نے میرے تدبر پر یقین کرتے ہوئے فصیل شہر پر پھر حملہ کیا۔ اور بہادر بے نتیجہ مارے گئے +

تیسری مرتبہ آپ کا پھر وہی جواب آیا + بادشاہ نے پھر مجھ سے رائے طلب کی اور آپ کے معمے کا

حل پوچھا۔ مگر میرے پاس اس کا کوئی حل نہیں تھا۔ اب میں یہ بھی نہیں چاہتا تھا۔ کہ بہادرانِ اسلام میری بے وقوفی کے سبب سے اپنی قیمتی جانیں گنوائیں۔ میں نے بادشاہ کے سامنے اس امر کا اعتراف کر لیا۔ کہ میں اس معمّے کو حل کرنے سے قاصر ہوں"+

ملکہ کیتھرائن نے مور کے پروں والی پنکھیا سے آنکھیں اُٹھاتے ہوئے کہا:-

"تمہیں عقل بہت گراں اور بہت دیر بعد ملی ہے"+

جوان نے جواب دیا:"جب میں نے اپنی کم فہمی کا اقرار کر لیا۔ تو بادشاہ قدرتی طور پر غضبناک ہوگیا۔ اُس نے صاف الفاظ میں کہہ دیا۔ اگر تم نے اس مرتبہ معمّے کا حل نہ بتایا۔ تو تمہارے تمام کارناموں پر پانی پھر جائے گا۔ تمام حقوق زائل ہو جائیں گے۔ تمہیں مُلک بدر کر دیا جائے گا۔ عزیزوں سے ملنے کی اجازت بھی نہ دی جائے گی۔ بلکہ تمہاری زندگی کا بڑی ذلّت کے ساتھ خاتمہ کر دیا جائے گا+

بادشاہ نے یہ تمام باتیں نہایت طیش کے عالم میں کہی تھیں۔ میں اُس کے ڈر اور موت کی دھمکی سے رات کو چپ چاپ نکل آیا۔ اور جنوبی دروازے پر آ کر اپنے آپ کو ملکہ کے سپاہیوں کے سپرد کر دیا"+

کیتھرائن نے پوچھا:"تم مجھ سے کیا چاہتے ہو"؟

"یا تو اس معمّے کا حل تاکہ میں بادشاہ کے پاس لے جاؤں۔ اور دوبارہ اُس کی مہربانی حاصل کر سکوں"

کیتھرائن نے بات کاٹ کر مُسکراتے ہوئے کہا:"اگر مجھ سے یہ نہ ہو سکے تو.............."

"مجھے کچھ عرصہ یہاں ٹھہرنے کی اجازت دی جائے تاکہ میں اپنی قوّت سے اس معمّے کو حل کر لوں"+

بہادر مُسکرائے اور نوجوان کی اس کمزور جسارت پر سرگوشیاں کرنے لگے۔ مگر سہیلیاں جن پر جوان کی رعنائی اور شکل و شباہت نے بے حد اثر ڈال دیا تھا۔ اُنہوں نے آہ بھری۔ شاید اُن کو اس بات سے رنج ہوًا ہو۔ کہ ایسا نوجوان اس قسم کی بے نتیجہ درخواست کا مرتکب کیوں ہو رہا ہے"+

مگر ملکہ کیتھرائن خیالات کے اتھاہ سمندروں میں غرق ہوگئی۔ اور جب اُس نے نگاہیں اُٹھائیں۔ تو اُس کی آنکھیں جوان کی آنکھوں سے چار ہوگئیں۔ جوان کی آنکھیں پوری طرح اُس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں"+

کیتھرائن کے خوبصورت چہرے پر ہلکی سُرخی رقص کرنے لگی۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے۔ کہ یہ سُرخ روشنی تھی۔ جو منقش دریچے سے اُس کے رُخِ روشن پر پہنچا ور ہو رہی تھی +

اُس نے کہا تم سات روز تک ٹھہر سکتے ہو۔ شرط یہ ہے۔ کہ اس عرصے کے ختم ہو جانے پر میرے ملازم تمہیں بادشاہ کے پاس لے جائیں گے۔ اگر اس عرصے میں تم نے معمہ حل کر لیا۔ تو تمہارے لئے بلکہ تمہارے بادشاہ کے لئے بھی بہت اچھی بات ہو گی۔ اور اگر تم اسے حل کرنے سے قاصر رہے۔ تو یہ تمہاری بدقسمتی ہو گی۔ بلکہ شاید موت بھی اس سے بری نہ ہو ÷

اجنبی نوجوان نے مسکرا کر جواب دیا۔ "میں یہاں ٹھہرنے کے لئے اس شرط کو منظور کرتا ہوں" ÷

کیتھرائن نے اشارہ کیا "کہ اسے یہاں سے لے جاؤ۔ اور مجھے تنہا چھوڑ دو" ÷

سات دن اور راتیں اجنبی شہر میں قیام پذیر رہا۔ ہر روز وہ خلوت و جلوت میں کیتھرائن کے روبرو طلب کیا جاتا۔ وہ اکثر بادشاہ اور اُس کی سلطنت کے متعلق گفتگو کیا کرتا تھا۔ کیتھرائن نے اُس پہ اپنی تمام دولت اور طاقت ظاہر کر دی۔ وہ ہر بار اُس سے یہ دریافت کرتی۔ "بتاؤ تم کون ہو؟" ہر بار اجنبی یہی جواب دیتا: "میں بادشاہ کے بغیر کچھ بھی نہیں ÷

ملکہ تجسس حال کے لئے اور بھی پریشان نظر آتی۔ وہ اپنے دل سے سوال کرتی۔ "یہ کون ہے۔ کہاں سے آیا ہے؟"

اس دوران میں بادشاہ کا لشکر چُپ چاپ خیموں میں قیام پذیر رہا۔ اور شہر پناہ پر کوئی حملہ نہ کیا ÷

تیسرے روز کیتھرائن نے جوان سے پوچھا۔ "کیا تم بتا سکتے ہو۔ کہ بادشاہ دوسری عظیم الشان سلطنتوں کو چھوڑ کر میرے چھوٹے سے خوب صورت شہر کے پیچھے کیوں پڑا ہے" ÷

جوان نے جواب دیا۔ "بادشاہ اپنی سلطنت بڑھانا چاہتا ہے۔ اُس نے گزشتہ تین سالوں میں اپنے مقبوضہ علاقوں کے اندر امن و امان پیدا کر دیا ہے۔ صرف یہی شہر۔ دوستوں میں دشمن۔ فرماں برداروں میں نافرماں بردار۔ طاقتوروں میں کمزور باقی رہ گیا ہے" ÷

کیتھرائن نے تیوری چڑھا کر اس جواب کو سُنا۔ اور ایک ساعت کے بعد بولی "اگر بادشاہ مجھے تمہارے ان الفاظ سے مخاطب کر کے قاصدوں کو بھیجتا۔ تو ممکن تھا۔ میں اُس کا پیغام سُن لیتی۔ مگر مجھے تو اُس نے صرف یہی حکم دیا ہے۔ کہ اطاعت قبول کر لوں" ÷

اگلے روز کیتھرائن نے اُسے پھر بلایا۔ اور پوچھا "اگر میں بادشاہ کی اطاعت قبول کر لوں تو کیا

میں وہی کیتھرائن رہوں گی۔ جو اشبیلیہ کی ملکہ تھی؟

اُس نے جواب دیا۔ "بادشاہ کی نظروں میں آپ کا درجہ اَور بھی بلند ہو جائے گا۔ وہ آپ سے محبت کرنے لگ جائے گا" +

کیتھرائن خفا ہو گئی۔ "میں اُس کی محبت کی بھوکی نہیں ہوں" +

جوان نے نہایت نرمی سے کہا۔ "آپ نہیں جانتیں محبت کیا ہوتی ہے؟ آپ غازی بادشاہ کی محبت کو نہیں جانتیں" +

پانچویں روز ملکہ نے جوان کو خلوت میں بلایا۔ اور پوچھا۔

"اگر میں اپنے آپ کو بادشاہ کے حوالے کر دوں۔ اُس کی اطاعت منظور کر لوں۔ اور شہر میں اُسی طرح امن پھیل جائے۔ جو میرے باپ کے زمانے میں تھا۔ تو بادشاہ کیا کرے گا؟"

"وہ سلطنت کو خوش حال اور امن کی دولت سے مالا مال کر دے گا" +

"تو پھر تم کیا کرو گے؟"

اجنبی بولا "میں بادشاہ کے ساتھ رہوں گا۔ اور اُس کو ضرورت کے وقت مشورہ دیا کروں گا" +

کیتھرائن نے پوچھا "کیا وہ تمہیں اور زیادہ عزّت بخشے گا" +

جوان نے کہا "اگر اس معمّے کو حل کر لوں۔ تو میری عزّت ہی عزّت ہے" +

"تو کیا تم نے ابھی تک اس کو حل نہیں کیا" +

"میں کوشش کر رہا ہوں۔ کہ اس کا حل آپ کی آنکھوں میں پڑھ لوں" +

کیتھرائن نے اس ڈر سے اپنا مُنہ دوسری طرف پھیر لیا۔ کہ کہیں وہ میری آنکھوں سے اس معمّے کا حل معلوم نہ کر لے +

ساتویں روز رات کے وقت ملکہ نے اجنبی کو بالکل علیحدہ طور پر بُلایا۔ تاکہ سہیلیوں اور بہادروں کو بھی کچھ پتہ نہ چل سکے +

وہ ایک وسیع ہال میں بیٹھی تھی۔ دھیمی دھیمی روشنی ہو رہی تھی۔ جس میں صرف اس کا خوب صورت چہرہ۔ سیاہ بال اور شاہانہ لباس کی چمک نظر آ رہی تھی +

جوان آیا۔ اور اُس کے سامنے کھڑا ہو گیا +

کیتھرائن نے کہا۔ "میں کل صبح تمہارے قول کے مطابق تمہیں بادشاہ کے پاس پہنچا دوں گی۔ بتاؤ تم اُس کی خدمت میں کونسا تحفہ پیش کرنے کے لئے لے جا رہے ہو ؟"

اُس نے جواب دیا "میرے پاس قلعے کی کنجیاں نہیں تو کچھ بھی نہیں" +

گہرا سکوت چھا گیا۔ وسیع ہال بالکل چپ تھا۔ اجنبی جوان کیتھرائن کے بالکل قریب آ گیا۔ اور اُس کی مسند کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا +

اُس نے کہا۔ "ملکہ خدا حافظ" ملکہ نے اُس کی طرف دیکھا۔ اور دھیمی آواز سے کہا "خدا حافظ"

اجنبی بولا "ہم دوبارا ملیں گے" ملکہ حیران تھی اس جوان کے چہرے پر آنکھیں جما کر پوچھا۔ "کب ؟"

"کل قلعے کی دیواروں سے باہر"

"قلعے کی دیواروں سے باہر!"

"ہاں" کہکر جوان جھکا۔ اور ملکہ کے مرتعش ہاتھ پر بوسہ دیتے ہوئے بولا:-

"فوج کا قلعہ ملکہ کا دل ہے"

ملکہ جیسے خواب سے چونک اُٹھی۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی۔ مگر اجنبی جوان نے اُسے خاموش رہنے کا اشارا کیا۔ اور ایک لمبی نظر ڈالتے ہوئے وہ اسے منقش دریچے میں چھوڑ کر چلا گیا۔ جہاں صرف چاندنی کی نورانی شعاعیں اُس کے خوب صورت بالوں سے کھیلتی رہ گئیں + وہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے اسی طرح وہاں بیٹھی رہی۔ اس کی نگاہیں دریچے پر لگی ہوئی تھیں۔ جس میں سے وہ گزر گیا تھا +

اس نے آہستہ سے کہا "میرا دل اپنے مالک کو پہچانتا ہے" تو کیا میں بادشاہ کے ساتھ سرگرم کلام تھی!"

دوسرے دن عبدالرحمٰن جسے سلطنت کے بعض ضروری کاموں کے سبب لشکر سے باہر جانا پڑا تھا واپس آ گیا۔ اور دوبارہ لشکر کی کمان سنبھال لی تو اُس نے اپنی فوج کو اپنے ساتھ اشبیلیہ کے جنوبی دروازے کے پاس فصیل کے بالکل قریب چلنے کا حکم دیا + ایک بوڑھے سپاہی نے غازان سے پوچھا "کیا ہم تیسرا حملہ کرنے جا رہے ہیں ؟"

غازان نے جواب دیا "نہیں۔ بادشاہ دیواروں سے نہیں ٹکرائے گا۔ وہ سیدھا قلعے پر قبضہ

کرے گا + ارد گرد کے سپاہی ہنسنے لگے۔ وہ سمجھے غازان بادشاہ کا مذاق اُڑا رہا ہے!

سہ پہر کے وقت بادشاہ اپنے بیش قیمت لباس میں ایک سیاہ عربی گھوڑے پر سوار آگے بڑھا۔ جب فصیل "دو سو گز" کے فاصلے پر رہ گئی۔ تو وہ گھوڑے سے اُتر کھڑا ہوا۔ فوج کو بھی اُترنا پڑا۔ اب اُس نے ایک قاصد کو آگے بڑھنے کا حکم دیا۔ فصیلوں پر ملکہ کے جاں نثار مقابلے کے لئے تیار بیٹھے تھے + قاصد نے بادشاہ کے حکم مطابق فصیلوں کے قریب جا کر پکار کر کہا: "بادشاہ ملکہ سے ملاقات کرنا چاہتا ہے" +

اس پیغام سے قلعے کی دیواروں کے اندر شور مچ گیا۔ مگر بادشاہ چپ چاپ اپنے مشکی گھوڑے کی باگ پکڑے شان و وقار کے ساتھ متمکن تھا +

کوئی دو ساعت کے بعد شہر کا دروازہ کھلا۔ اور ملکہ کیتھرائن سہیلیوں اور بہادروں کے ساتھ شاہانہ لباس پہنے نقاب چہرے پر ڈالے پالکی میں سوار آ موجود ہوئی +

بوڑھے سپاہی نے اس فکر میں۔ کہ شاید اب ہمیں شہر پر حملہ کرنے کا موقع نہ ملے گا۔ غازان سے پوچھا: "کیا واقعی قلعے پر حملہ نہ ہوگا"؟

غازان نے کہا: "ہم تھوڑی دیر کے اندر شہر کے بازاروں میں سے گزر رہے ہوں گے" +

بادشاہ نے گھوڑے کو تیز کیا۔ اور آن کی آن میں اُس جگہ جا پہنچا جہاں نقاب پوش ملکہ کیتھرائن پالکی سے نکل کر سہیلیوں کے جھرمٹ میں اُس کا انتظار کر رہی تھی +

کیتھرائن نے بادشاہ کو دیکھا۔ تو نقاب کے اندر سے اُس کی آنکھیں روشن نظر آنے لگیں۔ مگر اُس نے کوئی تعجب ظاہر نہ کیا۔ اُس نے کہا: "اس امر کا مجھے اُس وقت بھی پتہ تھا۔ جب میری سہیلیاں اور بہادر حیران تھے +

ملکہ نے پوچھا: "پیارے بادشاہ سلامت آپ کہاں"؟

بادشاہ جواب دیئے بغیر جھکا۔ اُس نے ملکہ کو پھول کی طرح اُٹھا کر گھوڑے پر اپنے آگے بٹھالیا +

دونوں فوجوں میں شور و غلغلہ بلند ہوا + بادشاہ نے کہا: "ملکہ اب قلعہ میرے قبضے میں۔ اور میں شہر کی دیواروں سے گزر جاؤں گا" +

دونوں اسی طرح خوشی کے نعروں اور پھولوں کی بارش کے درمیان اشبیلیہ کے اندر داخل ہو گئے +

(مفتی محمد انور اقبال)

ندائے غیب

(از میاں ایم اسلم صاحب)

قدرت کم و بیش ہر ایک شخص کو آنے والے واقعات یا حادثات سے کسی نہ کسی طور پر خبردار کر دیتی ہے اس "ندائے غیب" یا "پیش خبری" کا کئی طور پر ظہور ہوتا ہے۔ بعض آدمیوں کو حالتِ خواب میں اطلاع مل جاتی ہے۔ بعض لوگوں کو اپنے کاروبار زندگی کے دوران ہی میں کسی حادثے یا غیر معمولی واقعے کا احساس پیدا ہو جاتا ہے۔ اور طبیعت خود بخود بے چین اور مضطرب ہو جاتی ہے۔ بعض لوگوں کو کسی خاص چیز کے خیال میں یا جستجو میں چلتے پھرتے پیش آنے والے واقعات کا خوف دامنگیر ہو جاتا ہے + بعض اوقات حالتِ بیخودی میں انسان پر ایسے انکشافات ہوتے ہیں۔ کہ دل میں دھڑکن یا ہراس پیدا کر دیتے ہیں۔ بعض لوگ شگون لینے کے عادی ہوتے ہیں۔ اور نتائج کے مطابق واقعات کے ظہور پذیر ہونے کے منتظر رہتے ہیں۔ لیکن عوام الناس اس قسم کی باتوں کو "وہم" سے تعبیر کرتے ہیں۔ مانا۔ کہ یہ "وہم" ہی سہی۔ تو پھر ثابت ہوا۔ کہ "وہم" بھی آخر کوئی نہ کوئی طاقت یا چیز ضرور ہے۔ جو دل پر وارد ہو کر انسان کی طبیعت پر کسی نہ کسی قسم کا اثر ضرور پیدا کر دیتی ہے +

لیکن سوال یہ ہے۔ کہ یہی "پیش خبری" یا "ندائے غیب" یا "شگون" یا "وہم" کچھ حقیقت بھی رکھتے ہیں یا نہیں۔ یہ ایک نہایت دلچسپ مسئلہ ہے۔ اور حکمائے یورپ کا ایک گروہ بڑی کاوش کے ساتھ اس نظریہ کی تحقیق اور جستجو میں منہمک ہے +

اگر ہم اس مسئلے کے ہر ممکن پہلو پر محققانہ نگاہ ڈالیں۔ تو ہمارے تجربے یا مشاہدے میں ایسی اکثر مثالیں موجود ہونگی جو ہر نقطۂ نگاہ سے اس قابل ہیں کہ ان پر غور کیا جائے۔ اور ان کو مدنظر رکھ کر کوئی نتیجہ مرتب ہو جائے +

"یورپ" میں آج کل دو گروہ پیدا ہو گئے ہیں۔ ایک گروہ وہ ہے جو "موت" کے بعد "بقاءِ روح" یعنی انسان کے مرجانے کے بعد "حیاتِ دوام" حاصل کر لینے کے نظریہ کو صحیح مانتا ہے + دوسرا گروہ

وہ ہے جو زندگی کی تگ و دو کو جسم تک محدود رکھنا چاہتا ہے۔ اس گروہ کے نقطۂ خیال سے مرجانے کے بعد انسان کا کام ختم ہوجاتا ہے۔ اور وہ کامل طور پر بحرِ فنا میں ڈوب جاتا ہے + لیکن آخرالذکر گروہ یہ بھی مانتا ہے کہ آنے والے واقعات کی خبر ان کو ایک پُراسرار طریق سے ضرور ہوجاتی ہے۔ لیکن کیوں اور کیسے ہوتی ہے۔ اس کا جواب یہ لوگ کچھ نہیں دے سکتے +

بعض اوقات ہم "مشاہدات" پر ایک نظریہ قائم کرلیتے ہیں۔ لیکن کسی "مشاہدے" یا "واقعے" کو محض اس لئے رد کردینا یا غلط کہدینا۔ کہ ہم اسے دلیل و بُرہان سے ثابت نہیں کرسکتے۔ شیوۂ دانشمندی سے بعید ہے + ہمیں یہ بھی مدّنظر رکھنا چاہیئے۔ کہ آج تک ہم یہ بھی تو پورے طور پر نہیں بتلا سکتے۔ کہ جب ہم کوئی پتھر ہوا میں اوپر کو اُچھالتے ہیں۔ تو وہ نیچے کیوں گرتا ہے۔ ہم اس نظریۂ کو اس لئے صحیح باور کرتے ہیں۔ کہ یہ بات ہمیشہ ہمارے تجربے میں آتی ہے + اسی طرح اگر انسان عقل و فہم سے کام لے۔ تو نظامِ عالم میں بہتیری ایسی چیزیں موجود ہیں۔ جن کو صحیح تسلیم کرنے کے لئے۔ ہم کو دلائل کی جستجو میں سرگرداں نہیں ہونا پڑتا +

انجمن علماءِ روحانیات کے ایک شہرۂ آفاق رکن ایف۔ ڈبلیو۔ ایچ۔ میئرز نے اپنی مشہور کتاب "ہیومن پرسنیلیٹی" (Human Personality) میں "نِدائے غیب" یا پیش خبری کے متعلق چند مثالیں پیش کی ہیں۔ اور یہ وہ مثالیں ہیں کہ ان کے ہر پہلو پر پوری پوری بحث کی گئی ہے۔ اور صداقت تک پہنچنے کے لئے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا گیا۔ ان مثالوں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ قدرت کس طریق سے انسان کو آنے والے واقعات سے خبردار کردیتی ہے +

سر آلیور لاج نے جسے علماءِ روحانیات میں ایک خاص امتیاز حاصل ہے۔ سوسائٹی فار مرکل ریسرچ (Society for Miracle Research) کے جلسے کی صدارت کرتے ہوئے اپنے صدارتی خطبے میں چند ایک مثالیں بیان کی تھیں۔ ان کا مطالعہ ہر ایک کے لئے دلچسپ ہوسکتا ہے:—

سنہ ۱۹۱۲ء میں ایک شخص مسٹر جان۔ جو شمالی ویلز میں سکونت رکھتا ہے۔ اور معدنیات کی متعدد کانوں کا سب سے بڑا حصے دار ہے۔ ایک روز اپنے بھائی کے ساتھ کسی کان کا معائنہ کرنے کے بعد واپس آرہا تھا۔ راستے میں اچانک اس کے دل میں کچھ تشویش سی پیدا ہوئی۔ اور مزدوروں کی سلامتی کے متعلق

اسے کچھ خوف و ہراس معلوم ہونے لگا۔ اس نے اپنے بھائی سے راستے ہی میں یہ کیفیت بیان کی۔ تو اس نے اس خیال پر خوب مضحکہ اُڑایا۔ لیکن مسٹر جان نے باوجود اپنے بھائی کی مخالفت کے "کان" کے منیجر کو تار دے دیا۔ کہ اسی وقت کام بند کرا دیا جائے۔ منیجر نے یہ عجیب تار دیکھ کر محض ماتحت ہونے کے خیال سے اُسی وقت کام بند کرا دیا۔ اور مزدور اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ کام بند ہونے کے ٹھیک ایک گھنٹہ بعد تمام کان جو ایک سو بیس گز اونچی تھی اچانک بیٹھ گئی + منیجر خود حیران تھا۔ کہ کان کے اس طرح گر پڑنے کا شائبہ تک نہیں تھا۔ کچھ بھی سہی۔ لوگ مسٹر جان کے خیال "وہم" یا "قیاس" کی جو چاہے تعبیر کریں لیکن یہ ایک امر واقع ہے۔ اور کوئی شخص اس کی صداقت سے انکار نہیں کر سکتا +

لنڈن کے ایک حصّے میں ایک خاتون لیڈی اگلر نام رہتی تھی۔ ایک روز اس کے خاوند نے جو فوجی درس گاہ میں متعیّن تھا۔ اس سے کہا۔ کہ وہ دفتر میں آکر اس سے ملے۔ لیڈی مذکور بیان کرتی ہے۔ کہ میں وکٹوریہ اسٹیشن سے اُتر کر گرجا والی سڑک پر جا رہی تھی۔ کہ اچانک کسی نے میرے شانے پر ہاتھ رکھا۔ میں نے پلٹ کر جو دیکھا۔ تو میری ساس کھڑی تھی۔ اور اس وقت بہت بیمار نظر آتی تھی۔ میں نے مسکرا کر کہا "اماں جان تم نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا" لیکن میرے یہ الفاظ ادا کرتے کرتے میری ساس میری آنکھوں کے سامنے سے غائب ہوگئی + اس عجیب واقعے کا میری طبیعت پر ایسا خراب اثر پڑا۔ کہ میں دفتر جانے کی بجائے گھر لوٹ آئی۔ یہاں آتے ہی مجھے بخار چڑھ آیا۔ اگلے روز میں نے اپنے خاوند سے یہ تمام واقعہ بیان کر کے اسے کہا۔ کہ جا کر بوڑھی خاتون کی خیر خیریت دریافت کرے۔ ہم ابھی بیٹھے باتیں ہی کر رہے تھے۔ کہ اچانک میں نے یہ آواز سُنی :-

"۲۲ تاریخ کو تم دونوں آؤ" +

۲۲ مارچ میری ولادت کا دن تھا۔ میں نے اگلے روز کے تجربے یا مشاہدے کی بنا پر اپنے خاوند سے کہا۔ کہ میری ولادت کا دن بوڑھی خاتون کی موت کا دن ہوگا +

اُسی روز میرا خاوند اپنی والدہ کو دیکھنے گیا۔ اور واپس آکر مجھ سے کہا۔ کہ اس کی والدہ دو چار روز سے زکام اور بخار میں مبتلا ہے۔ پریشان ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ لیکن ۲۲ مارچ کو صرف چار روز بعد میری ساس اس دنیا سے چل بسی +

ایک اَور معزز دوست بیان کرتا ہے۔ کہ میں نے ایک روز شام کے وقت یہ ارادہ کیا۔ کہ کل کا سارا دن اپنی ہمشیر کے پاس جاکر بسر کروں گا۔ اسی رات جب مَیں سویا۔ تو میں نے خواب میں وہ گھوڑا گاڑی جو میری ہمشیرہ نے "مارٹلیک اسٹیشن" پر مجھے لانے کے لئے بھیجی تھی۔ سڑک پر ٹوٹی ہوئی دیکھی اور سائیس کو مجروح پایا +

اس پریشان خواب سے میری آنکھ کھل گئی۔ تھوڑی دیر بعد میری آنکھ پھر لگ گئی۔ تو دوبارا میں نے یہی نظّارا دیکھا۔ اب میرے دل میں کچھ وحشت سی پیدا ہوئی۔ اور میں سوچنے لگا۔ کہ صبح ہمشیرہ سے ملنے جاؤں یا نہ جاؤں۔ یہی خیال لئے ہوئے مَیں پھر سو گیا۔ اور جب صبح بیدار ہوا۔ تو گزشتہ شب کی پریشان کُن خواب کا کوئی اثر موجود نہ تھا۔ مَیں ٹرین میں سوار ہوکر "مارٹلیک اسٹیشن" پر جا اُترا۔ تھوڑی ہی دیر بعد کوچوان میری ہمشیرہ کی گاڑی لے کر آ پہنچا۔ اور میں سوار ہوکر گھر کی طرف روانہ ہوا۔ گھر سے کچھ تھوڑے فاصلے پر گھوڑا شوخی کرنے لگا۔ اور کوچوان کی چمکار تھپک کے باوجود آگے جانے پر رضامند نہ ہوا۔ عین اُسی وقت مجھے گزشتہ شب کا خواب یاد آ گیا۔ اور میں گاڑی سے اُتر پڑا۔ کہ میں تو پیدل گھر چلوں گا + ابھی مشکل سے تیس چالیس گز آگے بڑھا ہوں گا۔ کہ گھوڑا گاڑی کو لے بھاگا۔ اور موڑ پر سے اس تیزی سے گزرا۔ کہ گاڑی اُلٹ کر چُور چُور ہو گئی۔ کوچوان اور گھوڑا دونوں بُری طرح زخمی ہوئے +

"جنیوا" میں ایک خاتون مقیم تھی۔ اس کی والدہ نے جو لنڈن میں بود و باش رکھتی تھی۔ ایک روز اپنی بیٹی کو یہ "تار" بھیجا :-

"طلائی ظروف احتیاط سے رکھو۔ میرے خط کا انتظار کرو" +

"جنیوا" والی خاتون بیان کرتی ہے۔ کہ مَیں اُسی دن سے رات کے وقت خود گھر کے تمام دروازے بند کر دیا کرتی۔ اور قیمتی ظروف بھی حفاظت سے ایک کمرے میں بند کرکے قفل لگا دیتی۔ دو تین روز بعد میری ماں کا خط ملا۔ اس خط میں ایک خواب درج تھا +

میری ماں نے خواب میں گھر کی نیچے والی منزل میں جہاں ظروف وغیرہ رکھّے رہتے تھے۔ کچھ کھڑکھڑاہٹ سی سُنی۔ جب وہ شمعدان لے کر زینے سے اُتر کر نیچے پہنچی۔ تو اُس نے کھانے کمرے میں دو چوروں کو میرے کے ایک تھیلے میں طلائی ظروف ڈالتے۔ اور آپس میں یہ کہتے سُنا۔ کہ ہم جمعہ کے روز "جنیوا" چلیں گے۔

ان میں سے ایک چور میری ماں کو دیکھ کر ایک لمبا چاقو لے کر کمرے سے نکلا۔ دہشت سے میری ماں چیخنے لگی۔ اور اس کی آنکھ کھل گئی"

اس خط کے آنے کے بعد میں اور بھی احتیاط کرنے لگی۔ جمعہ کی شب خیریت سے گزر گئی لیکن جہار شنبہ کی شب کو دو چور کسی طرح گھر میں داخل ہو گئے۔ اور تمام سامان لے کر بھاگ گئے۔ کچھ روز بعد ان کا سراغ مل گیا۔ اور جب ان کو گرفتار کیا گیا۔ تو مال مسروقہ بھی مل گیا۔ اور تھیلے میں سے ایک لمبا چاقو بھی نکلا۔ انہوں نے اقبال جرم کرتے ہوئے یہ بھی بیان کیا۔ کہ وہ درحقیقت جمعہ کے روز ہی نقب لگانا چاہتے تھے۔ لیکن اس روز وہ کامیاب نہ ہو سکے۔

ان چند مثالوں سے یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ پیش آنے والے واقعات کی ہمیں کسی نہ کسی طرح اطلاع مل جاتی ہے۔ اگر ہم غور سے دیکھیں تو دنیا میں شاید ہی کوئی ایسا گھر ہوگا۔ جس کے رہنے والوں میں سے کسی ایک کو اس قسم کی "بشارت" "خواب" یا "احساس" کسی آنے والے واقعے کے متعلق نہ ہوا ہو۔ سچے واقعات کو بیان کرتے ہوئے پس و پیش ہرگز نہیں کرنا چاہئے۔ کیونکہ ان واقعات کی رو سے ایک "نظریہ" قائم کیا جاتا ہے۔ آج کل سائنس داں اسی تگ و دو میں لگے ہوئے ہیں۔ کہ ان باتوں کی جن کو ہم "وہم" سے تعبیر کرتے ہیں۔ علمی نکتہ سے پردہ کشائی کی جائے۔

محبّت کی عیدی

(چغتائی کے ایک شاگرد کی تصویر دیکھ کر)

محبت جب ہلالِ عید بن کر مسکراتی ہے　　نگاہِ حسن جھکتی ہے، دعا کو ہاتھ اٹھاتی ہے
ہلالِ عید کیا ہے۔ اک تصوّر تیغِ ابرو کا　　محبت اپنی محبوبہ کو آئینہ دکھاتی ہے
دعا نے حسن کیا ہے۔ ایک بستی آرزوؤں کی　　محبّت ہی یہ بستی حسن کے دل میں بساتی ہے
"بسا دے اے خدا! اس شہر میں حسن و محبّت کو　　جہاں ہر شام، دامن میں پیامِ عید لاتی ہے"

(ابوالاثر حفیظ جالندھری)

بربطی مغنّی

موت نے میری بیوی اور اکلوتے بچے کو بے وقت آلیا۔ اور میں ۳۵ سال کی عمر میں خانہ بدوش ہوکر پھرنے لگا۔ میری واحد دمساز میری سارنگی تھی۔ میں اسی کی صحبت میں اپنا غم غلط کیا کرتا تھا۔ ایک دن شام کے وقت جمنا کے کنارے بیٹھا ہوا۔ اس کے تاروں کو چھیڑ رہا تھا۔ کہ مجھے غروب ہوتے ہوئے آفتاب اور اپنے درمیان ایک سایہ گرتا دکھائی دیا۔ میں نے سر اُٹھایا۔ تو دیکھا۔ کہ ایک بلند بالا بزرگ صورت مغل میرے قریب کھڑا ہے۔ اس کی آنکھوں میں جو میری سارنگی پر جمی ہوئی تھیں۔ ایک عجیب کیفیت پائی جاتی تھی خاموش بُت بنا کھڑا تھا! میں حیرت زدہ ہوکر اٹھا۔ مگر وہ فوراً کچھ بڑبڑاتا ہوا منہ پھیر کر چل دیا۔ عجیب شخص تھا! میرے دل میں اُس سے واقفیت پیدا کرنے کا جذبہ اُبھرا۔ اور اس اشتیاق میں بے اختیار اُس کے پیچھے ہو لیا۔ اور قریب پہنچ کر پوچھا۔ "میرزا صاحب! کیا آپ کو میرا گانا ناگوار گزرا۔ کہ آپ اس طرح چل دئے"؟ اس نے جذبات سے لرزتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ "بھائی تم سارنگی خوب بجاتے ہو۔ میں نے ایسے نغمے برسوں سے نہیں سُنے۔ سارنگی کو چھونا اور سُننا تو درکنار میں اسے دیکھنا بھی نہیں چاہتا۔ میں اس کی موسیقی سے اس طرح دُور بھاگتا ہوں جیسے سانپ سے۔ لیکن تمہاری میٹھی تانوں نے آج میری یاد کے بند دروازے کھول دئے ہیں"

"آپ کا نام؟"

"مجھے بربطی کہتے ہیں"۔

میں حیران اور خاموش تھا۔ بربطی مغنی کا نام سارے ہندوستان میں مشہور تھا۔ لیکن برسوں سے وہ گم تھا۔ کہا جاتا تھا۔ کہ اس نے فقیرانہ زندگی اختیار کر لی ہے۔ کچھ تامل کے بعد میں نے کہا "بربطی مغنی کو کون نہیں جانتا۔ مگر اتنے بڑے گویے کو راگ سے چڑ کیوں ہے"۔ وہ بولا "جناب آپ کے راگ نے مجھے بھولی بسری باتیں یاد دلا دی ہیں۔ میرے دل میں ایک طوفان برپا کر دیا ہے۔ ماضی کے واقعات کو میری آنکھوں کے سامنے لا کر رکھ دیا ہے۔ حال کو محو کر کے ماضی کو حال بنا دیا ہے۔ آئیے میں آپ کو عجیب کہانی سُناتا ہوں"۔

راستے میں بڑے بڑے پتھروں کا ایک ڈھیر پڑا تھا۔ اس نے اس کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے تعمیل کی۔ وہ بھی میرے پاس بیٹھ گیا۔ اور پھر جیسے کوئی خواب میں باتیں کر رہا ہو۔ اس نے جمنا کے خاموش بہتے ہوئے پانی پر آنکھیں جمائے ہوئے مجھے یہ کہانی سنائی :-

میں جوانی میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کے محل کے درباری گویوں میں سے تھا۔ ضعیف العمر مہاراجہ کے انتقال کے بعد رانی چاند کور تخت نشین ہوئی۔ ہمارے طائفے کا سردار جانکی تھا۔ رہنے کے لئے ہمیں محل کے متصل ایک مکان ملا ہوا تھا۔ ہم سب اسی میں رہتے تھے +

سارے پنجاب میں بے اطمینانی اور بغاوت پھیلی ہوئی تھی۔ محل کے مکینوں کو عیش و عشرت کے سوا کوئی کام نہ تھا۔ صبح سے دوپہر اور دوپہر سے نصف شب تک رقص اور راگ رنگ کی محفلیں جمی رہتیں۔ ہر وقت دعوتیں اُڑتیں۔ عیش و نشاط کا دریا تھا کہ اُمڈا آرہا تھا!

رقاصاؤں، جادوگروں اور مغنیوں سے صحن بھرے پڑے تھے۔ ناٹک کے کھیل دن بھر اور نصف شب تک ہوا کرتے تھے +

دن اسی طرح گزرتے رہے۔ یہاں تک کہ ہولی کا تیوہار آگیا۔ میں الفاظ کہاں سے لاؤں۔ تمام محل پری خانہ بن رہا تھا۔ درخت روشنی سے جگمگا رہے تھے۔ فواروں کا پانی بلور کی طرح چمکتا تھا۔ اور ہر رنگ و بو کے پھولوں کے ہار جابجا آویزاں ہو کر ہوا کو معطر کر رہے تھے۔ حسین رقاصاؤں کی چھاگلوں کی جھنکار طبلوں کی تھاپ کے ساتھ تال دے رہی تھی۔ ستاریں، سارنگیاں اور طاؤس ہم آہنگ ہو رہے تھے۔ بدامنی کی افواہیں ہمیں وقتاً فوقتاً پہنچتیں۔ مگر ہم عیش و نشاط کے متوالے ان کو خیال میں نہ لاتے۔ تیوہار برابر چار راتوں تک منایا گیا۔ پانچویں رات ایک سوار باہر والے صحن میں دوڑتا ہوا آیا۔ اور یہ خبر لایا۔ کہ سرکش مہاراجہ کے پرانے سپاہی شہر میں داخل ہوگئے ہیں اور لوٹ مار میں مشغول ہیں!

فوراً ڈھول بجائے گئے۔ مگر اس سے پیشتر کہ ہم اپنے آپ کو بچا سکیں۔ سپاہیوں نے محل کو گھیرے میں لے لیا۔ ہمارے کمروں کے نزدیک ایک ایسا احاطہ تھا۔ جس میں کوئی نہ رہتا تھا۔ لوگ کہتے تھے کہ یہ کمرے بھاری ہیں۔ ان میں سے رات کے وقت عجیب عجیب آوازیں آتی تھیں اور راگ سنائی دیتے تھے +

سکھ سپاہی محل کے ہر گوشے میں گھس گئے۔ مگر ان کمروں کی طرف سے سب کترا کر نکلتے تھے۔ میں فوراً ان کمروں کی طرف لپکا۔ سامنے ایک برآمدہ تھا۔ جس کے ساتھ ساتھ چھوٹے چھوٹے کمروں کی ایک قطار تھی

دوسری طرف باغ کی بیرونی دیوار تھی۔ میرا ارادہ ہو چکا تھا۔ کہ کسی ایک کمرے کے دروازے کو توڑ کر کھڑکی کی راہ سے باغ میں کود پڑوں +

جب میں اس طویل راستے کو طے کر رہا تھا۔ تو مجھے ایک دروازے کی محراب پر لفظ "رضیہ" کندہ دکھائی دیا۔ جانے کیا شے مجھے اس کی طرف کشاں کشاں لے گئی۔ میں نے دروازے کو دھکا دے کر کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔ چھوٹا سا کمرہ تھا جس کا فرش برسوں کے گرد و غبار سے اٹا پڑا تھا۔ ایک پرانا ہوا صندلی پلنگ جس پر قرمزی اور زمردی رنگ کا کاڑھا ہوا اوچھاڑ چڑھا ہوا تھا۔ ایک کونے میں رکھا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ہی سیاہ لکڑی کی ایک خوبصورت چوکی پڑی تھی۔ لکڑی کی کھونٹیوں پر کچھ زنانہ کپڑے آسمانی قرمزی، موتیا اور بادامی رنگ کے دوپٹے۔ جیسے کہ عموماً ناچنے والیاں اوڑھا کرتی ہیں۔ آویزاں تھے۔ زمین پر ایک نفیس ایرانی قالین بچھا تھا۔ دیوار پر چند ہاتھی دانت پر بڑی خوبی سے بنائی ہوئی تصویریں لٹک رہی تھیں۔ پلنگ کے سامنے ایک بدیشی ساخت کا آئینہ رکھا تھا۔ اور اس کے پہلو میں ایک زنگ خوردہ میخ پر ایک سارنگی اور ایک گجرا آویزاں تھے +

میری نظریں اس ساز پر پڑتے ہی نامعلوم کیوں الجھ کر رہ گئیں۔ میں اسے کھڑا گھور رہا تھا۔ اور اپنے بدن میں ایک عجیب جھرجھری سی محسوس کر رہا تھا۔ مجھے سارنگی لرزتی نظر آ رہی تھی۔ اور پھر ایک دھیمی سی آہ سنائی دی۔ جیسے کوئی کسی کے کان میں کہہ رہا ہو۔ "مجھے لے چلو۔ مجھے لے چلو" +

میں گھبرایا ہوا چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ مگر کمرے میں کوئی بھی نہ تھا۔ وہ آہ بھری آواز پھر میرے کانوں تک پہنچی۔ اور جیسے کوئی خواب میں ہوتا ہے۔ میں نے سارنگی دیوار سے اتاری۔ اس وقت مجھے کسی کے چلنے کی آہٹ سنائی دی۔ میں کھڑکی میں سے کودنے کے لئے تیار ہو گیا۔ میں ابھی کھڑکی کے پاس ہی پہنچا تھا۔ کہ چند سکھ سپاہی تیز ہوا کے جھونکے کی طرح دروازے سے داخل ہوئے۔! میں باہر باغ میں کود پڑا۔ اور تھوڑی دیر بعد شاہراہ پر پہنچ گیا۔ شہر میں لوگوں نے کہرام بپا کر رکھا تھا۔ لیکن میں آدھے گھنٹے میں یہ سب شور و غل پیچھے چھوڑ آیا اور شام کے قریب ایک کیلے کے درخت کے نیچے ذرا دم لینے کو ٹھہر گیا +

میں نے پھر ایک دفعہ اس سارنگی کو دیکھا۔ میں اسے دونوں ہاتھوں میں تھامے ہوئے تھا۔ یہ ایک

نہایت ہی خوبصورت ساز تھا۔ معلوم ہوتا تھا کسی اعلےٰ کاریگر نے اسے بڑی محبّت سے تراشا ہے میں نے پھونکوں سے گرد و غبار کو دُور کیا۔ اور اُسے اُلٹ لیا۔ کچھ حروف لکڑی کے دستے پر کندہ نظر پڑے۔ غور سے دیکھنے پر مجھے اس پر "رضیہ" پڑھ کر سخت تعجّب ہوُا۔ میں حیران تھا۔ کہ یہ الفاظ کیا معنی رکھتے ہیں۔ گز کو اُٹھا کر میں نے یوں ہی تاروں پر چلانا شروع کیا۔ اس وقت ایک عجیب واقعہ پیش آیا سارنگی کے تاروں میں سے ایک پُراسرار نغمہ نکلنے لگا۔ ایک نیا راگ، ایک حیرت انگیز راگ، جسے نہ میں جانتا تھا۔ اور نہ میں نے کسی سے سُنا تھا۔

میرے ہاتھ حرکت کرتے تھے۔ مگر مجھے ان پر کوئی قابو نہ تھا۔ جیسے کسی سحر کے زیرِ اثر حرکت کر رہے ہوں۔ سُروں کی ایک مدھم غمناک لے اُٹھی۔ جس میں آہستہ آہستہ ایک دردناک فریاد کی ساحرانہ کیفیت پیدا ہو گئی۔ ایسی وجدانی کیفیت کہ سارنگی لرزنے لگی اور سسکیاں بھرنے لگی۔ اس عجیب و غریب موسیقی کی لہروں سے فضا لبریز ہو گئی۔ یہاں تک کہ میں نے خوف زدہ ہو کر اسے نیچے گرا دیا۔ میرے ہاتھوں سے وہ گھنی نرم گھاس پر ایک آہ کی آواز کے ساتھ گر پڑی۔ مجھے ترس آ گیا۔ دل رحم اور ہمدردی کے جذبات سے لبریز ہو گیا۔ جیسے سارنگی کوئی انسان تھا!

رات کے وقت میں اپنے گھر پہنچ گیا۔ میرے والد مجھے دیکھکر بہت خوش اور آپ ہی میرے کھانے پینے کی چیزیں لا لاکر رکھنے لگے۔ میری والدہ مدت ہوئی مر چکی تھی! رات وقت ہم دیر تک مختلف باتیں کرتے رہے۔ اور میں دن کے واقعات بیان کرتا رہا میں نے سارنگی اور گز اپنے کمرے کی دیوار پر کھونٹی کے ساتھ آویزاں کر دیئے۔ جہاں ایک نہایت ہی بوسیدہ ایرانی قالین لٹکا ہوُا تھا۔ یہ قالین ہمارا پُرانا خاندانی نشان تھا۔

جب میں سونے کے لئے چلا۔ تو میں نے اپنے اندر وہی پہلی سی جھُرجھری محسوس کی۔ کوئی شے مجھے پھر اس کی طرف کھینچے لئے جا رہی تھی۔ اور میں بڑی دھیمی آواز سے یہ الفاظ سُن رہا تھا۔ "مجھے لے چلو۔ مجھے لے چلو"!

میں تکان سے چوُر اور آبلہ پا تھا۔ اور اس آرزو سے اندر داخل ہوُا تھا۔ کہ جاتے ہی اپنے آپ کو چارپائی پر پھینک دوں۔ مگر میں اس پُر درد زیرِ لب التجا کی تاب نہ لا سکا۔ اور جیسے کوئی خواب دیکھ رہا ہو۔ میں نے سارنگی اُٹھائی اور اس کی تاروں پر گز چلانا شروع کر دیا۔ میرے ہاتھ

اس کی ساحرانہ قوت کے زیرِ اثر بڑی تیزی کے ساتھ حرکت کر رہے تھے۔ یہ حالت کب تک طاری رہی؟ مجھے کچھ معلوم نہیں۔ میں نے اپنے کاندھے پر ایک ہاتھ کا بوجھ محسوس کیا۔ میرے والد میرے پاس کھڑے تھے۔ جذبات سے لرزتی ہوئی آواز میں بولے "برلطی بیٹا تم غضب کے سازندے ہو تمہاری قابلیت بے اندازہ ہے۔ میں نے ایسا راگ پہلے کبھی نہیں سُنا۔ مگر بیٹا رات ختم ہونے کو آئی ہے۔ اب تمہیں آرام کرنا چاہئے"۔ میں چپ چاپ اُٹھا۔ ساز کو لٹکا دیا۔ اور اپنے آپ کو بان کی چارپائی پر پھینک کر آن کی آن میں نیند کی گہرائیوں میں ڈوب گیا۔

یہ پہلی رات تھی۔ میں نے کئی راتیں اسی طرح گزاریں۔ ہر شب میں کمرے میں داخل ہوتا۔ وہی کشش مجھے دیوار پر لٹکی ہوئی سارنگی کے پاس لے جاتی۔ اور میں اسے پہروں بے خبری کے عالم میں بجاتا۔ پہلے موسیقی کی مدھم لہریں اُٹھتیں۔ پھر وحشت ناک صدائیں اور فریاد کی چیخ پکار بلند ہوتی۔ یہ پُرسوز نغمے دھیمی پُر درد گریہ وزاری کی صورت اختیار کر لیتے۔ اور آہستہ آہستہ سکوت میں تحلیل ہو جاتے۔

میرے دن سخت بے چینی سے رات کے انتظار میں کٹتے۔ مجھے اس روحانی موسیقی اور ان پُراسرار لمحوں کے سوا اور کسی چیز کی پروا نہ تھی۔ جیسے مجھ پر کسی نے جادو کر دیا ہو! اس ساز میں کونسی طاقت پوشیدہ تھی؟ ان کندہ الفاظ کا ——— اس "رضیہ اسیر" کا کیا مطلب تھا؟ کون سا سحر تھا۔ جس نے مجھے گرفتار کر رکھا تھا؟

ان دن میرے والد نے مجھ سے دریافت کیا۔ کہ میں اس طرح آدھی آدھی رات سارنگی بجانے میں کیوں صرف کر دیتا ہوں؟ میں نے جواب دیا۔ "یہ میری درباری عادات میں سے ہے"۔ میرے والد نے کہا "لیکن بیٹا تم زرد پڑ گئے ہو۔ اور تمہارے گال پچک گئے ہیں"۔ "مگر ابا جان یہ ——— رضیہ کیا ہے! رضیہ کون ہے"؟ یہ فقرے میرے مُنہ سے بے ساختہ نکل گئے۔

"رضیہ! تم سے یہ نام سُن کر مجھے سخت تعجب ہوتا ہے۔ کیونکہ برلطی بیٹا، تم تو اُس وقت دو سال کے بھی نہ تھے۔ .... رضیہ ایک رقاصہ لڑکی کا نام تھا۔ کسی دُور دراز مُلک سے آئی تھی۔ کئی لوگ اسے ایرانی بتاتے تھے"۔

"کیا اس کے متعلق کوئی حکایت مشہور ہے"؟

"ہاں تو۔ جب مہاراجہ رنجیت سنگھ جوان تھے۔ ان کے دربار میں ایک مشہور جادوگر آیا تھا۔ لوگ اسے پشاورا جادوگر کے نام سے جانتے تھے۔ وہ اپنے ساتھ ایک باندی۔ ایک دوشیزہ رقاصہ لایا۔ جو نہایت خوب صورت اور دلکش تھی۔ اور پھر حیادار اور پاک دامن بھی حد درجہ کی تھی۔ مہاراجہ کے درباری بڑے چھوٹے سب اس زرخرید حسینہ پر فریفتہ تھے۔ ایک بڑا نامی راجپوت سردار اس کا بے حد آرزومند تھا۔ اس نے ہر چند کوشش کی کہ جادوگر اسے بیچ دینے پر آمادہ ہو جائے۔ مگر وہ ناکام رہا۔ محل میں اس نوجوان راجپوت کے باغات شاہی میں۔ گھومتے پھرنے اور چاندنی میں رضیہ کی کھڑکی کے نیچے چکر کاٹنے کی خبریں اُڑنے لگیں۔ ایک روز اچانک رضیہ گم ہوگئی۔ اور وہ راجپوت محل کے صحن میں مُردہ پایا گیا اس کا سر تن سے جُدا پڑا تھا +

کچھ روز بعد پشاورا جادوگر لاہور سے چلا گیا۔ اور پھر وہ لڑکی کبھی دیکھنے میں نہ آئی۔ اور نہ اُس کے بارے میں کچھ سُنا گیا۔ اُس وقت سے موسیقی کی پُراسرار آوازیں اور گریہ وزاری کی صدائیں رضیہ کے چھوٹے کمرے سے آنے لگیں۔ اور آخر کار محل کا وہ حصہ غیر آباد ہوگیا۔ یہ ہے حکایت جو رضیہ کے متعلق مشہور ہے" +

چند دنوں بعد میں گھر سے نکلا۔ اور کچھ سامان لے کر آگرہ کی طرف روانہ ہوا۔ تاکہ وہاں جا کر پھر یہی گویوں کا پیشہ اختیار کرلوں۔ آگرے کے ایک مالدار سوداگر نے بڑے تپاک سے میرا استقبال کیا یہ میرے والد کا بڑا دوست تھا۔ میری موسیقی کی شہرت تمام آگرے اور شمالی ہند میں پھیل گئی۔ بڑے بڑے اُمرا نواب اور مہاراجے مجھے ڈھونڈھتے۔ فرمائشیں کرتے اور دعوتیں دیتے تھے۔ میں بہت جلد مالدار ہوگیا۔ مگر میرا دل بے چین تھا۔ میری روح اس سحر طراز سارنگی سے مسحور تھی۔ اس نغمے کی پُرجوش فریادیں میرے دل کو تار تار کئے دیتی تھیں۔ اور دردبھری سُریں میری روح کو پریشان رکھتی تھیں میرے اندر ان التجاؤں کو پُورا کرنے کی اُمنگیں اُٹھتیں۔ اور میں ان تاثرات سے پہروں چُپ چاپ بیٹھا کانپتا رہتا۔ بعض اوقات یہ نغمہ ایک دردناک چیخ کے ساتھ بند ہو جاتا۔ میں اسے انسانی چیخ تصور کرتا۔ جو دم گھٹنے کے باعث نزع میں نکل جاتی ہے +

ایک رات اس ساز میں سے ایک زخمی پرندے کی سی تیز اور چبھتی ہوئی چیخ نکلی! آگرے کے لوگ باہم سرگوشیاں کرنے لگے۔ کہ یہ کیسا مغنی جادوگر ہے +

میرے عمر رسیدہ والد کا انتقال ہو چکا تھا۔ میں رفتہ رفتہ اپنے اس پیشے سے دست بردار ہوتا گیا۔ لیکن سارنگی نے اب تک مجھے اپنی حراست سے آزاد نہ کیا تھا۔ مجھے آگرے آئے ہوئے تین سال گزر چکے تھے۔ اب میں محفلوں میں بہت کم آتا جاتا تھا۔ اور اب وہ میری پہلی سی شہرت خاموش ہوگئی تھی +

میں ویرانوں کی تلاش میں رہتا تھا۔ اپنی راتیں اس عجیب وغریب موسیقی میں صرف کرتا اور دن موہوم التجاؤں اور تشنہ کام آرزوؤں میں گزارتا +

ایک رات میں جمنا کے کنارے دیوانہ وار پھر رہا تھا۔ چاند بھرپور تھا۔ اور ساری دنیا اس کی روپہلی روشنی کے طوفان میں غرق! دریا کچھ گنگناتا ہوا بہتا چلا جارہا تھا +

میں سارنگی کو ہاتھوں میں لئے کھڑا تھا۔ میرے سودا زدہ دماغ میں خیالات کا ایک ہنگامہ برپا ہوگیا۔ "مجھے اس اسرار سحر کے زیر اثر کب تک رہنا ہے؟ اس پر جوش التجا کا کیا مطلب ہے؟ "مجھے لے چلو۔ مجھے لے چلو" کیا میں کبھی بھی اس کا جواب دینے کے قابل نہ ہوسکوں گا؟ میں ان خیالات میں ڈوبا ہوا دریا کے کنارے کنارے، تنہا، خواب کی سی کیفیت میں چلتا گیا۔ مجھے کئی راتیں جاگتے گزر چکی تھیں، اور میری ٹانگیں تھکن سے چور ہو رہی تھیں +

دفعتاً میں ایک پتھر سے ٹھوکر کھا کر منہ کے بل دھم سے گر پڑا۔ میرا دایاں بازو جو میں نے گرتے وقت پھیلا دیا تھا۔ ایک چٹان سے ٹکرایا اور ٹوٹ گیا۔ یہ تب سے بیکار ہے۔ میں نے اب اسے پہلے کی طرح کبھی استعمال نہیں کیا +

میرے ہاتھ سے وہ شغل طرب جاتا رہا۔ سارنگی ٹکڑے ٹکڑے ہوگئی +

اب ایک مدھم سی گہری آہ کہیں اوپر سے سنائی دی۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ آہ۔ اس منظر نے مجھے اب تک مبہوت کر رکھا ہے۔ ایک حسین دوشیزہ کا نہایت ہی خوب صورت اور براق کا سا بلوری "انگارہ" چاند کی روپہلی کرنوں پر تیر رہا تھا۔ بڑی بڑی گہری اور گداز سے لبریز آنکھوں میں سے یاس و حرماں کے جذبے جھلک رہے تھے۔ اور چہرہ۔ اُف! میں کس طرح اس

پاکیزہ سحر کاری اور پُرشکوہ حسن کو بیان کروں! یہ صرف ایک جھلک تھی۔ میرے دیکھتے دیکھتے یہ روحانی شکل چاند کی ملائم روشنی میں تحلیل ہوگئی +

اس محویت کے عالم میں مجھ پر ایک گہرے سکوت کی حالت طاری ہوگئی۔ اب میرا دل مطمئن تھا میں آزاد تھا + ...

شکستہ سارنگی کے ٹکڑوں میں ایک تہ شدہ جھلی کے کاغذ کا پُرزہ میری نظروں کو کھینچ رہا تھا۔ میں نے اسے اُٹھا لیا۔ تہ کھول کر دیکھا۔ تو اس پر یہ الفاظ لکھے تھے۔ "رضیہ تجھے اپنے گُناہ کی اس طرح سزا ملی"۔ یہ ہے میری کہانی! ــــــ"

بربطی خاموش ہوگیا تھا۔ آخر کار میں نے کہا۔" اے نامدار مغنّی یہ رضیہ کی آزادی اور جادو کے متعلق جو کچھ تم نے سُنایا ہے۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آیا"+

اس نے ایک نہایت سنجیدہ انداز سے لفظوں کو ٹھہرٹھہرا کر جواب دیا:"یہ وہ جادو ہے۔ جو کبھی کبھی دُنیا میں نظر آتا ہے۔ ناشاد روح جو دُنیوی خواہشات میں جکڑی ہوئی ہے۔ موسیقی کے زور سے اپنا دامن جھٹک کر عالمِ بالا تک جا پہنچتی ہے"+

بربطی مغنی کہیں غائب ہوگیا تھا۔ میں چونک پڑا۔ جیسے کوئی خواب دیکھ کر اُٹھا ہو۔ میرے کپڑے رات کی اوس سے تر تھے۔ اور چاند کی کرنیں جمنا کے نغمہ ریز سکون میں سو رہی تھیں

(ہارون)

داغ اور امیر

نفسیات شاعری پر ایک نظر

(از جناب محمد دین صاحب تاثیر - ایم - اے)

جملہ فنونِ جمیلہ (شاعری ہو یا مصوری) کی دو قسمیں ہیں۔ اوّل محض واقعات کی ترجمانی۔ دوئم واقعات پر اظہار خیالات۔ ایک منظور کی تصویر ہوتی ہے اور دوسری ناظر کی۔ یہ صحیح ہے کہ واقعات کی ترجمانی خواہ وہ کسی اخبار کی رپورٹ ہی کیوں نہ ہوں۔ ترجمان کے ذہن کو ساتھ لئے ہوئے ہوتی ہے۔ اور ایک ہی واقعہ کو دو مختلف شخص مختلف انداز سے بیان کر سکتے ہیں۔ مگر آرٹ میں غیر شعوری حالات کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ مصوری میں قسم اوّل کے حامی کونسٹبل اور لٹن وغیرہ ہیں۔ مگر یہ لوگ کسی شمار میں نہیں۔ (ریمبرینٹ[۱]۔ روبنز[۲] وغیرہ محض ترجمان نہیں) اور دوسری قسم کے نمائندے بوٹیچلی[۳]۔ پکیسو۔ بہزاد - چغتائی - اور ہوکیسی - وغیرہ ہیں - شاعری میں اس دوسری قسم کے علم بردار مولانا رومی - اور اقبال ہیں - یہ لوگ روزمرہ زندگی کے واقعات بیان نہیں کرتے - بلکہ ان پر اپنی آرا (جذبات میں ڈوبی ہوئی آرا) کا اظہار کرتے ہیں - اسی لئے اقبال کی زبان روزمرہ گفتگو کی زبان نہیں اور مولانا روم ماہرینِ علم بلاغت کے بقول ہر اصول کو توڑ دیتے ہیں۔ تعقید اور عیوبِ قافیہ اُن کے کلام کے امتیازی نشانات ہیں ✦

داغ ترجمانِ واقعات ہے۔ اور اسی لئے اس کی زبان روزمرہ کی زبان ہے۔ اس کے فقرے چست اور محاورے میں ڈوبے ہوئے ہوتے ہیں - اس کا دیوان ایک مسلسل گفتگو ہے۔ داغ کا فن میر باقر علی داستان گو کا فن ہے۔

سُن کر مرا فسانہ اُنہیں لطف آگیا
سُنتا ہوں اب کہ روز طلب قصہ خواں کی ہے

داغ کی زبان اس کے طرز خیال کی صحیح ترجمان ہے۔ اور اُس کا طرزِ خیال واقعات کا ترجمان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ داغ کا بدترین شعر بھی اس معیار پر

[۱] Rembrandt
[۲] Rubens
[۳] Boticelli

پورا اُترتا ہے۔ نقص محض انتخابِ واقع کا ہوگا۔ واقعہ کی صحت کا کبھی نہ ہوگا۔ سوقیت فحاشی۔ اخلاقی عیب ہیں۔ مگر نہایت افسوس ہے۔ کہ یہ عیب دُنیا میں بہت عام ہیں +

داغ واقعات بیان کرتے ہوئے زندگی کے ہر شعبے کو لے لیتا ہے۔ اس کے کلام میں ایسے اشعار بھی ہیں ؎

تم کو ہے وصل غیر سے انکار
اور جو ہم نے آ کے دیکھ لیا

(یہ موقع ہر چند کہ اخلاقیات کے اعتبار سے نہایت مذموم ہے مگر بہت عام ہے)

؎ کل غیر کے بھی سامنے جھپکے گی تیری آنکھ
دن کو مزا دکھائیگا اس رات کا لحاظ

(اس شعر میں "بھی" بقول کسے قابل غور ہے)

؎ کہاں تھے رات کو ہم سے ذرا نگاہ ملے
تلاش میں ہو کہ جھوٹا کوئی گواہ ملے

؎ جوش پر اور بھی کافر کی جوانی آتی
ہاتھ میرا جو ترے سینے پہ اکثر پھرتا

لیکن داغ ہی کے کلام میں یہ شعر بھی ہیں +

؎ اللہ رے کشاکشِ دیر و حرم کہ میں
ظالم ہزار ہاتھ سے دامن دریدہ ہوں

؎ اے آرزوئے تازہ نہ کر مجھ سے چھیڑ چھاڑ
میں پائے شوق و دستِ تمنا بریدہ ہوں

اسی زمین میں وہ شعر بھی ہے جسے غالب نے بے انتہا پسند کیا تھا +

؎ اُفتادگی پہ بھی نہ گئی اُس کی جستجو
گویا زمیں پہ سایۂ مُرغِ پریدہ ہوں

مگر یہ داغ کا ابتدائی "گلزارِ داغ" کا رنگ ہے۔ درباری زندگی نے یہ بات بالکل کھو دی۔ داغ کی امتیازی خوبی وہ طرز ہے۔ جسے عام طور پر تغزّل کہا جاتا ہے۔ اور اس تغزّل میں وقوعہ بندی یا معاملے کا باب داغ کے لئے مخصوص ہے۔ داغ کا ایک ایک شعر ایک مستقل ڈرامہ ہوتا ہے۔ مکالمہ۔ پلاٹ۔ کیرکٹر۔ سب کچھ پایا جاتا ہے۔ بولنے والے کا لہجہ۔ طنز۔ تمسخر۔ غرض محرکاتِ ذہنی کا ایک مکمل تجزیہ ہوتا ہے +

؎ سرِ محفل مجھی سے پردہ کرنا تھا تجھے ظالم
پھر اُس پر یہ قیامت غیر کے دامن سے مُنہ ڈھکا

؎ یہ بات کیا دمِ رفتار ہوتی آتی ہے
کہ اپنے سائے سے تکرار ہوتی آتی ہے

؎ وہ میرا چھیڑنا آغازِ اُلفت میں شکایت سے
وہ رکھ کر ہاتھ کانوں پر ترا کہنا کہ بھر پایا

مصرعۂ اوّل کو غور سے دیکھئے کس طرح ایک خیال پر دوسرا خیال آ گیا ہے۔ پہلے محض چھیڑ ہے۔ پھر ایک خاص وقت کی چھیڑ ہے۔ اور پھر اس چھیڑ میں

شکایت کی تلخی بھی موجود ہے اس طرح ایک متعین جذباتی فضا قائم ہو گئی ہے۔ دوسرے مصرعہ میں محض گفتگو ہی نہیں بلکہ تمثیل بھی موجود ہے۔ اور "بھر پایا" کا فقرہ کہنے والے کے لہجے کو بھی ظاہر کئے دیتا ہے اور ساتھ ہی متکلمین کی ذہنیت بھی معلوم ہو جاتی ہے۔ اتنے بڑے مرقع کا ایک شعر کے چوکھٹے میں آجانا داغ کے کمال کو آئینہ کرتا ہے +

داغ کنایہ کا۔ جو مصوری۔ شاعری اور ہر فن جمیل کی جان ہے۔ پورا ماہر ہے۔ وہ خوب جانتا ہے۔ کہ آرٹسٹ کو انتخاب سے کام لینا چاہئے۔ اور فقط ضروری جزئیات ہی کو بیان کرنا چاہئے۔ دو خط آنکھ کے جذباتی جھکاؤ کے لئے کافی ہیں۔ ایک لہرائی ہوئی لکیر محسوسات سے مرتعش انگلیوں کو ظاہر کر دیتی ہے۔ یہ ہے کمال مصوری اور کامل شاعر بھی محبوب کا پورا حلیہ نہیں بتاتا۔ کان۔ ناک۔ منہ۔ دانت وغیرہ کی الگ الگ تشریح نہیں کرتا۔ لیکن ایسا زندہ اسکیچ[1] کھینچتا ہے۔ کہ سامع خود رنگ آمیزی کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اور اس طرح ایک ایسی یاد رہ جانے والی تصویر تیار ہوتی ہے جو شاعر اور سامع دونوں کی کوششوں کا نتیجہ ہوتی ہے داغ کا شعر ہے

؎ اک داستانہ سر سے پاؤں تک چھائی ہوئی
اُف تری کافر جوانی جوش پر آئی ہوئی

اُردو شاعری میں "اُف" کا اس سے زیادہ برمحل استعمال شاید ہی ہوا ہو۔ مستانہ ادائی اور جوشِ جوانی غیر مادی کیفیات اور مادی حالات دونوں پر مشتمل ہیں۔ اور "اُف" ان ہردو کے تاثرات کا نتیجہ ہے +

یہی کنایہ یعنی محض ضروری جزئیات کا انتخاب ہے۔ کہ داغ کے بہت سے مصرعہ ہائے ثانی بالکل غیر متوقع ہوتے ہیں۔ داغ کسی سین یا موقع۔ یا کیفیت کا ایسا پہلو لیتا ہے جو نہایت ضروری مگر غیر معمولی ہوتا ہے۔ اور اس سے تمام چیز یکایک سامع کے سامنے آجاتی ہے۔ ایک مصرع ہے۔ "شب وصل ایسی کھلی چاندنی" یہ بظاہر ایک نہایت ہی معمولی منظر ہے۔ جسے شاعر عموماً پیش کرتے رہتے ہیں۔ مگر داغ اس کا ایک نیا پہلو لیتا ہے۔ اور اس طرح۔ کہ چاندنی اپنی پوری چمک کے ساتھ جلوہ نما ہو جاتی ہے + کہتا ہے ؎

شب وصل ایسی کھلی چاندنی
وہ گھبرا کے بولے سحر ہو گئی

یہ تو ایک منظر تھا۔ غیر مادی حالات کو بھی اسی طرح بیان کرتے ہیں ؎

حقیقت میں ہو تم دنیا سے بہتر

---

[1] اسکیچ - بیرنگ - (Sketch)

حقیقت میں مگر دُنیا ہی کیا ہے

داؔغ لطیف جذبات کا تجزیہ ایک ماہر نفسیات کی طرح کرتا ہے۔ اور ایک جذبے کے موہوم سے موہوم اجزا کو سامنے لے آتا ہے۔

؎ عرضِ وفا پہ دیکھنا اُس کی ادائے دل فریب
دل میں کچھ اعتبار سا۔ آنکھ میں کچھ ملال سا

یہاں "سا" کی موہومیّت اہلِ تغزل ہے۔ یہ تو ایک مخصوص موقع تھا۔ جملہ عاشقانہ جذبات کے متعلق اسی غزل کا مطلع ہے ؎

سینے میں اب کہاں وہ جوش۔ وہ بھی تھا اک اُبال سا
بیٹھ گیا کچھ اُٹھتے ہی۔ چھوڑ گیا ملال سا

ظاہر ہے۔ کہ انیسویں صدی کے دَورِ انحطاط میں۔ یہ شاعری از حد مقبول ہوگی۔ ۱۸۵۷ء کے جنگ انقلاب نے تمام قوم کو چُور چُور کر دیا تھا۔ اور اب ذہن سستانا چاہتے تھے۔ داؔغ کی شاعری جس میں غاؔلب کے سے گہرے تفکرات نہیں ہوتے اسی ماحول کی پروردہ ہے۔ لوگ شاعری کو ایک خواب آور کہانی۔ ایک میٹھی لوری سمجھنے لگے +

دہلی جو ایک عظیم الشان سلطنت کا مرکز تھی ۱۸۵۷ء سے بہت پہلے ایک چار دیواری کا دارالخلافہ بن کر رہ گئی۔ اور وہ لوگ جو پامیر سے راس کماری تک۔ اور غزنی سے برہم پُتر تک حکمراں تھے اب لکھنؤ کو پورب یعنی مشرق اقصےٰ سمجھنے لگے۔ ہدایت ؎

ہزار حیف کہ دلی سا شہر ویراں کر
کیا ہے یاروں نے آبادِ مُلکِ پورب کو!

مگر اس اُجڑی ہوئی بستی میں ابھی تک پُرانی تہذیب کے آثار باقی تھے۔ اور یہاں کے لوگ جہاں جہاں سے گزرتے تھے۔ مغلیہ روایات کے بیج بکھیرتے جاتے تھے۔ مگر ٹوٹی پھوٹی عمارت کے مسالے سے جس قسم کی تعمیر تیار ہو سکتی ہے۔ ظاہر ہے۔ وہ نغمہ جس نے تاج محل کے حُسن۔ اورنگ زیب کی عدالت۔ جہانگیری مصوری۔ اور عرفی و نظیری کی شاعری سے ترکیب پائی تھی۔ دلی کے ایوانوں میں محض ایک گونج ہو کر رہ گیا تھا۔ اور لکھنؤ والوں نے اس گُونج کو گراموفون کے ریکارڈوں میں قید کر لیا۔ لکھنؤ کی معاشرت محض ایک نقل تھی اور نقل بھی دُھندلے نقوش کی۔ لوگ زندگی کی نقل اُتارتے تھے۔ اور شاعر شاعری کی نقل اُتارنے لگے۔ آرٹسٹ جب جذبات سے عاری ہوتا ہے۔ تو وہ مظہر ہی سے کھیلنے لگتا ہے۔ مصوّر رنگوں کی ہولی کھیلتا ہے۔ اور شاعر الفاظ سے کھیلنے لگتا ہے۔ غرض وسیلہ خود مقصد بن جاتا ہے۔ لکھنؤ سکول کی شاعری تمام تر کھیل ہی تھی۔ اور امیر ایک نہایت ہی اچھا کھلاڑی تھا +

نمونہ ملاحظہ ہو ؎

جب یادِ ابنِ ساقیِ کوثر میں مے پیوں
شامی کباب بھُن کے جگر ہو یزید کا

امام حسینؓ کو ابنِ ساقیؑ کوثر کہہ کر اُن کی یاد میں شراب پیا تاکہ اُس کا لوازمہ کباب بندھ سکے۔ کیونکہ کباب کی ایک قسم شامی ہے۔ اور قاتلانِ حسینؓ شام کے رہنے والے "شامی" تھے !!

جنگِ انقلاب نے جہاں ذہنوں کو تھکا دیا تھا۔ وہاں اُس نے ایسے تصنعات کو بھی ملیا میٹ کر دیا۔ جنگ کی خوفناک حقیقت کے بعد ایسی طفلانہ بناوٹ کی مقبولیت ناممکن تھی۔ چنانچہ اس عہد کے سب سے بڑے لکھنوی شاعر امیر مینائی نے اپنا مرآۃ الغیب کا رنگ ترک کر دیا۔ اور کھُلم کھُلا داغ کا تتبع شروع کیا۔ مگر اصل اور نقل میں وہی فرق ہے جو نغمے اور گونج میں فرق ہے۔ نقال ہمیشہ ظاہری عادات کی نقل اُتارتا ہے مغز کو چھوڑ کر سفال کا مزہ چکھتا ہے۔ اور وہ اَور کر بھی کیا سکتا ہے کیونکہ اگر اُس کا اسلوبِ تحریر اُس کے طرزِ تخئیل کا صحیح ترجمان ہو تو وہ نقال نہیں رہتا۔ اور ذہن کی بجائے اُس کا دل کام کرنے لگتا ہے۔ امیر مینائی کا ذہن اس بازیگری پر تو قادر ہو گیا۔ جو ہر فن کا خاصہ ہے مگر اُس کا دل قلبِ شاعری سے پیوست نہ ہو سکا۔ چنانچہ صنمخانۂ عشق میں محاورات۔ روزمرہ جملہ ظاہری محاسن موجود ہیں مگر یہ سب کچھ امیر اللغات میں بھی ہے۔ ہاں امیر کو اب مشاعروں میں پہلے سے زیادہ داد ملنے لگی۔ مگر جو شعر محض داد لینے کے لئے کہے گئے ہوں۔ وہ شاید کہنے والے کو خوش کر سکتے ہوں سننے والے پر کوئی دیرپا اثر نہیں ڈال سکتے ؎

شاعر کو مست کرتی ہے تعریفِ شعر امیر
سو بوتلوں کا نشہ ہے اس واہ واہ میں

اسی غزل کے باقی اشعار داغ اور امیر کی خصوصیات کو اچھی طرح واضح کرتے ہیں۔ نگاہ کے قافئے میں داغ کے اشعار ہیں ؎

دل میں سما گئی ہیں قیامت کی شوخیاں
دو چار دن رہا ہے کسی کی نگاہ میں

کیا نظارہ کس کا اشارہ کہاں کی بات
سب کچھ ہے اور کچھ نہیں نیچی نگاہ میں

اسی قافیے میں امیر کا شعر ہے ؎

وہ دیکھتے ہیں خونِ تمنا جلا کے آنکھ
مہندی لگائی جاتی ہے پائے نگاہ میں

مشہور شعر ہے۔ نگاہ کے پاؤں نکال کر اُن پر خونِ تمنا کی مہندی لگانا بہت دُور کی بات ہے مگر اس میں وہ داغ کا بیساختہ پن۔ وہ واقعیت

کہاں ۔ امیر کا مطلع ہے ؎

اندھیر کر رہی ہے یہ چشمِ سیاہ میں
شوخی کو قید کیجئے نیچی نگاہ میں

یہاں پھر اندھیر کرنا اور سیاہ چشمی کا لطف ہے۔ اور امیر ان تلازمات کو اس بے تکلفی سے لاتا ہے۔ کہ انسان فوراً داد دینے پر مجبور ہو جاتا ہے +

اگر امیر نے کہیں داغ کے طرز کو نباہ بھی لیا ہے تو یہ بھی درحقیقت داغ کی کامیابی ہے ۔ اور واقعہ یہ ہے۔ کہ داغ کا اتباع امیر کی نسبت امیر کے تلامذہ نے زیادہ کامیابی سے کیا ۔ داغ کا صحیح مدمقابل امیر نہیں ۔ بلکہ ریاض یا جلیل ہے ریاض زیادہ اور جلیل کم !!

مختصر تبصرہ

شمع شبستاں ۔ اس کتاب میں اردو کے مختلف رسائل میں سے چند بہترین فسانے جمع کئے گئے ہیں ۔ انتخاب اس خوش مذاقی سے کیا گیا ہے ۔ کہ اس سے بہتر نہیں ہو سکتا ۔ ہمارے خیال میں مختلف مصنفین کے شاہکار ایک جگہ جمع کر دینا بہت بڑی خدمت ہے ۔ خوبیوں کے لحاظ سے کتاب کی قیمت ۱۲؍ گویا کچھ بھی نہیں +
(جہانگیر بک کلب چابک سواراں لاہور سے طلب فرمائیں)

اقبال کیلنڈر ۔ سب سے اوپر علامہ اقبال مدظلہٗ کی عکسی تصویر ہے ۔ کیلنڈر میں لائق مرتب نے یہ عجیب جدت پیدا کی ہے ۔ کہ ہر ماہ کی تاریخوں کے پرچے پر علامہ ممدوح کا ایک ایک شعر موسم اور مہینے کے حالات کے حسب حال درج کیا ہے ۔ ۲؍ کے ٹکٹ بھیج کر شیخ غلام مصطفےٰ بک سیلر رنگ محل لاہور سے طلب کیجئے +

تذکرہ قوم کوگنی ۔ منشی عبدالحمید خاں صاحب کوبیرے نے ۵۶ صفحات کے ایک رسالے میں مالابار کی قوم کوگنی کے حالات لکھے ہیں ۔ زبان نہایت سلیس ہے ۔ طرز بیان بہت خوب ہے ۔ اسلامی جوشِ اخوت پیدا کرنے کے لئے کارآمد ہو سکتا ہے ۔ قیمت ۲؍ بلاسس روڈ جامع مسجد بلڈنگ بمبئی ۸ مصنف سے منگوایئے +

آیات وجدانی مرزا واجد حسین صاحب یاس یگانہ لکھنوی کے کلام کا مجموعہ ہے ۔ یہ کتاب دُنیائے شعر میں بالکل نئی قسم کی ہے ۔ دیباچہ اور محاضرات ناقدین کی خاص توجہ کے قابل ہیں ۔ ہم آئندہ نمبر میں اس کے متعلق ذرا وضاحت سے لکھنے والے ہیں انتظار فرمائیے ۔ قیمت ۱۲؍
(شیخ مبارک علی تاجر کتب اندرون لوہاری دروازہ لاہور سے منگائیے)

ایڈیٹر

موت کا قافلہ

(تصویر کا ایک رُخ)

آتی ہے آوازِ درا!
یہ قافلہ ہے موت کا
دیکھو وہ گرد اُڑاتی ہوئی　آکاش پر چڑھتی ہوئی
ہر موڑ پر مُڑتی ہوئی　ہر سمت کو بڑھتی ہوئی
حسرت بھری خاموشیاں
ہیں ساتھ ساتھ اس کے رواں
آہوں کے ڈیرے ساتھ ہیں　گہرے اندھیرے ساتھ ہیں
یہ قافلہ ہے موت کا!
آتی ہے آوازِ درا

پنجے درندوں کی طرح
بازو پرندوں کی طرح
ہے ہڈیوں کے ڈھانچ پر　افسردگی لپٹی ہوئی
ڈائن کی صورت سربسر　آزردگی لپٹی ہوئی
آنکھیں ہیں پتھرائی ہوئی
اور مُردنی چھائی ہوئی
پچکے ہوئے سے گال ہیں　بکھرے ہوئے سے بال ہیں
بازو پرندوں کی طرح
پنجے درندوں کی طرح

ہاں موت ہے یہ موت ہے!
اپنا سفر کرتی ہے طے
یعنی دیارِ ہست کو　پھرتی ہے سر کرتی ہوئی
ہر اک بلند و پست کو　زیر و زبر کرتی ہوئی
کہسار کیا میدان کیا
آباد کیا ویران کیا
یہ سب کو ٹھکراتی ہوئی　زیرِ نگیں لاتی ہوئی
اپنا سفر کرتی ہے طے
ہاں موت ہے یہ موت ہے!

اس کی خوشی ماتم میں ہے
اس کی مسرت غم میں ہے
نالے نہیں یہ درد کے　اس دیوی کا راگ ہے
جھونکے ہوائے سرد کے　اس کے نفس کی آگ ہے
جس شہر میں جلتی ہے یہ
جس راہ پر چلتی ہے یہ
آتی ہے آوازِ فغاں　اُٹھتا ہے آہوں کا دھواں
اس کی مسرت غم میں ہے
اس کی خوشی ماتم میں ہے

اس کے جلو میں ہیں رواں
گل پیرہن بانکے جواں
بوڑھے بھی ہیں بچے بھی ہیں ہیں عورتیں بھی مرد بھی
چھوٹے بھی ہیں بچے بھی ہیں احرار بھی دل سرد بھی
غافل بھی ہیں معصوم بھی
مسرور بھی مغموم بھی
مجبور بھی مختار بھی مفلوک بھی زر دار بھی
گل پیرہن بانکے جواں
اس کے جلو میں ہیں رواں

یاروں سے دل برداشتہ
پیاروں سے دل برداشتہ
یہ پریم گھاتی موت کے موہ لو بھی تج کر آئے ہیں
سارے براتی موت کے پھولوں میں سج کر آئے ہیں
عاشق وفا بھولے ہوئے
معشوق ادا بھولے ہوئے
بیوی کا دل توڑے ہوئے بچوں سے مُنہ موڑے ہوئے
پیاروں سے دل برداشتہ
یاروں سے دل برداشتہ

کہتی ہے آوازِ جرس
اللہ بس باقی ہوس
سُنتے ہیں سب شاہ و گدا یہ موت کی آواز ہے
سب ہیں اسی کے ہم نوا کتنا سُریلا ساز ہے
لاچار ہیں مجبور ہیں
اس سحر میں مسحور ہیں
یہ نیند کے ماتے ہیں سب سوتے چلے جاتے ہیں سب
کہتی ہے آوازِ جرس
اللہ بس باقی ہوس

یہ قافلہ ہے موت کا
بس یوں ہی چلتا جائیگا
اس قافلے کے ہم سفر ہر روز بڑھتے جائیں گے
سود و زیاں سے بے خبر زوروں پہ چڑھتے جائیں گے
یہ تیز رَو آتش قدم
جائیں گے تا حدِّ عدم
منزل مگر معدُوم ہے اللہ کو معلوم ہے
بس یوں ہی چلتا جائیگا
یہ قافلہ ہے موت کا!

(ابو الاثر حفیظ جالندھری)

گرامی و رومی

(مثنوی حضرتِ گرامی مدظلہٗ بطرز مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ)

اللہ اللہ چہ بیدار بختم کہ حضرت مولانا روم قدس سرہ شبے بخوابم جلوہ فرمودہ فرمودند، کہ گرامی چند نشینی ہلہ برخیز کارے بکن پیش از آنکہ کار از دست ردد و دست از کار، درحال مژہ واکردم لختے چشم بمالیدم، بگو نعم ایں بیت برخوردہ بالبِ دمساز خود گر جفتمے ۔ ہمچو نے من گفتنی ہا گفتمے +

نے کہ نالانست بیش از چوب نیست
[illegible] نالہ [illegible] از چوب نیست

چوب را نالہ دل و ریش است
[illegible] شورش مضراب است

[illegible]
[illegible]

[illegible] پردہ [illegible]
[illegible] پردہ [illegible]

[illegible]
[illegible]

سینہ [illegible] نالہ [illegible]
سینہ [illegible]

سینہ چاکاں [illegible]
[illegible] نالہ [illegible]

خندہ [illegible]
[illegible]

سخن [illegible] و مضمون نالہ
[illegible]

[illegible]
[illegible]

[illegible] ہا
[illegible] اعمال ہا

[illegible]
حال ما [illegible]

[illegible]
[illegible] الفضول

[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible] الفضول [illegible]

[illegible]
[illegible] بالعود

[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible] گرامی

آغاز!

یہ بے نظیر نظم جس پر شعرا کے دیوان نثار کئے جا سکتے ہیں۔ ایک ایسے حساس اور جوان، دماغ کا نتیجۂ فکر ہے۔ جس کا مالک "فی الحال" دُنیائے شعر میں گمنام کے نام سے مخاطب ہونا زیادہ پسند کرتا ہے۔ یاد رہے۔ کہ رسالہ کہکشاں میں ہمارے ملک کے مشہور و معروف ادیب و شاعر مولانا عبدالمجید خاں صاحب سالک بٹالوی کے بیشتر مضامین نظم و نثر "گمنام" کے نام سے مشہورِ انام ہو چکے ہیں۔ لیکن ہمارا "گمنام" کہکشاں کا مشہور "گمنام" نہیں ہے۔ ہم اُس کا نام اُس وقت تک ظاہر نہ کریں گے۔ جب تک وہ ہمیں اجازت نہ دے۔ یا جب تک شہرتِ عام کا بے باک ہاتھ اُسے بے نقاب نہ کر دے +

ایڈیٹر

(۱)

مجھے تجھ سے عشق نہیں نہیں۔ مگر اے حسینۂ نازنیں!
کہیں دُور تُو ہو اگر کبھی
تجھے ڈھونڈھتی ہو نظر کبھی
تو جگر میں اُٹھتا ہے درد سا
میرا رنگ رہتا ہے زرد سا
مگر اے حسینۂ نازنیں۔ مجھے تجھ سے عشق نہیں نہیں!!

(۲)

مجھے تجھ سے عشق نہیں نہیں۔ مگر اے حسینۂ نازنیں!
تو اگر ہو مجمع عام میں
کسی کھیل میں کسی کام میں
تو میں چھُپ کے دُور ہی دُور سے
تجھے دیکھتا ہوں غرور سے
مگر اے حسینۂ نازنیں۔ مجھے تجھ سے عشق نہیں نہیں!!

(۳)

مجھے تجھ سے عشق نہیں نہیں۔ مگر اے حسینۂ نازنیں!
تُو کہے مجھے یہ اگر کبھی
ہمیں لا دو لعل و گُہر کبھی
تو میں دُور دُور کی سوچ لوں
میں فلک کے تارے بھی نوچ لوں
یہ ثبوتِ شوق کمال دوں
ترے پاؤں پر اُنہیں ڈال دوں
مگر اے حسینۂ نازنیں۔ مجھے تجھ سے عشق نہیں نہیں!!

"گمنام"

عرضِ حال

(از جناب محمد دین صاحب تاثیر ایم۔اے)

ہرچند انکسار کا قائل نہیں ہوں میں
کہتا ہوں پھر بھی ترے قابل نہیں ہوں میں

تجھ پر عیاں ہے سب مری خاموشیوں کا حال
تُو خوب جانتا ہے کہ سائل نہیں ہوں میں

پھر کیا جو آگرا ترے قدموں پہ مثلِ گرد
تیری سُبک روی میں تو حائل نہیں ہوں میں

ہاں شعلہ ہائے عشق میں دُودِ ہوس بھی ہے
ہوں چشم و گوش بھی ہمہ تن دل نہیں ہوں میں

احساس کو سراب بھی ہے چشمۂ بقا
اے ساربان رہروِ منزل نہیں ہوں میں

وہ رودِ شور ہوں جسے صحرا نگل گیا
محتاج وقفہ ہائے مراحل نہیں ہوں میں

کچھ بھی نہیں مگر ترے قدموں کی خاک ہوں
سب کچھ بھی ہوں مگر ترے قابل نہیں ہوں میں

تازہ غزلیں

میرزا یاس یگانہ لکھنوی

غضب ہے جرمِ شور انگیز پر مجبور ہو جانا
پتے کی بات کہہ کر بے دھڑک منصور ہو جانا

دلِ نامحرمِ فردا خدا کی مار ہو تجھ پر
ابھی سے نشۂ حسنِ عمل میں چور ہو جانا

بسی ہے نکہتِ آوارہ کن نازک دماغوں میں
مبارک ہستیٔ برباد پر مغرور ہو جانا

طلسمِ پیش و پس میں گھر کے رہ جانا قیامت ہے
غنیمت ہے لگی میں اپنی حد سے دور ہو جانا

دکھائی جلوۂ باطن نے کیا کیا برق رفتاری
پلک جھپکاتے ہی حدِ نظر سے دور ہو جانا

کمالِ عشق کن آنکھوں سے دیکھے گا جمال اپنا
لپٹ کر شمع سے آخر سراپا نور ہو جانا

خان صاحب رضا علی خاں وحشت

معافی کے نہیں قابل کچھ ایسی کی خطا میں نے
کیا خونِ وفا، جس وقت کی عرضِ وفا میں نے

تری بیگانہ خوئی پر نہ ہوگی مجھ کو مایوسی
نہیں دیکھی ہے کیا تیری نگاہِ آشنا میں نے

حریفِ غفلتِ ہستی نہیں تحریکِ بیداری
نہ اٹھنا تھا نہ اٹھا گو سنی بانگِ درا میں نے

تردد میں ہے گھبرائی ہوئی سی ہے نظر اس کی
نگاہِ حسرت آگیں سے جو کی ہے التجا میں نے

ہنسا ہوں حال پر اپنے جہاں رونے کا موقع تھا
کیا ہے شکر کے پردے میں الفت کا گلا میں نے

خطا ثابت ہوئی کچھ اپنے ہی شوقِ اسیری کی
تری زلفوں کو ناحق کہہ دیا دامِ بلا میں نے

زمانے کی روش کچھ ایسی ہے یاس آفریں وحشت
مٹا یا رفتہ رفتہ دل سے نقشِ مدعا میں نے

سیّد اصغر علی صاحب احسن بی ۔ اے

جلوہ فروز ہے وہ ۔ خلوت میں انجمن میں
گلشن میں اُس کی مستی بستی ہے اُس کی بَن میں

دامن گلوں سے بھر کر لائی ہیں پھر بہاریں
صیّاد لے چلا ہے میرا قفس چمن میں

گلشن وہی ہے لیکن ظالم نے پر کتر کر
بیگانہ کر دیا ہے ۔ مجھ کو اس انجمن میں

آخر یہ راز کیا ہے ۔ کیا کہہ دیا صبا نے
اک بار پھول کھِل کر مُرجھا گیا چمن میں

دل میں لہو نہیں ہے ، آنکھوں میں دم نہیں ہے
رنگینیاں ہوں کیونکر افسانۂ کہن میں

دُنیائے آرزو میں ۔ گم ہو گیا ہوں احسن
خلوت نشیں ہوں گویا اپنی ہی انجمن میں

شاکر صدّیقی

گلشنِ دل میں ہے میرے کیا بہارِ آرزو
بے کھلے ہی رہ گیا ہے غنچۂ زارِ آرزو

ہم نشیں مجھ سے تمنّاؤں کی بربادی نہ پوچھ
ذرّہ ذرّہ ہے مرے دل کا مزارِ آرزو

کر رہا ہوں مدعا واضح میں ان سے بے کہے
ہیں مری آنکھیں بھی گویا اشتہارِ آرزو

آخری زینہ مرے قصرِ تمنّا کا ہے عرش!
میں نے رکھّی ہے بنائے اُستوارِ آرزو

سرخوشی دونوں جہاں کی دل پہ ہے چھائی ہوئی
کیف زا ہے کیا شرابِ بے خمارِ آرزو

ولولے وہ سب دلِ بے تاب کے جاتے رہے
لٹ گیا یا رب! میں ہو کر کامگارِ آرزو

کشتیِ دیدہ میں رکھ کر صورتِ لعلِ گراں
لختہائے دل کئے ہیں نے نثارِ آرزو

حال کیا شاکر کہیں قلبِ الم فرسود کا
مضطرب ہو کر بھی ہے محوِ شمارِ آرزو

یوسف گجراتی

اُن کی فتنہ طرازیاں نہ گئیں ۔۔۔ نہ گئیں بے نیازیاں نہ گئیں
وصل کا شوق دل سے کم نہوا ۔۔۔ ہجر کی شب درازیاں نہ گئیں
گرمیِ حسن میں کمی نہ ہوئی ۔۔۔ درد کی دل نوازیاں نہ گئیں
بن کے محمود عشق دل میں رہا ۔۔۔ دلبروں کی ایازیاں نہ گئیں
نہ گئی حسن کی گل افشانی
اپنی جدت طرازیاں نہ گئیں

ابوالاثر حفیظ جالندھری

مٹنے والی حسرتیں ایجاد کر لیتا ہوں میں ۔۔۔ اک جہانِ نیستی آباد کر لیتا ہوں میں
مجھ کو ان مجبوریوں پر بھی ہے اتنا اختیار ۔۔۔ آہ بھر لیتا ہوں میں فریاد کر لیتا ہوں میں
حسن بے چارہ تو ہو جاتا ہے اکثر مہرباں ۔۔۔ پھر اُسے آمادۂ بیداد کر لیتا ہوں میں
تو نہیں کہتا۔ مگر دیکھ او وفا ناآشنا ۔۔۔ اپنی ہستی کس قدر برباد کر لیتا ہوں میں
ہاں یہ ویرانہ، یہ دل، یہ آرزوؤں کا مزار ۔۔۔ تم کہو تو پھر اسے آباد کر لیتا ہوں میں
جب کوئی تازہ مصیبت ٹوٹتی ہے اے خدا ۔۔۔ ایک عادت ہے کہ تجھ کو یاد کر لیتا ہوں میں

نایاب اور بے نظیر کتابیں

الاحسان۔ جس میں لفظ صوفی کی تحقیق اور تصوف کی ابتدا اور اس کی رفتہ رفتہ ترقی کا ذکر کیا گیا ہے۔ اور آخر میں تصوف کے تمام سبقوں اور اسلام سے تطبیق اور اس کی حقانیت اور اصول پر بحث کی گئی ہے۔ **مولفہ** مولوی محمد احسان الدین صاحب علوی کاکوری **قیمت** صرف آٹھ آنے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ (۸)

رموز فطرت:۔ مرتبہ مولوی محمد مہدی صاحب اسسٹنٹ مہتمم دفتر تاریخ ریاست بھوپال

القمر۔ یعنی چاند کے حالات بموجب تحقیقات جدیدہ۔ مولفہ مولوی زاحت حسین صاحب بی۔ اے بھاگلپوری۔ **قیمت** صرف ۸ر

اعجاز القرآن۔ مصنفہ جناب مولوی محمد ابوالحسن صاحب۔ صدیقی بدایونی چیف جج عدالت دیوانی۔ حیدرآباد۔ دکن۔ اس کتاب میں آئندہ واقعات کی نسبت قرآن مجید کی متعدد آیتوں پر پیشین گوئیاں ثابت کی گئی ہیں۔ **قیمت** ۱۰ر

رسوم دہلی۔ اس کتاب میں مولوی سید احمد صاحب دہلوی۔ مصنف فرہنگ آصفیہ۔ دہلی کے مسلمانوں کی تمام رسوماتِ قدیم و حال نہایت شرح و بسط سے لکھی ہیں۔ **قیمت** ۱۲ر

سیر تبت۔ ریورنڈ احمد شاہ صاحب کی تصنیف "فور ایرس ان تبت" کا اردو ترجمہ بے انتہا دلچسپ کتاب ہے۔ ترجمہ مولوی انیس احمد صاحب سابق طالب علم مدرستہ العلوم علی گڈھ قیمت ۱۲ر

مثنویات حسن۔ حضرت میر حسن دہلوی مرحوم کی مشہور مثنوی سحر البیان المعروف بہ بینظیر و بدر منیر اور گلزار ارم نامی ایک دوسری کمیاب مثنوی جو بڑی تلاش سے ملی ہے۔ معہ ایک مقدمہ دلچسپ۔ مرتبہ مولوی سید اشرف حسین صاحب دہلوی۔ قیمت عہ

طبقات الارض۔ مولفہ مولوی مرزا مہدی خاں صاحب۔ کوکب۔ اے۔ آر۔ ایس۔ ایم ایم آر۔ اے ایس الف جی۔ ایس عہ

رسالہ علم نباتات۔ مولفہ محمد یوسف صاحب صدیقی۔ ایم۔ بی ساد۔ آر۔ ایس عہ

ملنے کا پتہ مخزن بک ایجنسی اندرون بھاٹی گیٹ لاہور



کرنال شاپ
جوتوں
اپنے بنوائے ہوئے بوٹ شوز سلیپر گرگابی وغیرہ
وغیرہ نہایت آرام دہ اور مضبوط ہونے کے علاوہ
قیمت میں نہایت ارزاں ہیں!
Students' Up-to-date
Shoes double Sole
Hand Sewn Quality No. 600 Rs. 6/-
Brown Rs. 8/8/-
Polyp Brand Oxford
Brown Quality No.
Hand Sewn
Black "
کرنال شاپ کی خصوصیتیں
(۱) مال ہمیشہ نہایت اعلیٰ قسم کا اور تازہ ترین اور مقررہ واجبی قیمت نہایت دیانتداری کے ساتھ فروخت کیا جاتا ہے۔
(۲) گاہک کو خریداری کے وقت مال کی وضاحت۔ عمدگی و نقائص سے اچھی طرح آگاہ کر دیا جاتا ہے۔
(۳) مال میں گتہ بالکل استعمال نہیں کیا جاتا ہے۔
(۴) باوجود ان تمام خوبیوں کے اگر خریدار کو خریدا ہوا مال پسند نہ آئے۔ تو گاہک کو ہر وقت اختیار ہے کہ
جب چاہے مال واپس کر کے پوری قیمت واپس لے سکتا ہے۔ یا مال بدل لے۔ بشرطیکہ مال خراب نہ ہو گیا ہو۔
تشریف لائیے
اور ہماری سچائی کی آزمائش کیجئے۔ اس کے علاوہ ہمارے یہاں ہر قسم کا
ولایتی مال تازہ اور ہر ڈیزائن کا بالکل نئے نمونہ کا دستیاب ہو سکتا ہے۔
KARNAL SHOP
ANARKALI
LAHORE
کرنال شاپ



اردو زبان کا اولین صحیفہ

دورِ جدید

مخزن

لاہور

ایڈیٹر

ابوالاثر حفیظ جالندھری

ابوالاثر حفیظ جالندھری کی تصانیف لطیف

سلام

حضور سرور کائنات کی بارگاہ میں جو منظوم سلام حفیظ کی طرف سے بطور نذرانہ ارسال کیا گیا، آج ہندوستان بھر میں اس نظم کی دھوم ہے۔ قیمت ۲ر

رقاصہ

نظم ہے جو حضرت حفیظ کا شاہکار سمجھی گئی ہے۔ بازاری کسبیاں قوم کے دامن پر ایک سیاہ دھبہ ہیں۔ اس نظم میں نہایت خوبی سے اس کے خلاف مسلمانوں ... کی گئی ہے۔ قیمت ۲ر

صبح سعادت

صبح کے وقت مسلمانوں کے مشاغل زندگی۔ رزم بزم۔ نماز۔ تسبیح و تحلیل۔ فوجوں کے کوچ معرکہ کارزار۔ فتح و نصرت وغیرہ۔ عجیب نظم ہے۔ قیمت ۴ر

ہندوستان ہمارا

راماین سے لے کر راجہ رنجیت سنگھ تک تمام تاریخی واقعات کو آسان زبان میں حفیظ صاحب نے نظم کا جامہ پہنا دیا۔ ۱۲ رنگین تصاویر۔ حجم ۴۸ صفحے۔ قیمت عہ مجلد

ملنے کا پتہ: مخزن مکتبہ ... بھاٹی گیٹ لاہور



راہرو — عمل چغتائی

دورِ جدید

رجسٹرڈ ایل نمبر ۲۰۹۷

مخزن

قیمت سالانہ للعہ ممالک غیر سے ۹ شلنگ

بذریعہ وی پی للعہ فی پرچہ ۶ر

جلد ۱ | بابت ماہ مئی ۱۹۲۷ء | نمبر ۳

تصاویر (۱) راہرو — عمل چغتائی (۲) مولوی سید ممتاز علی۔

صفدر علی خان خوشنویس رامپوری کاتب مخزن

گیلانی الیکٹرک پریس لاہور میں باہتمام ابو نظام الدین پرنٹر چھپا۔ اور میاں ظہور الدین پبلشر نے دفتر مخزن بھاٹی دروازہ لاہور سے شائع کیا

شذرات

اہل ذوق یہ خبر سن کر بہت مسرور ہونگے۔ کہ سیّد امتیاز علی تاج کا تاریخی ڈراما "انارکلی" جس کے تین منظر لاہور کے رسالہ نیرنگ خیال میں شائع ہونے پر بے انتہا مقبول ہو چکے ہیں۔ ارباب ذوق سلیم کے اصرار پر اب کتابی صورت میں شائع ہو رہا ہے۔ اور لاہور کے بعض نامور آرٹسٹ اسے اپنی نگرانی میں شائع کر رہے ہیں۔ یہ ڈراما شہنشاہ اکبر کی حرم سرا کے ایک سچے اور پُردرد واقعے سے تعلق رکھتا ہے۔ مصنف نے انارکلی اور شہزادہ سلیم (جہانگیر) کے معاشقے اور اس کے اندوہناک انجام کو ایسی خوبی سے تمثیل کیا ہے کہ ہو بہو تصویر کھینچ کر رکھدی ہے۔ غالباً ایک دو مہینے کی مدت میں کتاب تیار ہو جائے گی۔ اور نہ صرف ڈراما ہی کی دنیا میں ایک نئی شے ہوگی۔ بلکہ محاسن طباعت کے اعتبار سے بھی عدیم النظیر ہوگی۔ ہندوستان کے مایۂ ناز مصور عبدالرحمٰن چغتائی نے اس کے لئے "انارکلی" کی ایک بیش بہا تصویر عنایت کی ہے۔ کتاب نہایت پُرلطف اور محدود تعداد میں چھاپی جائے گی۔ قیمت قریباً دو روپے ہوگی۔ یہ ڈراما اشاعت سے پہلے ہی جس قدر شہرت حاصل کر چکا ہے۔ اس کا خیال کرتے ہوئے یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا۔ کہ اس کے پہلے اڈیشن کی کاپی حاصل کرنے کا یقینی طریقہ یہ ہے۔ کہ اسی وقت فرمائشیں دفتر مخزن میں رجسٹر کرالی جائیں۔

رسالہ "زمانہ" میں ہمیں یہ خبر دیکھ کر بے حد افسوس ہوا کہ یو۔پی کے ایک مشہور شاعر خان بہادر اعتبار الملک سید افتخار حسین صاحب مضطر خیرآبادی کا گوالیار میں انتقال ہو گیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔

جناب چغتائی کی جو تصویر اس مرتبہ زینتِ مخزن ہے اُس کے متعلق تاثیر صاحب نے مختصر طور پر ضروری باتیں بیان کر دی ہیں اور عصا نے میری ایک نظم بھی درج کر دی گئی ہے۔ ہم یہاں جناب میاں ایم اسلم صاحب کا شکریہ ادا کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں جنہوں نے نہایت مہربانی سے ہمیں اس بے نظیر شاہکار کا بلاک چھاپنے کی اجازت دی۔ یہ تصویر اصل میں میاں صاحب نے اپنی کتاب "عروس غربت" کی زینت کے لئے جناب چغتائی سے حاصل کی تھی۔ ہماری نظر پڑ گئی۔ اور ہم مخزن کے لئے درخواست کئے بغیر نہ رہ سکے۔ میاں صاحب کی کتاب ابھی زیرِ طبع ہے اور ظاہر ہے۔ کہ کوئی اور شخص ہوتا تو ایسی تصویر کا قبل از وقت سالے میں شائع ہو جانا گوارا نہ کرتا۔ مگر مخزن کی محبت نے اُنہیں انکار نہ کرنے دیا۔ اور تصویر کتاب کے شائع ہونے سے پیشتر ہی ملک کے سامنے آگئی۔ میاں صاحب کی تصنیف "عروس غربت" ایک پُردرد کہانی ہے جو خاص طور پر عورتوں کے لئے لکھی ہے۔ اس کی خوبی کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ اس میں دو تین ایسی تصویریں شائع کی جائینگی جن کی نظیر مصور خود بھی چاہے تو شاید ہی پیدا کر سکے۔ ہمیں معلوم ہوا ہے کہ کتاب کے لئے بے شمار درخواستیں پیشگی وصول ہو رہی ہیں۔ اور پہلا اڈیشن بہت جلد فروخت ہو جائیگا۔ یہ کتاب نسیم بک ڈپو بارود خانہ لاہور سے منگوانی چاہیئے۔ ایڈیٹر

دورِ جدید

مخزن

مولوی سیّد ممتاز علی

مولوی سیّد ممتاز علی صاحب جن کی شبیہ مبارک چھاپنے کا فخر پہلی مرتبہ صرف مخزن ہی کو حاصل ہو رہا ہے۔ اُن ستودہ صفات اور برگزیدہ ہستیوں میں سے ہیں جن پر ہر ملک اور ہر قوم فخر کرسکتی ہے۔ ہندوستانیوں اور خاص کر ہندی مسلمانوں میں ایسے افراد کی بے حد کمی رہی ہے۔ جنھوں نے ملک وقوم کی بہبود کے لئے پُورے جوش ایثار۔ مگر انتہائی خاموشی اور تحمّل سے کوئی تحریک اُٹھائی ہو۔ اور اُسے اپنی کوشش وسعی سے ہر طرح کامیاب بنایا اور کامیاب دیکھا ہو۔ سر سیّد احمد خاں مرحوم کے بعد شاید مولوی ممتاز علی ہی وہ خوش قسمت مسلمان ہیں۔ جنہیں ایک اہم اور عظیم الشّان تحریک کے بانی۔ محرک اور انجام تک پہنچانے کا فخر حاصل ہوا *

سلطنت مُغلیہ کا چراغ گُل ہونے کے بعد قوم کے افراد میں جو علمی انحطاط اور ضعف پیدا ہوگیا تھا۔

اس کا ازالہ کسی حد تک سر سید مرحوم کی والہانہ سرگرمیوں نے کر دیا۔ مگر اُن کی تحریک صرف فرقۂ ذکور تک محدود تھی۔ حالانکہ علم و تہذیب کی روشنی اُن تاریک گھروں میں بھی ازبس ضروری تھی۔ جہاں پرورش پاکر فرزندانِ قوم پھولتے بڑھتے اور پروان چڑھتے ہیں + ہندوستان میں فرقۂ نسواں کچھ تو پہلے ہی سے کمزور اور بے دست و پا رہا ہے۔ اور کچھ عام جہالت اور بے معنی خود داری کے غلط احساس نے مردوں کو اس اہم فریضے سے متنفر اور مجتنب رکھا۔ یہاں تک کہ عورت اور جہالت لازم و ملزوم عورت اور نقصِ عقل ضرب المثل ہو گئی +

ممکن ہے اس عام کمزوری کا احساس کسی اَور کے دل میں بھی پیدا ہوا ہو۔ مگر سب سے پہلے جس انسان کے دل میں اس احساس نے ایک تڑپ پیدا کی اور جس شخص نے اس تڑپ کو محسوس کر کے عملی کام کرنے کا بیڑا اُٹھایا۔ اور اس کے لئے اپنی ساری زندگی وقف کر دی۔ وہ صرف سیّد ممتاز علی صاحب ہیں + یہ درست ہے۔ کہ ممدوح کا نامِ نامی کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ مگر ہم دیکھتے ہیں۔ کہ ملک و قوم کو ان کے صحیح حالاتِ زندگی کچھ بھی معلوم نہیں کسی حد تک آگاہی ہے۔ تو صرف عورتوں کے اُس طبقے میں ہے۔ جو آپ کے ہفتہ وار اخبار تہذیبِ نسواں کا مطالعہ کرتی ہیں۔ بلکہ شاید اُن ترقی یافتہ خواتین کو بھی اپنے خضرِ راہ کی قابل تقلید زندگی کے حالات بہت کم معلوم ہیں۔ جس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے۔ کہ ممدوح ہمیشہ کسرِ نفسی کے باعث اپنے حالات کے اظہار سے محترز رہے +

ہمیں آپ کے حالاتِ زندگی جس قدر بھی معلوم ہو سکے ہیں۔ اُن میں سے کچھ تو اُن سعید دنوں کا طفیل ہے۔ جب ہم پھول اور تہذیب النسواں کی ادارت میں ممدوح کے نائب کے طور پر کام کرتے تھے۔ اور کچھ آپ کے فرزند ارجمند سیّد امتیاز علی صاحب تاج نے بیان فرمائے ہیں۔ یہ معلومات اس قدر قلیل ہیں کہ ممدوح کی رفیع شخصیت اور اُن کے عظیم الشان کام کے لحاظ سے گویا کچھ بھی نہیں۔ تاہم اس قابل ہیں۔ کہ اُن پر ایک مستقل کتاب لکھی جا سکے۔ اگر وقت نے مساعدت کی۔ تو آئندہ سال اس کام کی تکمیل ہو جائیگی۔ چونکہ مخزن کے صفحات میں ان کا عشرِ عشیر بھی سما نہیں سکتا۔ اس لئے صرف ایک مختصر خاکے پر اکتفا کی جاتی ہے +

۲۷ ستمبر ۱۸۶۰ء آپ کا یومِ ولادت ہے۔ اتفاق سے یہ دن میلادالنبیؐ کا بھی تھا۔ خدا ہی کو منظور تھا۔ کہ رحمۃ اللعالمین کے گھرانے سے اُسی روز وہ بچہ بھی عالمِ شہود میں آیا جسے بڑے ہو کر اپنے جد کے اُسوۂ حسنہ کی تقلید میں بہت بڑا مصلح اور عالمِ نسواں کی جہالت اور درماندگی کو دُور کر کے اُسے راہِ ترقی پر گامزن کرنا تھا۔

پانچ برس کی عمر میں تعلیم و تربیت کا آغاز ہوا۔ دیوبند میں میاں جی سید عبداللہ عرف منّا شاہ اُس زمانے میں بہت مشہور بزرگ تھے۔ اُن کے مکتب میں پڑھنے بٹھایا گیا۔ اور پارۂ عم اور پارۂ الم اور خالق باری و کریما آپ نے شاہ صاحب موصوف سے پڑھ لیا +

تھوڑے عرصے کے بعد آپ کے والد ماجد نے پھر راول پنڈی بلا لیا۔ اور باقاعدہ پوری توجہ سے تعلیم دلانی شروع کی + سید صاحب کو بالکل ایک انوکھے طریقے پر تعلیم دی گئی۔ یعنی قرآن مجید تین پارے سے زیادہ نہیں پڑھایا گیا۔ بلکہ اس کی بجائے عربی کی صرف و نحو پڑھانی شروع کر دی گئی۔ اور جتنے عرصے میں قرآن مجید ختم ہوتا اتنے عرصے میں یا اس سے کسی قدر زیادہ مدّت میں وہ شافیہ و شرح ملّا پڑھ چکے تھے اب وہ فارسی بھی پڑھتے تھے۔ جو اُنہوں نے ابوالفضل و سکندر نامے تک پڑھی۔ اور فقہ و منطق کی کتابیں پڑھنے لگے۔ ان ایّام میں حسن ابدال کے اطراف میں موضع غورغشتی میں ایک بڑے فاضل ملّا تھے جو ملّا فیضی کے نام سے معروف تھے ان کا درس بہت مشہور تھا۔ کابل۔ بلخ و بخارا تک کے طلبا پڑھنے آتے تھے۔ سید صاحب کے والد ماجد نے مُلّا صاحب کو اپنے ہاں بلانا چاہا۔ مگر وہ درس کو چھوڑ کر نہ آسکے۔ اور اپنے ایک بھائی کو اپنی بجائے سید صاحب کی تعلیم کے لئے بھیجا۔ سید صاحب نے اُن سے فقہ میں کنز الدقائق اور منطق کی کتابیں میر قطبی تک پڑھیں +

۱۸۷۳ء۔ ۱۳ برس کی عمر میں آپ کی والدہ کا انتقال ہو گیا۔ آپ کو بہت صدمہ ہوا۔ اور آپ دیوبند چلے گئے۔ اور وہاں کے مدرسۂ عربی میں داخل ہو گئے۔ اس مدرسے کے بانی مولانا مولوی محمد قاسم صاحب نانوتوی تھے۔ اور وہ اس زمانے میں زندہ تھے۔ ہر چند مدرسۂ مذکورہ کے بانی تھے۔ مگر آپ نے مدرسۂ مذکورہ میں کوئی تعلیم و تدریس کا کام نہیں کیا تھا + اس زمانے میں مدرسے کے مدرسِ اعلےٰ مولوی محمد یعقوب صاحب تھے۔ جو مولوی مملوک علی صاحب مدرس اعلےٰ عربی کالج دہلی کے خلف الرشید تھے۔ سید صاحب کے والد ماجد مولوی سید ذوالفقار علی صاحب کو مولوی سید مملوک علی صاحب سے تلمّذ تھا۔ سید ممتاز علی صاحب مولوی یعقوب صاحب کے شاگرد بنے۔ مدرسے میں آپ نے مولوی محمد یعقوب صاحب نانوتوی۔ مولوی سید احمد صاحب دہلوی۔ ملّا محمود صاحب دیوبندی اور مولوی محمد صدیق صاحب انبیٹھوی سے تحصیل علوم عربیہ کی +

مولانا مولوی محمد قاسم صاحب مرحوم کی صحبت سے فائدہ اُٹھایا۔ اور آپ کے بہت سے وعظ سُنے۔ انہیں ایّام میں مولوی شیخ محمود حسن صاحب بھی جو بعد میں شیخ الہند اور اسیر مالٹا کے نام سے مشہور ہوئے۔

اس مدرسے میں پڑھتے تھے۔ چونکہ شیخ صاحب مرحوم کے والد ماجد مولوی شیخ ذوالفقار علی صاحب نے عربی کالج دہلی میں سید ممتاز علی صاحب کے والدِ ماجد کے ساتھ جن کے وہ ہمنام بھی تھے۔ تحصیل علم کی تھی۔ سیّد ممتاز علی صاحب کی مولوی محمود حسن صاحب سے بہت دوستی ہوگئی تھی +

سیّد ممتاز علی صاحب کے والد کچھ عرصے کے بعد فیروز پور کے اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر ہوگئے۔ اور آپ نے اس حال میں کہ ابھی سیّد صاحب کی کچھ ادبی کتابیں ختم نہ ہوئی تھیں ان کو فیروز پور بُلا لیا +

۱۸۷۴ء میں انگریزی پڑھنی شروع کی۔ انگریزی تعلیم کے لئے گھر پر اُستاد رکھا گیا۔ اور ہونہار شاگرد نے دو سال میں مڈل پاس کر لیا۔ ۱۸۷۶ء سے لاہور کے گورنمنٹ ہائی اسکول میں داخل ہوئے اور ۱۸۸۲ء میں بی۔اے کے امتحان میں بیٹھے مگر کامیاب نہ ہو سکے اور دوبارہ امتحان کا ارادہ ترک کر دیا +

شمس العلما مولوی محمد حسین آزاد لاہور ہی میں تھے۔ وہ آپ کے دوستوں میں سے تھے۔ آزاد کے والد محمد باقر اور مولوی ذوالفقار علی صاحب سے دہلی میں مراسم بھی رہ چکے تھے۔ اس لئے جب ۱۸۸۰ء میں اُن سے ملاقات ہوئی۔ تو بعد میں ایسے مراسم بڑھے۔ کہ تا زندگی عزیزوں کا سا تعلق رہا۔ حتیٰ کہ ایک موقع پر جب سیّد ممتاز علی بہت بیمار ہوگئے۔ تو آزاد اُن کے گھر پر سوتے اور تیمار داری کرتے تھے +

مذہبی سرگرمیاں

ان دنوں لاہور میں عیسائیوں اور مسلمانوں میں مباحثے اور مناظرے کثرت سے ہوتے تھے۔ یہ مناظرے بازار چوک میں بھیر بھاڑ کے سامنے اور پورے جوش و خروش کے ساتھ ہوا کرتے تھے۔ عیسائی پادری اسلام پر نکتہ چینی کرتے اور مسلمان مولوی جواب دیتے۔ آپ ان مناظروں میں بے حد دلچسپی لینے لگے +

سید صاحب کو مناظرے سے اس قدر شغف ہوا۔ کہ تھوڑے سے عرصے میں اس فن کی سب کتابیں مثلاً تصانیف مولوی رحمت اللہ صاحب۔ ڈاکٹر وزیر خاں و مولوی حامد حسن کی کتابیں مطالعہ کر لیں۔ اور اس زمانے کے مشاہیر علما مثلاً حافظ ولی اللہ صاحب لاہوری۔ اور امام فن مناظرہ مولوی ابوالمنصور صاحب دہلوی کی کتابیں بھی پڑھیں +

سیّد صاحب کے مزاج میں تعصب کبھی نہیں ہوا۔ یہاں تک کہ اہلِ تشیع آپ کو شیعہ سمجھتے تھے۔ اور اہلِ تسنن سُنی جانتے تھے۔ آپ نے اسی بے تعصبی سے مناظرے کی کتابوں کو بھی دیکھا نتیجہ اس مطالعے و غور و خوض کا

یہ ہوا۔ کہ سید صاحب کی رائے میں عیسائیوں کے اعتراضوں کے مقابلے میں علمائے اسلام کے بعض جواب ناکافی معلوم ہوئے +

آپ نے علما سے بالمشافہ گفتگو کرکے ان اعتراضوں کا جواب حاصل کرنا چاہا۔ مگر جو جواب ان کو دئے گئے ان سے ان کا اطمینان نہ ہوا + اتفاق کی بات لاہور میں سیّد صاحب کا اختلاط عیسائیوں سے بہت رہا۔ یہاں تک کہ آپ کے والد ماجد نے انہیں اپنے ایک عیسائی دوست کی سپردگی میں رکھا۔ جن کی وجہ سے انہیں عیسائی مذہب کی کتابوں کے پڑھنے کا بہت اتّفاق ہوتا تھا۔ عیسائیوں سے زیادہ اختلاط کی وجہ سے انہیں مولویوں کے اسلام سے عیسائیوں کی مسیحیّت زیادہ اچھی معلوم ہونے لگی۔ اور آپ کے احباب کو یہہ خوف ہوا۔ کہ خدانخواستہ یہ عیسائی نہ ہوجائیں +

تعلیم کے سلسلے میں ۱۸۸۴ء میں آپ انگریزی ادب کی تعلیم ایک بنگالی ماسٹر سے حاصل کرتے تھے۔ جن کا نام بابو چندر ناتھ متر تھا۔ جو بعد میں پنجاب یونیورسٹی کے رجسٹرار بھی ہوئے۔ بابو صاحب موصوف کو اپنے شاگردوں سے مذہبی امور پر گفتگو کرنے کا بے حد شوق تھا۔ اور نہایت بے تعصب شخص تھے + کسی بحث کے اثنا میں بابو صاحب نے ایک روز مذہبِ اسلام کی بے حد تعریف و توصیف کی + اس سے سیّد صاحب کو بے حد تعجّب ہوا۔ چنانچہ جب جماعت کے سب طالب علم چلے گئے۔ تو سیّد صاحب نے ان سے پوچھا۔ کہ بابو صاحب آپ نے جو کچھ مذہبِ اسلام کی بابت فرمایا۔ کیا واقعی آپ کا ایمان یہی ہے۔ مجھے تو یہ مذہب باوجود اس کے کہ میں مسلمان ہوں اس قدر اچھا نہیں لگتا۔ مجھے تو عیسائی مذہب زیادہ معقول معلوم ہوتا ہے۔ اس پر بابو صاحب نے کہا۔ سنو ممتاز علی سچی بات یہ ہے۔ کہ جتنے بھی مذہب دُنیا میں ہیں۔ وہ سب آدمیوں کے بنائے ہوئے ہیں۔ اس واسطے ان میں غلطیاں بھی ہیں۔ اسلام کا بھی یہی حال ہے۔ لیکن چونکہ یہ مذہب ہندوؤں۔ یہودیوں اور عیسائیوں کے مذہب کے بہت بعد بنا ہے۔ اس لئے اس میں بہت کم غلطیاں ہیں۔ جتنے پُرانے مذاہب ہیں ان میں زیادہ غلطیاں ہیں۔ یہ تمہاری سخت غلطی ہے۔ کہ تم عیسائی مذہب کو اسلام سے بہتر سمجھتے ہو + خدا ایک ہے۔ اور تین بھی ہیں۔ اور خدا کا بیٹا بھی ہے۔ اور وہ بیٹا خود بھی خدا ہے۔ یہ سب باتیں ایسی ہیں۔ کہ کوئی شخص انہیں تسلیم نہیں کرسکتا +

پھر کہا۔ میں تمہیں چند کتابیں پڑھنے کے لئے دوں گا۔ ان سے تمہارے خیالات بہت درست ہوجائیں گے چنانچہ بابو صاحب نے سید صاحب کو کئی کتابیں اسلام کی تائید میں عیسائیوں کی لکھی ہوئی دیں۔ جن کے

پڑھنے سے آپ کو بہت فائدہ ہوا + اس کے بعد بابو صاحب موصوف نے سرسید کا ذکر کیا۔ اور پوچھا کہ تم نے کوئی ان کی کتاب بھی پڑھی ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ نہیں۔ تب بابو صاحب نے انہیں سرسیّد سے خط کتابت کرنے کا مشورہ دیا۔ چنانچہ انہوں نے سرسیّد کی خدمت میں ایک بہت لمبا خط لکھا۔ اور اپنے شکوک و شبہات تفصیل سے بیان کئے۔ سرسیّد اس زمانے میں لیجسلیٹو کونسل کے ممبر تھے۔ وہ خط پڑھ کر گھبرا گئے۔ شاید اس خط کا کچھ ایسا مضمون ہوگا۔ جس سے انہیں یہ خوف پیدا ہوا۔ کہ خدانخواستہ یہ شخص عیسائی نہ ہو جائے + وہ ان ایّام میں شملہ جانے والے تھے۔ انہوں نے سیّد ممتاز علی صاحب کو ایک تاکیدی خط لکھا۔ کہ تم ضرور مجھ سے آ کر انبالے ملو۔ میں تمہاری خاطر ایک روز وہاں ٹھہر جاؤں گا۔ چنانچہ تاریخ مقررہ پر سیّد صاحب انبالہ گئے۔ مگر کسی وجہ سے سرسیّد کا شملہ جانا ملتوی ہو گیا۔ اور وہ بجائے شملہ کے کلکتہ تشریف لے گئے۔ اور وہاں سے شملہ نہ آنے کی وجہ بیان کرنے کے بعد بہت تاکید سے یہ لکھا۔ کہ تم فوراً کلکتے چلے آؤ +

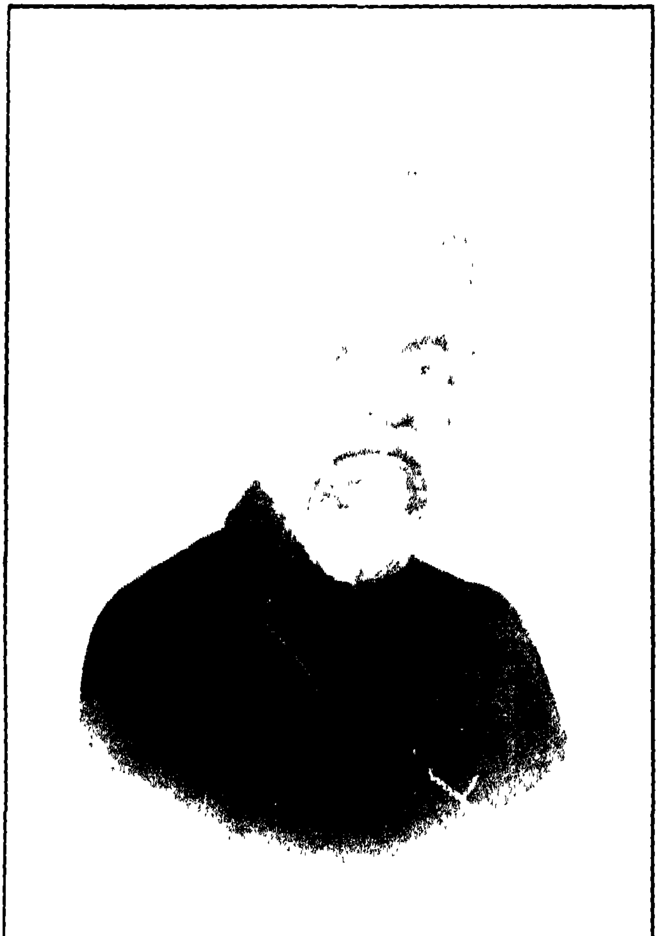
ایڈیٹر (باقی آئندہ)

آئینۂ حج

مولوی فیروز الدین اینڈ سنز بک ڈپو اکبری دروازہ لاہور نے یہ کتاب حج کے عین موقع پر شائع کر کے عازمین حجاز کے لئے بہت بڑی سہولت پیدا کر دی ہے۔ اس وقت کتاب پر وضاحت سے تبصرہ کرنے کی گنجائش نہیں۔ اس لئے صرف اتنا لکھ دینا کافی ہوگا۔ کہ یہ کتاب حجاز جانے والوں کے لئے ہر طرح ایک رہبر کا کام دے سکتی ہے +

فردوس۔ اس نام کا ایک رسالہ لاہور سے تازہ تازہ نکلا ہے۔ بدرالدین صاحب بدر اور شیخ غلام مصطفٰے صاحب حسرت اس کے اڈیٹر ہیں۔ قیمت صرف ۲/ نمونہ ۲/
دفتر فردوس رنگ محل لاہور سے منگوائیے +

ایڈیٹر



مولوی سید ممتاز علی مدظلہ العالی

اکبر

(از ڈوجیرک)

اکبر کے بزرگوں نے پٹھانوں کے خلاف، جو جنگ چھیڑ رکھی تھی۔ اکبر نے بھی تخت نشین ہونے کے بعد اُسے جاری رکھا۔ پٹھان اس وقت بنگالے پر قابض تھے۔ چنانچہ اکبر نے اس صوبے پر فوج کشی کر دی۔ اور چند جزیروں کے سوا باقی تمام مقامات سے ان کو نکال باہر کر دیا۔ اس کے بعد اس نے کھمبایت اور پھر ہندوستان کے کئی دوسرے صوبوں کو بھی تسخیر کر لیا۔ وہ جب تک زندہ رہا۔ اس نے اپنی فتوحات کا سلسلہ جاری رکھا چنانچہ اس کے زیر نگیں علاقہ نرسنگا کے راجاؤں کی مملکت کالی کٹ اور ساحلی علاقے بھی آ گئے بلکہ گوا کے جزیرے تک جا پہنچا۔ اور ان تمام سرزمینوں میں اس کے نام کی دہشت بیٹھ گئی۔ کئی بادشاہ اور راجہ اس کے دربار میں حاضر رہا کرتے تھے۔ ان میں سے بعض کو تو اس نے زور بازو سے مغلوب کر لیا تھا۔ اور بعض نے خود بخود اطاعت قبول کر لی تھی۔ کہ کہیں اپنے علاقوں سے محروم نہ کر دیئے جائیں۔ بعض اوقات بیس بیس بادشاہ اس کے دربار میں نظر آتے تھے۔ ہر ایک کو اپنا تاج پہننے کی اجازت ہوتی تھی۔ اور ان میں چھوٹے سے چھوٹا بادشاہ بھی قوت میں کالی کٹ کے راجہ سے کسی طرح کم نہ ہوتا تھا۔ ان کے علاوہ اور کئی مطیع راجہ بھی تھے۔ جو اپنی اپنی ریاستوں ہی میں رہتے تھے۔ اور اس خیال سے کہ خود ان کو خدمات سے معافی دے دی جائے۔ ان راجاؤں کی نسبت بہت زیادہ خراج دینا منظور کرتے تھے۔ جو دربار میں حاضر رہتے تھے۔ ان میں سے بعض حکمران ہندو تھے اور بعض مسلمان۔ لیکن اکبر گو بظاہر اپنے آپ کو مسلمان کہتا تھا۔ پر اسے مسلمانوں کی نسبت ہندوؤں پر بہت زیادہ اعتماد تھا۔

اس کی مملکت کے حدود کے متعلق صحیح طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ اپنی وفات تک جو ۱۷ اکتوبر ۱۶۰۵ء کو واقع ہوئی تھی۔ وہ برابر تازہ فتوحات حاصل کئے جا رہا تھا۔ ہمیں بتایا گیا ہے۔ کہ ۱۵۸۲ء میں اس کی مملکت مغرب میں سندھ تک اور شمال میں ایران کی حدود تک پھیلی ہوئی تھی۔ مشرقی حدود بنگالے کی حد تک تھی۔ جس کا وہ فرمان روا تھا۔ شمال میں تاتار تھا۔ اور جنوب میں وہ سمندر جو کھمبایت کے ساحل پر موجیں مارتا ہے۔

بنگالے کے سوا اور کسی حصّے میں اس کا مقبوضہ علاقہ سمندر تک نہ پہنچنے پایا تھا۔ کیونکہ مالابار کے راجا۔ پرتگیز۔ نرسنگا کا راجہ اور کئی دوسرے حکمراں اپنے دوسرے مقبوضات کے علاوہ تمام بندرگاہوں کے بھی مالک ہیں۔ باقی تمام حصّہ مغلِ اعظم کی ملکیت ہے۔ جس کی مملکت کے متعلّق کہا جاتا ہے۔ کہ ۱۵۸۲ء میں چھ سو فرسخ طویل اور پانسو فرسخ عریض تھی۔ لیکن اس کے بعد اس نے کشمیر اور کئی دوسرے علاقوں کو بھی تسخیر کرلیا +

ملک کا بیشتر حصّہ زرخیز ہے۔ اور ضروریاتِ زندگی کو بافراط پیدا کرتا ہے۔ گنگا اور سندھ دو مشہور دریاؤں نے جو اس کے بہت بڑے حصّے کی آبیاری کرتے ہیں۔ اسے گلستاں بنا رکھا ہے۔ نو اور دریا بھی ان دریاؤں میں شامل ہو جاتے ہیں۔ تاپتی[1]، نربدا، چمبل اور جمنا گنگا میں آگرتے ہیں۔ اور ستلج، بیاس۔ راوی، چناب اور جہلم سندھ میں شامل ہو جاتے ہیں + اس سے اس علاقے کی زرخیزی اور مغلِ اعظم کے تموّل کا کچھ اندازہ لگایا جا سکتا ہے + وہ جن مملکتوں اور صوبوں کو فتح کرتا ہے۔ ان پر قابض ہو جاتا ہے۔ اور پھر خود اپنے افسروں یا مفتوح حکمرانوں کو اپنے نائب کے طور پر وہاں کا فرماں روا مقرر کر دیتا ہے۔ ان سے وہ تمام محاصل کا ایک ثلث وصول کرلیتا ہے۔ اور باقی ان کی ذاتی ضروریات کے واسطے اور سپاہیوں گھوڑوں اور ہاتھیوں کی نگہداشت کے اخراجات کے لئے چھوڑ دیتا ہے جنہیں آڑے وقت کے لئے تیار رکھنا اُن کا فرض ہے + منشیات، مصالحوں، موتیوں اور دوسری بیش قیمت اشیا کی تجارت وسیع پیمانے پر ہونے سے ان صوبوں کے تموّل میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ ان کے علاوہ خوشبوؤں۔ سوتی کپڑوں۔ زرنگار کپڑوں۔ اُونی مال۔ قالینوں۔ مخملوں۔ ریشموں۔ اور ہر قسم کے معدنیات کی بھی تجارت ہوتی ہے۔ تاتار اور ایران سے گھوڑے بھی بڑی تعداد میں لائے جاتے ہیں +

اس کی فوجی طاقت اور بھی زیادہ مضبوط ہے + اس کی تمام سلطنت کے مختلف صوبوں میں اس کے تنخواہ دار صوبے دار ہیں۔ جن میں سے ہر ایک اپنے ہاں بارہ ہزار سوار سے پندرہ ہزار سوار رکھتا ہے۔ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ بادشاہ صوبجات کے جو محاصل انہیں دے ڈالتا ہے۔ ان میں سے انہیں ان افواج کے اخراجات برداشت کرنے ہوتے ہیں + ان کے علاوہ نسبتاً کم درجے کے افسر بھی ہیں۔ جنہیں سات سات آٹھ آٹھ ہزار سوار اور ایسے ہاتھی رکھنے ہوتے ہیں۔ جنہیں میدانِ جنگ میں کام کرنے کی تعلیم حاصل ہو۔ بادشاہ کے اصطبل میں ایسے پانچ ہزار ہاتھی ہیں۔ جو میدانِ جنگ میں جانے کے لئے صرف اس کے حکم کے منتظر رہتے ہیں۔ تمام سلطنت میں کتنے ہاتھی ہیں۔

[1] ڈو جیرک نے بعض تحریروں کے جو جغرافیہ کے متعلق ہیں غلط معنی سمجھے +

اس کے متعلق یہ اندازہ کیا گیا ہے۔ کہ وہ پچاس ہزار ہاتھی میدان جنگ میں لے جا سکتا ہے۔ جو تمام کے تمام نہایت خوبی سے مسلح ہوتے ہیں۔ جب اپنے بھائی شہزادہ کابل سے لڑائی چھڑی اور وہ اس کے خلاف بہت بڑی فوج لے کر بڑھا۔ تو اکبر ان گنت پیدلوں کے علاوہ پچاس ہزار سوار اور پانچ ہزار جنگی ہاتھی بھی لے کر نکلا۔ اس تعداد میں سے وہ پیدل اور سوار افواج چھوڑ دی گئی ہیں جنہیں مورچوں اور حفاظت کے قابل مقامات پر چھوڑ دیا گیا تھا۔ لڑائی کے زمانے میں وہ ہر طبقے کے لوگوں کو اپنی فوج میں بھرتی کرتا ہے۔ اور ان میں مغل، خراسانی، پٹھان۔ ترکمان بلوچ گجراتی۔ اور دوسرے ہندو اور مسلمان لوگ بھی ہوتے ہیں *

وہ توپ خانہ ساتھ لے کر میدان جنگ میں جاتا ہے۔ اور توپیں سب سے آگے صف آرا کر دی جاتی ہیں۔ ہاتھی پیچھے رہتے ہیں۔ اور انہیں اس طریق سے مسلح کیا جاتا ہے۔ کہ سر کو وار سے بچانے کے لئے لوہے یا سخت چمڑے سے ڈھانپ دیا جاتا ہے ایک تلوار سونڈ سے باندھی جاتی ہے۔ اور دونوں دانت جو منہ سے باہر نکلے رہتے ہیں۔ ان کے ساتھ خنجر باندھ دیئے جاتے ہیں۔ ہر جانور کی پیٹھ پر لکڑی کی چار چھوٹی چھوٹی بُرجیاں رکھی جاتی ہیں۔ جن پر چار چار سپاہی سوار ہو کر تیر۔ برچھے اور گولیاں برساتے ہیں۔ فیلبان اپنے جسم کی حفاظت کے لئے زرہ بکتر پہنے رکھتے ہیں۔ جو ہاتھی اس سازو سامان سے آراستہ ہوتے ہیں۔ انہیں اگلی صفوں میں اس خیال سے نہیں رکھا جاتا۔ کہ ان کی اوٹ میں دُشمن سپاہیوں کی نظر سے اوجھل ہو جائیں گے۔ اور زخمی ہو کر جب پیچھے لوٹیں گے۔ تو تمام پچھلی صفوں کو منتشر کر ڈالیں گے۔ اس لئے انہیں پیچھے رکھا جاتا ہے اور جب دُشمن بڑھتا بڑھتا قلب لشکر تک آن پہنچتا ہے۔ تو اس کی مزید ترقی روکنے کے لئے یہ مضبوط فوج نکالی جاتی ہے۔ یہ حیوان جب مسلح نہیں ہوتے۔ تب بھی بہت نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ ان کے راستے میں جو کوئی آتا ہے۔ اُسے اپنی سونڈ میں پکڑ لیتے ہیں۔ اور جتنا اونچا اُٹھا سکتے ہیں اُٹھا کر زمین سے دے مارتے ہیں۔ اور اپنے پیروں میں روند ڈالتے ہیں۔ بعض موقعوں پر وہ اپنے لوہے سے منڈھے ہوئے سر کی امداد سے مینڈھوں کی طرح ٹکریں بھی مارتے ہیں *

پہلے مغل بادشاہوں کی طرح اکبر نے شہر دہلی میں اقامت اختیار نہیں کی۔ پہلے تو آگرہ میں رہنا شروع کیا۔ لیکن وہاں اس کے دو بچے وفات پا گئے۔ تو اس نے ایک اور حسین شہر تعمیر کر لیا۔ جس کا نام فتح پور رکھا۔ لیکن لاہور کی مملکت کی تسخیر کے بعد اس نے لاہور ہی کو اپنا دارالخلافہ بنا کر وہاں مستقل سکونت اختیار کر لی *

۱۵۸۲ء[1] میں ہینی کے پادری پہلے پہل اس کے دربار میں گئے۔ اس وقت اس کی عمر چالیس کے قریب تھی۔ قد میانہ اور بدن خوب گٹھا ہوا۔ سر پر پگڑی پہن رکھی تھی۔ اور اس کے ملبوس کا کپڑا سونے کے تاروں کی ملاوٹ سے بنا تھا۔ اس کا اوپر کا لباس گھٹنے تک اور پاجامہ ایڑیوں تک پہنچا تھا۔ موزے ہم ہی لوگوں جیسے تھے۔ لیکن جوتے ایک خاص وضع کے تھے۔ جس کو اس نے خود ایجاد کیا تھا۔ پگڑی پر سے موتیوں یا شاید دوسرے قیمتی پتھروں کی لڑیاں ماتھے پر لٹک رہی تھیں۔ اسے یورپین لباس پہننے کا بہت شوق تھا۔ اور بعض اوقات بڑے چاؤ سے ایک سیاہ مخمل کا لباس بھی پہنتا تھا۔ جو پرتگیزی طرز پر بنوایا گیا تھا۔ لیکن یہ لباس مجمع عام میں نہیں۔ بلکہ خاص مجلسوں میں پہنا جاتا تھا۔ پہلو میں ہر وقت شمشیر آبدار رہتی تھی۔ اور اگر پہلو میں نہ ہوتی۔ تو اس قدر قریب ضرور ہوتی تھی۔ کہ پل بھر میں ہاتھ اس تک پہنچ سکے۔ جو لوگ اس کی حفاظت پر متعین تھے۔ وہ اس کے دوسرے افسروں اور خادموں کی طرح ہر روز بدلے جاتے تھے۔ لیکن اس طرح کہ آٹھویں روز ہر سپاہی کی باری دوبارہ آتی تھی۔

اکبر نہایت ستعد اور معاملہ فہم شخص تھا۔ ہر معاملے پر نہایت معقول رائے رکھتا تھا۔ سوچ سمجھ کر ہر کسی کام میں ہاتھ ڈالتا۔ اور سب سے بڑی بات یہ تھی۔ کہ فیاض اور خوش اخلاق تھا۔ ان اوصاف کے ساتھ اس میں ان لوگوں کی جرأت اور دلیری بھی شامل تھی۔ جو بڑے بڑے کاموں کے بیڑے اٹھاتے اور بڑی بڑی مہمیں سرانجام دیتے ہیں۔ وہ شاہی رعب و داب زائل کئے بغیر لوگوں سے دوستانہ اور مسرت بخش انداز میں ملاقات کر سکتا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ نیکی کی قدر کر سکتا ہے۔ اور یورپیوں کے متعلق عموماً اور عیسائیوں کے متعلق خصوصاً جن میں سے بعض کو وہ ہمیشہ اپنے ساتھ بھی رکھتا۔ نہایت اچھی رائے رکھتا ہے۔ اسے اکثر باتوں کے متعلق معلومات حاصل کرنے کا شوق تھا۔ اور ان میں بڑی دلچسپی لیتا تھا۔ اور نہ صرف فوجی اور سیاسی امور ہی کا بڑا ماہر تھا۔ بلکہ کئی کاریگری کے فنون میں بھی بڑا ملکہ رکھتا تھا۔ توپیں ڈھالنے کے کام کو بڑی دلچسپی سے دیکھا کرتا۔ اپنے محل میں بھی کئی کاریگروں کو رکھتا۔ جو مختلف توپیں اور دوسرے اسلحہ بنانے میں ہر وقت مصروف رہتے تھے۔ مختصر یہ کہ بہت سی چیزوں کے متعلق اس کی معلومات بہت وسیع تھیں۔ کئی فرقوں کے عقائد کے متعلق خوب بحث کر سکتا تھا۔ اور یہ ایسا موضوع تھا۔ جس کا اس نے خصوصیت سے مطالعہ کر رکھا تھا۔ اگرچہ وہ نہ پڑھنا جانتا تھا نہ لکھنا۔ لیکن پڑھے لکھے لوگوں کی صحبت کر کے بہت خوش ہوتا تھا۔ اس کے دربار میں دس بارہ حکما ہر وقت موجود رہتے۔

---

[1] یہ تاریخ غلط ہے۔ پہلی جیزوٹ مشن فروری ۱۵۸۰ء میں لاہور پہنچی تھی۔

اور اس کے سامنے کئی سوالات کو بڑی خوبی سے سلجھا کر دکھاتے تھے۔ مختلف موضوع پر وہ جو بحث کرتے اور جو نقلیں سُناتے اُنہیں وہ بڑی توجہ سے سُنتا تھا۔ اور سمجھتا تھا۔ کہ اس طرح وہ اپنی جہالت کی کوتاہیوں کو پورا کرے گا +

فطرتاً مراقی تھا۔ اور اسے صرع[1] کے دورے پڑا کرتے تھے۔ چنانچہ خیال دوسری جانب منعطف کرنے کی غرض سے وہ مختلف قسم کی تفریحوں میں دلچسپی لیتا۔ مثلاً ہاتھیوں، اونٹوں اور بھینسوں کی جنگ۔ یا مینڈھوں کی لڑائی کرواتا جو اپنے سینگوں سے ٹکریں مارتے۔ اور انہیں ایک دوسرے کے جسم میں بھونک دیتے ہیں۔ کبھی کبھی مرغوں کی لڑائی بھی دیکھا کرتا تھا۔ اسے شمشیر آزمائی کا کمال دیکھنے کا بھی شوق تھا۔ اور بعض اوقات قدیم رومنوں کی طرح اپنے سامنے گلیڈئیٹرز کی جنگ بھی کرواتا۔ یا شمشیر آزماؤں کو لڑواتا۔ یہاں تک کہ ان میں سے ایک دوسرے کو مار ڈالتا + بعض اوقات وہ ان ہاتھیوں اور اونٹوں کے تماشے سے دل بہلاتا جنہیں بعض خاص سازوں کی لے پر ناچنا اور بعض دوسرے کرتب کرنا سکھایا جاتا تھا + لیکن بڑی قابل قدر بات یہ ہے۔ کہ ان تمام تفریحوں کے ساتھ وہ سلطنت کے کاموں اور اہم امور پر برابر توجہ کرتا تھا +

اکثر اوقات وہ ان وحشی جانوروں کا شکار بھی کرتا۔ جو ان ممالک میں بڑی کثرت سے موجود ہیں۔ اس مقصد کے لئے اس نے شکاری کتوں کی بجائے چیتے رکھے ہوئے تھے۔ جس طرح ہم کتوں کو شکار کے لئے تیار کرتے ہیں۔ یہاں چیتے شکار کا تعاقب کرنے کے لئے سدھائے جاتے ہیں + اگرچہ اس کے پاس نہایت اچھے سدھے ہوئے باز اور دوسرے شکاری پرند تھے۔ اور نہایت ماہر شاہین باز بھی اس کے ملازموں میں تھے۔ لیکن اسے شکاری پرندوں سے شکار کرنے کا زیادہ شوق نہ تھا۔ اس کے بعض شاہین باز ایسے باکمال تھے۔ کہ بغیر پر کے تیر سے اُڑتی چڑیا کا شکار کرتے تھے۔ اور ان کا نشانہ بہت کم خطا کرتا تھا +

جنگلی ہرن پکڑنے کے لئے وہ دوسرے ہرنوں سے کام لیتا تھا۔ جو اس خاص مقصد کے لئے سدھائے جاتے تھے۔ ان کے سینگوں پر جال لگا کر انہیں چھوڑ دیا جاتا تھا۔ جب جنگلی ہرن ان پر حملہ کرنے کے لئے آتے تو خود جال میں پھنس جاتے تھے۔ اور پھر وہ شکاری جو قریب ہی چھپے بیٹھے رہتے تھے۔ انہیں پکڑ لیتے تھے۔ وہ جب کہیں فوج کشی کرتا۔ تو اس طریق سے شکار کھیلا کرتا تھا۔ کہ چار یا پانچ ہزار آدمی ایک دوسرے کے

---

[1] اس کی شہادت اور کہیں سے نہیں ملتی + جس طرح بعض دوسرے بڑے آدمی اس کے مریض بتائے جاتے ہیں اسی طرح بعض جینیر وئٹ پادریوں نے اسے بھی سمجھ لیا۔ اور ڈوجیرک کو معلومات بہم پہنچائیں +

ہانکا کر جنگل کے کسی قطعے کے گرد گھیرا ڈال لیتے تھے۔ پھر دوسرے لوگ جنگل کے اندر بھیجے جاتے۔ کہ جانور کو ہانکا کر اس گھیرے کے قریب لے آئیں۔ گھیرے کے قریب آتے ہی باہر کے لوگ جانور کو پکڑ لیتے + جو شخص جانور کو گھیرے میں سے نکل کر بھاگ جانے کا موقع دیتا تھا۔ اس پر جرمانہ کیا جاتا تھا +

یہ تو بادشاہ کی تفریحوں کا حال تھا۔ اب ہم زیادہ اہم امور کی طرف توجہ کرتے ہیں + اکبر دن میں دو مرتبہ اس غرض سے دربارِ عام میں آ کر ہر درجے اور طبقے کے لوگوں سے ملتا تھا۔ کہ اپنے اہم امور کے متعلق جو شخص چاہے اس سے گفتگو کر سکے۔ اس مقصد کے لئے اس نے اپنے قصر کے دو بڑے ایوان مخصوص کر رکھے تھے۔ اور دونوں میں اونچی تخت گاہ پر نہایت قیمتی اور شاندار تخت رکھے تھے۔ ان میں سے پہلے ایوان میں تمام رعایا کو آنے جانے کی اجازت تھی اور یہاں وہ ان سب لوگوں سے ملاقات کرتا تھا۔ جو اس سے گفتگو کرنے کے متمنی ہوتے تھے + لیکن دوسرے ایوان میں صرف اس کے سرداروں اور سلطنت کے بڑے اُمرا اور اُن سفیروں کو داخل ہونے کی اجازت ملتی تھی۔ جو دوسرے ممالک کے بادشاہوں کے درباروں سے اہم امورِ سلطنت پر گفتگو کرنے آتے تھے + آٹھ آزمودہ کار افسر جن کی اصابت رائے پر اس کو اعتماد تھا۔ ہر وقت اس کی خدمت میں موجود رہتے تھے۔ ان کے لئے ہفتہ کے مختلف دن مقرر تھے۔ ہر ایک کو اجازت تھی۔ کہ ہفتے کا جو دن جس کے حصے میں ہو۔ اس روز وہ ان لوگوں کو لا کر متعارف کرائے جو حاضری کے خواہش مند ہوں + ان ہی کا فرض تھا۔ کہ جو لوگ ملاقات کے خواہاں ہوں ان کی سندوں کو دیکھیں اور ملاقات کے متعلق تمام ضروری امور کا اہتمام کریں۔ انہیں ضروری آداب سے واقف کریں۔ اور اگر وہ پردیسی ہوں۔ تو انہیں بتائیں۔ کہ بادشاہ کی تعظیم کس طرح بجا لائی جاتی ہے۔ اور اس کے حضور میں کس طرح گفتگو کی جاتی ہے۔ اس کا باعث یہ ہے۔ کہ ایسے موقعوں پر بہت تکلف برتا جاتا ہے۔ اور دوسری باتوں کے علاوہ یہ دستور بھی ہے۔ کہ آداب بجا لانے کے بعد بادشاہ کی قدمبوسی کی جاتی ہے +

ملاقات کے دوران میں بادشاہ کے منشی بھی حاضر رہتے ہیں۔ جن کا یہ فرض ہے۔ کہ بادشاہ کی زبان سے جو لفظ نکلے اُسے لکھ لیا کریں + یہ دستور ایران کے بادشاہوں اور دوسرے مشرقی ممالک میں بہت عام ہے +

انصاف کرنے کے لئے ایسے منصف بھی ہیں۔ جن کا حکم قطعی ہوتا ہے۔ اور ایسے بھی ہیں جن کے حکم کے بعد اپیل کی جا سکتی ہے + ہر صورت میں مقدمہ زبانی طے کیا جاتا ہے۔ اور اس کے متعلق کوئی اہ

تحریر میں نہیں لایا جاتا ؛

جس بادشاہ کا ہم ذکر کر رہے ہیں۔ اس کی خاص تاکید تھی۔ کہ ہر معاملے میں نہایت سختی سے انصاف سے کام لیا جائے۔ تاہم وہ سزا دینے میں اور خصوصیت سے موت کی سزا دینے میں بہت محتاط تھا۔ جس شہر میں وہ اقامت گزیں ہوتا۔ وہاں کوئی شخص اُس وقت تک موت کی سزا نہ پا سکتا تھا۔ جب تک فرمان موت اُس کے حضور میں پیش نہ کیا جاتا تھا ؛ بعض لوگ کہتے ہیں۔ کہ فرمان موت تین دفعہ بادشاہ کے سامنے پیش ہونا ضروری تھا عام طور پر اس کی دی ہوئی سزائیں ظالمانہ نہ ہوتی تھیں۔ لیکن اس میں بھی شبہ نہیں۔ کہ اس نے بعض ایسے لوگوں کو جنھوں نے اس کی جان لینے کی سازشیں کی تھیں ہاتھیوں سے مروایا۔ اور بعض اوقات مجرموں کو ترکی کے دستور کے مطابق سولی پر بھی لٹکوایا تھا۔ ایسے قزاق یا سمندری ڈاکو کو جس نے کسی کی جان نہ لی ہو۔ یہ سزا دی جاتی تھی۔ کہ اس کا ہاتھ کاٹ دیا جاتا تھا۔ لیکن خونیوں۔ ڈاکوؤں اور زانیوں کو ان کے جرم کا لحاظ کر کے یا پھانسی دی جاتی تھی۔ یا دار پر لٹکایا جاتا تھا۔ یا ان کا سر کاٹ ڈالا جاتا تھا ؛ ان سے کم درجے کے مجرموں کو کوڑے لگا کر چھوڑ دیا جاتا تھا۔ مختصر یہ کہ بادشاہ ان لوگوں سے بھی جو اس کی ذات کو نقصان پہنچانے کے مجرم ہوتے تھے۔ رحم اور نرمی کا سلوک کرتا تھا ؛ اس نے دو مرتبہ اپنے ایک بلند مرتبہ افسر کو جو سازش اور بغاوت کا ملزم تھا۔ مرحمت خسروانہ سے کام لے کر معاف کیا۔ اور اس کی طرف سے دل صاف کر کے پھر اس کے پہلے مرتبے پر فائض کر دیا ؛ لیکن جب اس افسر نے اتنی خود فراموشی سے کام لیا۔ کہ تیسری مرتبہ پھر اسی جرم کا ارتکاب کیا۔ تو بادشاہ نے اسے سُولی پر لٹکا کر مار ڈالنے کی سزا دی[1] ؛

اکبر بہت کم برافروختہ ہوتا تھا۔ جب ہوتا تھا۔ تو بے حد غضب ناک ہو جاتا تھا۔ لیکن اس کا غصہ جلد فرو ہو جاتا تھا۔ کسی اہم کام کو شروع کرنے سے پہلے وہ اپنی کونسل کے ارکین سے مشورہ کرتا۔ لیکن قطعی فیصلہ خود کرتا۔ اور پھر کام کرنے کا جو طریقہ اسے مناسب معلوم ہوتا اس پر عمل شروع کر دیتا ؛ بعض اوقات وہ اپنے مشیروں کی رائے معلوم کرنے کو اپنی تجاویز انہیں بھی بتا دیتا تھا۔ اگر وہ متفق الرّائے ہوتے۔ تو یہ الفاظ کہتے۔ "کہ جہاں پناہ سلامت رہیں۔ اگر کوئی مختلف الرائے ہوتا۔ تو اکبر نہایت صبر سے اس کے خیالات سُنتا۔ اس کے اعتراضات کے جواب دیتا۔ اور اپنے فیصلے کے وجوہات بیان کرتا ؛ بعض اوقات اعتراضات کی معقولیت کا قائل ہو کر وہ اپنے منصوبے تبدیل بھی کر دیتا تھا۔ اس کے دربار میں عام طور پر فارسی بولی جاتی ہے۔ لیکن علما اور مولوی

---

[1] خواجہ شاہ منصور جو مرزا محمد حکیم والیِ کابل کی سازش میں شریک تھا ؛

عربی بولتے ہیں +

یہ باتیں ہیں جو ہم مغلِ اعظم اور اس کی سلطنت کے متعلق معلوم کر سکے ہیں +

سید امتیاز علی تاج

مناجات ترکی

[illegible]

طبعی حالات کا اثر

تاریخ و تمدنِ انسانی پر

یہ مضمون جس اسلوب سے لکھا گیا ہے۔ بہت خوب ہے۔ صاحبِ مضمون نے اپنا پورا پتہ نہیں لکھا۔ ورنہ ہم اُن سے درخواست کرتے۔ کہ اسے اَور زیادہ وضاحت سے بیان فرمائیں کیونکہ اس موضوع پر ابھی اَور بہت سی قابلِ قدر باتیں لکھی جاسکتی ہیں + اڈیٹر

انسان کی تاریخ کے اہم ترین واقعات بستیوں کی تعمیر و تخریب۔ جماعتوں کی نقل و حرکت سلطنتوں کا عروج و زوال۔ علوم و فنون کی ترقی و اشاعت یہ سب چیزیں بہت بڑی حد تک کرۂ ارضی کے طبعی حالات کی پیدا کی ہوئی ہیں۔ انسان کی زندگی کا کوئی شعبہ ان کے اثرات سے بچا نہیں رہا۔ یہاں تک کہ سیاسیات۔ اقتصادیات اور عمرانیات کے علاوہ انسان کے مذہب اور اخلاق میں بھی طبعی حالات کو بہت بڑا دخل رہا ہے + لیکن یہ یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ طبعی حالات کا اثر ہمیشہ یکساں نہیں ہوا کرتا۔ اس کی دو وجوہ ہیں۔ ایک تو یہ۔ کہ ان حالات میں خود تغیر و تبدل کا امکان ہے۔ دوسرے انسان اپنی ذہنیت کی ترقی کے باعث نہ صرف بعض اوقات طبعی حالات پر قابو پالیتا ہے۔ بلکہ ان میں اپنی حسبِ منشا تغیرات بھی پیدا کر دیتا ہے +

انسان جو اشرف المخلوقات تھا۔ صفحۂ ہستی پر جلوہ گر ہونے کے بعد ایک مدت تک بدویانہ زندگی بسر کرتا رہا۔ سامانِ خورونوش کی تلاش میں اِدھر اُدھر مارا مارا پھرتا۔ لیکن یہ نقل و حرکت اردگرد کے علاقوں تک محدود ہوا کرتی تھی۔ رفتہ رفتہ جب انسان کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا اور اس کے مقابلے میں ضروریاتِ زندگی نے کفایت نہ کی۔ تو سامانِ خورونوش کی قلت ناقابلِ برداشت ہونے لگی۔ یہاں تک۔ کہ بڑی بڑی انسانی جماعتوں نے اپنے آبائی ممالک چھوڑ کر ایسے ممالک کی تلاش شروع کی جہاں پیداوار کی کثرت تھی + طبعی حالات کا یہ پہلا اثر تھا جو انسانی جماعتوں کی نقل و حرکت کی صورت میں ظاہر ہؤا۔ آریاؤں کا وسط ایشیا سے نکل کر ہندوستان و ایران کی طرف خروج کرنا اسی تلاشِ خورونوش کا نتیجہ تھا +

انسانی جماعتوں میں نقل و حرکت کرنے والے طبعی حالات میں پیداوار کے علاوہ آب و ہوا بھی شامل ہے۔ جن ممالک میں سردی یا گرمی کی شدّت تھی وہاں سے انسانی جماعتوں نے ہمیشہ ایسے خطّوں کی طرف نقل مکانی کی ہے جہاں موسم قابلِ برداشت ہوتا ہے +

آب و ہوا انسانی جماعتوں میں نقل و حرکت پیدا کرنے کے علاوہ انسان کے جسم۔ اخلاق اور طرزِ معاشرت پر بھی اثر رکھتی ہے۔ جن ممالک میں بڑے زور کی آندھیاں آناً فاناً انسانی بستیوں کو تباہ کر جاتی ہیں وہاں کے باشندے اکثر چُست و چالاک، دُور اندیش، مصائب کو ہمت سے برداشت کرنے کے عادی اور تکالیف کا جُرأت سے سامنا کرنے کے قابل ہوتے ہیں۔ ان لوگوں میں عزم راسخ، استقلال و استقامت اور قوّتِ عمل کے جوہر کُوٹ کُوٹ کر بھرے جاتے ہیں۔ عرب کے لوگ شجاع ایسے تھے۔ کہ ایران و روم و مصر ایسی عظیم الشّان سلطنتیں آنِ واحد میں اُن کے زیرِ نگیں آ گئیں۔ اُن کے عزم و استقلال کی یہ حالت تھی۔ کہ ایک داعیٔ حق نے جب اُن کو دعوت دی۔ تو صدیوں کی بُت پرستی، زناکاری اور شراب نوشی چھوڑ چھاڑ کر وہ لوگ پکّے موحّد اور با اخلاق بن گئے۔ قوّتِ عمل ان میں اتنی تھی۔ کہ میدانِ جنگ میں ایسی حالت میں۔ کہ ان کے پیٹ پر مارے بھُوک کے پتھر بندھے ہوتے وہ غنیم سے بچاؤ کے لئے خندقیں کھودتے نظر آتے +

یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے۔ کہ جماعتہائے انسانی کی نقل و حرکت محض طبعی حالات کا نتیجہ نہیں ہوا کرتی۔ ان کے علاوہ اس کے اور اسباب بھی ہوتے ہیں۔ چنانچہ دُنیا کی تاریخ بتاتی ہے۔ کہ ہوسِ کشورکشائی و جہانبانی نے بھی بڑی بڑی جماعتوں کو دُنیا کے ایک حصّے سے ہٹا کر دوسرے دُور و دراز حصّوں میں آباد کر دیا ہے۔ جیسا کہ نپولین اور سکندر کے حالات سے ثابت ہے۔ ان دونوں کی جاہ پرستی نے ایک طرف لاکھوں بندگانِ خدا کو فرانس سے روس اور مصر تک پہنچا دیا اور دوسری طرف ہزارہا لوگوں کو یورپ سے نکال کر ایشیا کے ممالک میں مستقل اقامت اختیار کرنے پر مجبور کر دیا +

اسی طرح پچھلی چند صدیوں میں یُورپ کی سلطنتوں نے افریقہ و امریکہ کے معدنی اور زراعتی ذخائر سے متمتع ہونے کی تمنّا میں کروڑوں افراد کو اُن برّاعظموں میں جا آباد کیا +

یہی حال مذہب کا ہے۔ اس قوّت نے بھی بڑی بڑی جماعتوں کو ہزاروں میل کی مسافت طے کر کے دُور و دراز ممالک میں آباد ہونے کی ترغیب دی ہے۔ مسلمانوں کا عرب سے نکل کر افریقہ کے تمام شمالی حصّے اور ہسپانیہ تک پھیل جانے کا سبب اشاعتِ مذہب تھی +

پہلے طبعی حالات نے انسانی جماعتوں کو نقل و حرکت پر مجبور کیا۔ اور پھر خود اس نقل و حرکت پر اثر پیدا کیا۔ انسانی جماعتیں جب اپنے آبائی ممالک سے ہجرت کر کے تلاشِ خورونوش میں نکلیں۔ تو وہ اُنہیں راستوں پر چلیں جن پر اُن کے طبعی حالات چلاتے گئے۔ اگر سامنے پہاڑ آ گئے۔ تو وہ اُن کے دامنوں میں چلتی رہیں۔ یہاں تک کہ کہیں کوئی درۂ کوہ نظر پڑا۔ تو اُن میں سے کچھ اُدھر سے دوسری راہ پر لگ گئیں۔ کہیں ان جماعتوں کو دریا کے کنارے کنارے سیکڑوں میل کا سفر کرنا پڑا۔ تا آنکہ موافق حالات نے اُن کو رُخ بدلنے یا کسی زرخیز علاقے میں اقامت اختیار کرنے پر آمادہ کر دیا۔ آریاؤں نے جب وسطِ ایشیا سے قدم باہر نکالے۔ تو وہ سلسلہ ہائے کوہ کے ساتھ ساتھ چلتے گئے۔ یہاں تک۔ کہ ان میں سے کچھ جماعتیں راستہ پا کر ایران پر چھا گئیں اور کچھ درہ خیبر کے رستے سے ہندوستان کے سرسبز و شاداب خطے کی طرف آنکلیں۔ اگر درۂ خیبر کھلا نہ ہوتا۔ تو ہندوستان کی تاریخ گزشتہ پانچ ہزار سال کی تاریخ سے بالکل مختلف ہوتی +

طبعی حالات کا تیسرا اثر دُنیا میں بڑی بڑی انسانی آبادیوں کا مستقل قیام تھا۔ وہ جماعتیں جو سامانِ خورونوش کی تلاش میں حیران و سرگرداں پھر رہی تھیں۔ جب اُن سرسبز و زرخیز علاقوں میں پہنچیں۔ جن کو نیل۔ دجلہ۔ فرات۔ سندھ اور گنگا ایسے بڑے بڑے دریا سیراب کرتے ہیں۔ تو انہوں نے اُن میں سکونت اختیار کر لی +

سطحِ ارضی کے سرسبز و شاداب علاقوں میں بڑی بڑی جماعتوں کے اقامت گزیں ہونے میں نہ صرف سامانِ خورونوش بلکہ بیرونی دُشمنوں کی دستبرد سے حفاظت کو بھی بڑا دخل تھا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں۔ کہ سب کی سب پُرانی سلطنتیں ایسے ممالک میں قائم ہوئیں جن کے گرد طبعی حالات نے حفاظت کا پورا سامان کر رکھا تھا۔ ہندوستان کی تہذیب۔ جو دُنیا کی اولیں تہذیبوں میں سے ہے۔ ایک ایسے مُلک میں پیدا ہوئی جس کے گرد بحرِ ہند ایسے وسیع سمندر اور ہمالیہ ایسے سربفلک پہاڑوں کا سلسلہ موجود تھا۔ اس طرح عراقِ عرب میں بابل کی تہذیب دجلہ و فرات کے درمیانی علاقے میں ترقی پا رہی۔ یونانیوں کو تین طرف سمندر اور ایک طرف پہاڑوں نے بیرونی حملوں سے محفوظ کر رکھا تھا۔ اسی طرح اٹلی کے تین طرف سمندر اور ایک طرف کوہ الپس نے رومن قوم کو حیرت انگیز ترقی کا موقع دے دیا تھا۔ یہی حال مصر کا تھا۔ اس کے دو طرف سمندر اور ایک طرف صحرائے اعظم نے ہزاروں سال تک کسی بیرونی دُشمن کو فراعنہ کی عظیم الشان سلطنت کا رُخ نہ کرنے دیا +

ان علاقوں میں ایک تو خورونوش کی طرف سے بے فکری تھی۔ دوسرے باہر کے دُشمنوں کے

حملوں سے بھی بے خوفی تھی۔ اس لئے وہاں کے لوگ اطمینان سے علوم وفنون کی طرف متوجہ ہو سکتے تھے یہی وجہ تھی۔ کہ ہند، مصر، یونان۔ بابل اور روما کی قوموں نے تہذیب و تمدن میں وہ حیرت انگیز ترقی کی۔ کہ آج تک اقوام ان کی خوشہ چینی کر رہی ہیں۔ ہندوں کا علم ہندسہ۔ مصر کا فن تعمیر۔ یونان کا فلسفہ۔ بابل کی ہیئت اور رُوما کا قانون آج بھی ماہرین علوم سے خراج تحسین وصول کر رہا ہے +

لیکن جہاں سامان خورونوش اور طبعی اسباب حفاظت نے بڑی بڑی جماعتوں کو مہذب و متمدن بنادیا وہاں یہی چیزیں ان کی تباہی کا باعث بھی بنیں۔ یہ طبعی حالات کا چوتھا اہم اثر تھا +

سامانِ خورونوش کی کثرت انسان کو تن آسانی سکھلاتی ہے۔ اور وہ محنت و مشقت کی عادت بھول جاتا ہے۔ صحراؤں کے رہنے والے جن کو دو گھونٹ پانی کے لئے بیسوں میل کی مسافت طے کرنی پڑتی ہے ہمیشہ چُست و چالاک۔ چلنے پھرنے کے عادی اور محنت و مشقت برداشت کرنے کے قابل ہوتے ہیں۔ لیکن یہی لوگ جب سرسبز و شاداب علاقوں میں سکونت پذیر ہوتے ہیں ان کی چُستی کالعدم ہو جاتی ہے۔ جس طرح بیرونی حملوں سے بے خوفی انسان کو اپنی حفاظت سے غافل بنا دیتی ہے۔ یہی وجہ تھی۔ کہ عرب کے خانہ بدوش جب ایران و روما ایسی متمدن اور خوش حال حکومتوں پر غالب آکر اُن کے سامانِ تعیش سے مستفید ہوئے تو اُن میں وہ اسلاف کا قلب و جگر نہ رہا۔ اس طرح جب ان عظیم الشان سلطنتوں پر جو بیرونی حملوں سے محفوظ رہ کر تہذیب و تمدن کے انتہائی مدارج طے کر چکی تھیں باہر سے حملے ہوئے تو وہ اپنے آپ کو نہ بچا سکیں چنانچہ ہندوستان پر جب بیرونی اقوام نے حملے کئے تو یہاں کی اقوام ان کا مقابلہ نہ کر سکیں۔ مصر پر جب باہر سے حملہ ہوا فراعنہ کی حکومت خاک میں مل گئی۔ بابل نینوا کی حکومتیں ایرانیوں کے فتوحات کے سیلاب میں بہ گئیں۔ رومن قوم مُدت ہائے دراز کے عیش و آرام کی وجہ سے خانہ بدوشوں کے مقابلے کی تاب نہ لا سکی اور بغداد کی شاندار حکومت تاتاریوں کے مقابل آکر ملیامیٹ ہو گئی +

جیسا کہ پہلے کہا گیا تھا۔ طبعی حالات انسان کی ذہنیت، عادات، معاشرت اور مذہب پر بھی اثر پیدا کرتے ہیں۔ اِن میں سے ہم مذہب کو لیتے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں۔ کہ دُنیا کے مختلف مذاہب نے جنت کا جو تخیل دُنیا کے سامنے پیش کیا ہے وہ بہت بڑی حد تک طبعی حالات کا پیدا کیا ہوا ہے۔ غور کیجئے اسلام میں جنت کا استعارہ یہ ہے۔ کہ وہ ایک باغ ہے جس کے اندر جابجا نہریں چلتی ہیں ٹھنڈا پانی پینے کو بافراط میسر ہے۔ کھانے کو اچھے سے اچھے پھل موجود ہیں۔ ہر طرف سرسبزی و شادابی ہے۔ یہ تخیل

کیوں پیش کیا گیا ہے۔ اس لئے۔ کہ عرب ایسے گرم و خشک ملک کے رہنے والوں کے لئے یہی سب سے اچھی نعمتیں ہیں۔ اور چونکہ اسلام کا خطاب پہلے پہل عربوں ہی کی قوم سے تھا۔ اس لئے انہیں کے خیالات کے مطابق جنّت کی نعمتوں کا ذکر ہوا۔ ٹھنڈا پانی ایک عرب کے لئے نعمتِ غیر مترقبہ ضرور ہے لیکن کشمیر یا افغانستان کے رہنے والوں کے لئے یہ نعمت نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح عرب کے رہنے والوں کے لئے پھلوں میں سے کھجور اور انگور ایسے مرغوب ہیں۔ کہ جنّت میں اُن کی خوش خبری دی گئی ہے۔ لیکن ایک ہندوستانی کے لئے آم ان دونوں چیزوں سے زیادہ پسندیدہ ہے۔ اسی طرح پانی کی افراط صحرا کے خانہ بدوشوں کے لئے ایک حقیقی نعمت ہے۔ لیکن دریائے سندھ کے رہنے والوں کے لئے یہ کوئی قابل قدر شے نہیں +

اسی طرح بعض سرد ممالک کے باشندوں کا عقیدہ جنّت کے متعلق یہ ہے۔ کہ اُس میں جابجا آگ سُلگ رہی ہوگی۔ جس کے گرد جمع ہو کر لوگ اپنے بدن گرم کر سکیں گے +

ہندوستان میں رہنے والے باشندوں کے مذہبی خیالات پر گرد و نواح کے حالات کا اس قدر گہرا اثر پڑا ہے۔ کہ وہ ہر مُفید اور مُضر چیز کی پرستش کرنے لگے ہیں۔ چنانچہ ایک طرف گائے اور پیپل اور دوسری طرف سانپ کی پرستش طبعی حالات کے اثر کے زندہ ثبوت ہیں۔ گائے کی پرستش صرف اس لئے کی جانے لگی۔ کہ وہ انسان کو دُودھ دیتی ہے۔ پیپل کی عظمت اس لئے دلنشین ہوگئی۔ کہ وہ انسان کو دھوپ سے پناہ دیتا ہے۔ سانپ اس لئے اپنے سامنے انسان کا سر نیاز خم کرانے لگا۔ کہ وہ چشم زدن میں انسان کی زندگی کو موت سے بدل دینے کا سبب بن جاتا ہے +

انسان کی زبان پر بھی طبعی حالات کا اثر نمایاں ہوتا ہے۔ جن مُلکوں میں زراعت زیادہ ہے وہاں اس کے متعلقہ علوم و فنون کے لئے ہزاروں الفاظ بن جاتے ہیں۔ جہاں مویشی کثرت سے ہوں وہاں ان کے متعلق سیکڑوں الفاظ زبان میں پیدا ہو جاتے ہیں۔ عرب میں چونکہ انسان کی زندگی کا دارومدار اونٹ پر ہے۔ اس جانور کے متعلق عربی میں سیکڑوں نام موجود ہیں۔ ہر رنگ کے اونٹ کا نام الگ اور ہر عمر کے اونٹ کے لئے جُدا لفظ ہے +

اب تک ہم نے یہ دیکھا۔ کہ طبعی حالات انسان کی زندگی پر اثر رکھتے ہیں۔ اب ہم یہ دیکھیں گے کہ انسان بھی طبعی حالات پر قابو پا لیتا ہے +

اوائل عہدِ انسانی میں جب کہ انسان کی ذہنیت ترقی نہ کرچکی تھی۔ طبعی حالات نے انسانی جماعتوں کو نقل و حرکت پر آمادہ کیا۔ جن ممالک میں سامانِ خورونوش کی قلت تھی وہاں سے لوگوں نے نقل مکانی کرکے زرخیز علاقوں کی راہ لی۔ لیکن آج اگر کسی مُلک میں قحط پڑ جائے۔ تو انسان نقل و حرکت پر مجبور نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ دوسرے ممالک کی پیداوار کو ریلوں، جہازوں اور موٹروں کے ذریعے اپنے پاس لے آتا ہے +

قرونِ ماضیہ میں انسان دوران نقل و حرکت میں مجبور ہوتا تھا۔ کہ پہاڑوں کے دامنوں میں چلتا رہے۔ اور جدھر وہ لے جائیں چلتا جائے۔ لیکن اب وہ پہاڑوں کو کاٹ کر اپنا رستہ حسبِ منشا بنا لیتا ہے۔ پہلے وہ چھوٹی چھوٹی کشتیوں پر سوار ہوکر ساحل کے ساتھ ساتھ ہزاروں میل تک منزلِ مقصود کی تلاش میں چلا جاتا تھا۔ لیکن اب بڑے بڑے جہازوں میں بیٹھ کر وہ فوراً جہاں چاہے پہنچ جاتا ہے +

انسان کے طبعی حالات پر قابو پا لینے سے دُنیا کی تاریخ پر بہت بڑا اثر ہوا ہے۔ دیکھ لیجئے جب تک مغربی اقوام کو ہندوستان تک پہنچنے کے لئے برِ اعظم افریقہ کا چکر کاٹنا پڑتا تھا۔ بہت کم کوشش یہاں پہنچنے کی کی گئی۔ لیکن جب سے نہرِ سویز کاٹی گئی ہے مغربی اقوام کی رسائی نہ صرف ہندوستان تک بلکہ تمام ایشیا تک آسان ہوگئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان۔ سیلون بلکہ ہانگ کانگ تک انگلستان کا سیاسی اثر قائم ہوگیا ہے۔ کہ ایک طویل مُدت تک اس کے زائل ہونے کی اُمید نہیں کی جاسکتی +

غرضکہ تاریخ پر طبعی حالات نے ہمیشہ اثر کیا ہے۔ اس لئے اگر ہم چاہتے ہیں۔ کہ اب یا آئندہ تاریخ کے بُرے واقعات پھر رُونما نہ ہوں تو ہم کو چاہئے کہ اُن طبعی حالات کا بغور مطالعہ کریں۔ جن کے سبب سے وہ واقعات رُونما ہوا کئے۔ یہی ایک ذریعہ ہے جس سے پُرانی غلطیوں کا اعادہ ناممکن ہوسکتا ہے۔ ورنہ ضرور ہے۔ کہ نسلِ انسانی بار بار پُرانے تلخ تجربے اُٹھاتی جائے +

عبدالوحید

رباعی

کھاتا ہے اُس کے در سے جو کھاتا ہے ٹکڑا وہ علی الحساب پہنچاتا ہے۔
عُسرت۔ عشرت۔ عنا۔ غنا کچھ بھی نہیں ہر حال میں رزّاق وہی داتا ہے

ثاقب بدایونی

کلامِ گرامی

(حضرت اُستاذی مولانا غلام قادر صاحب گرامی مدظلہٗ)

آں روز سوختم کہ نہاں راعیاں نبود
آتش بجاں فتاد کہ در جسم جاں نبود

آں چشمِ مست صبحِ ازل کرد بسملم
تیر از کماں کشاد کہ تیر و کماں نبود

حرفے کہ گفت چشمِ سخنداں شنیدہ ایم
با آنکہ گفتگوئے نگہ راز باں نبود

آنجا کہ نیم پردہ ز رُخسار برگرفت
موسےٰ نبود۔ کوہ نبود۔ امتحاں نبود

آنجا کہ برقِ جلوہ اش آمد شرارہ ریز
بلبل نبود۔ باغ نبود۔ آشیاں نبود

با حل و عقدِ بیم و رجا فقر را چہ کار
در شہرِ ما ستارہ نبود۔ آسماں نبود

انساں کشید بارِ امانت نگہ کنید
مارا بایں گیاہِ ضعیف ایں گماں نبود

چنداے ہوس فریب۔ حدیثِ فراق و وصل
بیخود بخود بپیچ کہ ایں بود آں نبود

در نزع ماجرائے گرامی زما مپرس
دل در نگاہ بود زباں در دہاں نبود

دل ذوقِ قرب داشت بایں بُعد و ایں فراق
پا بوسِ منتِ نگہِ پاسباں نبود

سودائے خام داشت گرامیِٔ پختہ کار
اندازہ سنجِ چاشنیِ امتحاں نبود

بخت جگر

(مشہور اسرائیلی ادیب شولم آش کے ایک فسانے کا ترجمہ)

بچے کے بلکنے سے بوریا کی نیند اچٹ گئی۔ آنکھیں بند کئے بیوی کو پکارا ۔ "گولڈا ننھے کو چپ کرائیو رو رہا ہے"۔

گولڈا کی طرف سے کوئی جواب نہ سنا تو اس نے آنکھیں کھول دیں۔ ادھر ادھر دیکھا۔ معلوم ہوا۔ کہ گھر میں نہیں ہے۔ پہلے تو کچھ حیرت ہوئی۔ پھر سوچا۔ نہانے کو گئی ہوگی۔ پاس ہی ایک دھجی پڑی تھی اٹھا کر بچے کے منہ میں ٹھونس دی۔ کہ روئے نہیں۔ پھر کپڑے پہننے کو اٹھ کھڑا ہوا۔

کپڑے پہنتے پہنتے یکایک خیال آیا۔ کہ زوبلنز کے گھر سے جو چاندی کے شمعدان اڑا لایا تھا۔ ان کے بدلے کتنی زمین ملے گی۔ یہ خیال دل پر کچھ ایسا چھا گیا۔ کہ اسی وقت بالاخانے کو چل دیا۔ کہ چرائے ہوئے مال کا اندازہ لگائے۔ لیکن جا کر دیکھا۔ تو کچھ بھی نہ تھا۔ گھر کا کونا کونا چھان مارا........ بے سود۔

پھرتی سے نیچے اتر آیا۔ اور اس طرف گیا جہاں اس کی بیوی نے اپنی چیزیں لٹکا رکھی تھیں۔ پردے نوچ ڈالا۔ دیکھا تو وہ بھی غائب .... اب کھلا کہ بس بھاگ گئی ہے۔

ہونہہ ہونہہ۔

"بلا سے بھاگ گئی تو بھاگ جائے۔ لعنت ہو۔ یہاں پرواہ ہی کسے ہے"۔ جبراً بے پرواہی ظاہر کرتے اور دیواروں پر تھوکتے ہوئے۔ آپ کہہ اٹھا۔ "بھئی کیا کہنا! خوب کارستانی ہے...... ہا ہا ہا!

پھر بچے کی طرف دیکھا۔

"لیکن اس کم بخت کا کیا ہوگا"؟ فکرمند سا ہو گیا۔ "اگر اتنا ہی معلوم ہو جائے کہ نامراد کہاں ہے تو خدا کی قسم میں اسے ابھی لے جا کر اس کے دروازے پر رکھ دوں۔ اور کہوں۔ لے اسے بھی ساتھ لیتی جا یہ تیرا ہی ہے"۔

یکایک ایک بھیانک خیال اس کے دماغ میں آیا۔ جس سے اس کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ اور وہ اپنا

ہونٹ دانتوں سے کاٹنے لگا۔ ہاتھ لرزنے لگے۔ بچے کے پاس آیا۔ جو ننگا پڑا ہوا تھا۔ اوپر کا میلا کچیلا چیتھڑا اپنی ننھی نازک ٹانگیں چلا چلا کر پرے پھینک دیا تھا۔ ہاتھ مُنہ میں ٹھونسے ہوئے تھے۔ ہلکے ہلکے مُسکرا رہا تھا۔ دونوں گالوں پر ننھے ننھے گڑھے پڑے ہوئے تھے .... چہرے کے خط و خال نے اُسے شُبہ میں ڈال دیا۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا۔

بچے کے پاس سے ہٹ گیا۔ ٹوپی پہنی اور جلدی سے دروازے میں قفل لگا کر باہر نکل گیا۔ بلامقصد چلے جا رہا تھا۔ مگر دل کا سکون کھو بیٹھا تھا .... بچے کی چیخیں اُس کے کانوں میں گونج رہی تھیں۔ جیسے اُسے بُلا رہی ہوں ...... خیال ہی خیال میں نظر آیا جیسے اُس کے سامنے پڑا اپنی ننھی ننھی ٹانگیں چلا رہا ہے۔ بے تحاشا رو رہا ہے .... نہیں اُسے لوٹ جانا چاہئے۔ یہ ظلم ہے۔

اپنے آپ سے کہنے لگا۔ "خدا کی قسم اگر اب وہ کم بخت میرے ہاتھ لگ جائے۔ تو میں گلے سے پکڑ لوں۔ اور اس زور سے گھونٹوں۔ اس زور سے گھونٹوں کہ زبان نکل کر باہر آ پڑے۔

نان بائی کی دُکان میں داخل ہوا۔ ایک ڈبل روٹی خریدی اور واپس گھر لوٹ آیا۔ بچہ پہلے کی طرح ننگا پڑا ہوا تھا۔ مگر مُسکرا رہا تھا۔

"لو مردُود کیا مزے سے پڑا ہنس رہا ہے"۔

.... اور پھر گھر سے نکل گیا۔ مگر ایک ایک قدم اُٹھانا دوبھر تھا۔ راستے بھر میں رہ رہ کے محسوس ہوتا تھا۔ جیسے بچے کے رونے کی آواز اُس کے کانوں میں آئی ہے۔ دل میں جیسے کوئی نشتر سا اُترا جا رہا تھا۔

زور سے مٹھیاں بند کیں اور پھر گھر لوٹ آیا۔ ابکے بچہ لگاتار چلائے جا رہا تھا۔ "ماما .... ماما ...."

"کیوں بے ماما کے بچے .... جا کے اپنی پیاری اماں کو ڈھونڈ کیوں نہیں لاتا؟ الٰہی ہیضہ آ جائے"۔

بچے کو گود میں اُٹھا لیا۔ بچہ سینے سے لگتے ہی چمٹ گیا اور اپنے پتلے پتلے ہونٹوں سے بے تابانہ کچھ تلاش کرنے لگا۔

"الٰہی اُس پر بجلی گر پڑے۔ ناگ ڈس جائے"۔ وہ کوستا جاتا اور پیار سے ننھے کے گالوں پر

تھپکی دیتا جاتا تھا: "روسمت .... شلوئے میل .... بس چُپ ہو جاؤ .... چپ کرو۔ شاباش، شاباش" +

بچہ اپنے نازک مُنہ سے تلاش میں مصروف رہا۔ اِدھر اُدھر ہاتھ گھماتا۔ کبھی سر ہلاتا۔ جیسے کچھ کہنے کو ہے۔ مگر کہہ نہیں سکتا۔ اشاروں سے مطلب سمجھ کر بوریا نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ چولھے پر ایک کٹورا رکھا ہوا تھا۔ جس میں تھوڑا سا دودھ تھا۔ ذرا سی ڈبل روٹی توڑ کر دُودھ میں بھگوئی۔ اور چمچے کے ساتھ بچے کو کھلانے لگا۔ چمکارتا بھی جاتا تھا۔ "کھالے بیٹا کھالے .... تیری اماں، شیطان لے جائے تجھے چھوڑ کر بھاگ گئی ہے .... کُتیا بھی تو اپنے بچے کو یوں نہیں چھوڑتی۔ .... وہ اُس سے بھی بدتر ہے .... روسمت .... نہیں میں تجھے نہیں چھوڑوں گا .... اپنے پاس سے کبھی الگ نہیں کروں گا" +

جب بچہ چپکا ہو گیا۔ تو اُس نے اُسے ایک کپڑے میں لپیٹ لیا۔ اور بازار کو لے چلا۔ منڈی میں اس کے آنے سے ہل چل سی پڑ گئی۔ اَیں بوریا کولک اور بچہ!

اپنی گدی پر سے کریڈنگ نے آواز دی: "اے کولک یہ بچہ کہاں سے لیا؟"

کریڈنگ کی بیوی بے تابی سے اُٹھی اور اپنی باہیں کھولے بچے کی طرف لپکی۔ خوشی سے باچھیں کھلی جاتی تھیں۔ کئی بار اپنے چہرے کو دامن سے پونچھا۔ اور بچے کے پھول سے گالوں پر ہلکے ہلکے طمانچے مارے + "کولک یہ تیرا ہے؟ .... میں تو کبھی —— اس کی پیاری پیاری آنکھوں کو تو دیکھ۔ ہیں نا بالکل مرتینہ کی سی .... اُسی کی ناک ہو بہو .... خدا کی قسم بچہ تو لعل ہے لعل .... لا مجھے دے دے" +

اُس نے بوریا سے بچہ لے لیا۔ اور اُسے اُچھالنے لگی۔ "ارے چل شریر .... بہت ترے شریر کی" +

بوڑھا کریڈنگ چوروں کا سردار آہستہ سے اُٹھا اور بچے کے پاس آ کر اُسے اچھی طرح دیکھا بھالا۔ پھر کولک کی پیٹھ تھپ تھپا کر کہنے لگا: "واہ بیٹا کولک۔ بچہ تو خوب حسین ہے .... لے ذرا اسے بڑا ہو جانے دے۔ پھر دیکھیو کیسی آسانی سے بیوپاروں کو پھاندا کرے گا .... ہاں تو اس کی ماں کون ہے؟"

"خدا کرے آگ میں جل جائے مُردار............ چاندی کے شمعدان لے کر چمپت ہو گئی" +

"اور بچّہ تجھے چھوڑ گئی"+

"ہاں"+

"یہ تو بُرا ہوا............ بہت بُرا"+

بوڑھے کریڈنگ نے اپنا سر کھجایا۔ اتنے میں اس کا بیٹا بھی آ دھمکا، اور کولک پر آوازے کسنے لگا۔ "بہت اچھا ہوا............ میں جانوں اب تم اپنا پیشہ چھوڑ دو گے اور دایہ گری کا کام شروع کرو گے............ کیوں بے کیسا چکمہ دے گئی۔ ہے نا"

کولک نے جھنجھلا کر کہا۔ "جا میاں اپنی راہ لگ۔ اللہ رزق رساں ہے۔ اور کولک، کولک ہی رہے گا"+

اُس نے بچّے کو گود میں لے لیا۔ اور گاؤں کے بیچوں بیچ چل دیا۔ اُسے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے لوگ اُس پر اُنگلیاں اُٹھا رہے ہیں۔ ہنس رہے ہیں +

جب گاؤں سے دُور نکل کر جنگل میں پہنچ گیا۔ تو ایک بڑے سے پتھّر پر بیٹھ گیا۔ آس پاس کی آدم زاد کی صورت نظر نہ آتی تھی۔ درختوں کی ٹہنیاں اپنے زرد زرد پتّے بہا بہا کر آہیں بھر رہی تھیں۔ دُور سے ایک ندّی کی مدھم سی آواز سُنائی دے رہی تھی۔ جو پتھروں سے ٹکراتی، اُچھلتی کُودتی بہی جا رہی تھی +

اُس نے بچّے کو پاس ہی زمین پر رکھ دیا۔ اور اُسے ترچھی نظروں سے گھُورنے لگا۔ بچّہ انگوٹھا چوس رہا تھا۔ اور چُپکے چُپکے باپ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی سوچ میں کھویا ہوا ہے بوریا کی سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا۔ کہ بچّے کے ساتھ کیا سلوک کرے۔ لمحہ بھر کے لئے اُس کے جی میں آئی کہ اسے یہیں جنگل میں چھوڑ کر چل دے۔ مگر فوراً ہی اس ننھی سی جان، اپنے ہی گوشت، اپنے ہی خُون کی بے بسی پر دل بھر آیا۔ اُس نے پھر گود میں اُٹھا لیا۔ اور محبّت سے اُس کے نازک جسم کو بھینچا۔ پھر غور سے اس کے چہرے کی طرف جو دیکھا۔ تو اُسے اپنے ہی خط و خال جھلکتے ہوئے نظر آئے اور اُس کے تمام جسم میں خوشی کی گرمی دوڑ گئی +

"ننھے کولک" محبّت بھری آواز میں کہنے لگا۔ "ہاں تو ننھا کولک ہی ہے............ مجھے یقین ہے کہ تو بڑا ہو کر نہایت عجیب و غریب نکلے گا۔ تو مکانوں میں کھڑکیوں اور ہوا دانوں اور چھجّوں سے داخل

ہو جایا کرے گا .... اور قفل توڑ کر بھیڑوں کی کھالیں چُرا لایا کرے گا .... پھر تیرے بچّے بھی ہونگے .... اور اُن کی ماں اُنہیں چھوڑ کر بھاگ جائے گی .... پھر کیا تو اپنے بچّوں کو لئے در بدر بھیک مانگتا پھرے گا؟ .... تو کون ہے؟ .... کولک .... تو بھی میری طرح .... تو .... میں ..."

اس نے بچّے کو ندی کے کنارے کے پاس ہی بٹھا دیا اور آپ ایک درخت کے پیچھے چھپ کر کھڑا ہو گیا کہ دیکھوں کیا کرتا ہے۔ بچّہ اِدھر اُدھر لڑھکنے لگا۔ ہاتھوں کو چُوستا اور کہتا "ماما ...... ماما ......" وہ اُس درخت سے آگے بڑھ کر ایک اور درخت کے پیچھے چھُپ گیا۔ لیکن ابھی بچّے کی آواز سُنائی دیتی تھی۔ وہ اسی طرح اس درخت سے اُس درخت کے پیچھے چھُپتا ہُوا دُور ہی دُور ہٹنے لگا۔ یہاں تک کہ اب اُسے کچھ سُنائی اور دکھائی نہ دیا۔ پھر وہ سرپٹ بھاگا۔ مگر بھاگتے ہوئے بھی ننھے کی چیخیں اُس کے کانوں میں گُونج رہی تھیں۔ یکایک خیال آیا: "کہیں لڑھکتا لڑھکتا دریا میں نہ گر پڑا ہو ...." اُس کا سر دُکھنے لگا۔ زور زور سے دُکھنے لگا۔ ہوش و حواس غائب ہوگئے۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا سا معلوم ہونے لگا اور دل کو جیسے کوئی چیرے لگا رہا ہو ...... مگر وہ بھاگتا ہی رہا ...... +

یک لخت تھم گیا۔ اِدھر اُدھر دیکھا اور پوری تیزی سے اُلٹے پاؤں واپس لوٹا۔ بچّے کے پاس پہنچا تو دیکھا۔ کہ زور زور سے رو رہا ہے۔ اُس نے گود میں لے لیا۔ اور وہاں سے چلا آیا۔ جنگل کے سرے پر کچھ جھونپڑیاں سی بنی ہوئی تھیں ...... ایک ایک گھر سے گزرتا ہُوا ٹوٹی ہوئی آواز میں بھیک مانگ رہا تھا۔ "یتیم بچّے کو تھوڑا سا دُودھ دو۔ بے ماں کے بچّے کو تھوڑا سا دُودھ دو ...."

غلام عباس

یاد رکھئے

مخزن ہر مہینے ٹھیک پہلی تاریخ کو ڈاک میں ڈال دیا جاتا ہے۔ اگر وقت پر نہ ملے تو اپنے حلقے کے چٹھی رساں سے پوچھئے۔ رسالہ نہ پہنچنے کی شکایت ۱۰ تاریخ تک دفتر میں پہنچ جانی چاہئے بعد میں مسموع نہ ہوگی۔ خط لکھتے وقت خریداری کے نمبر کا حوالہ ضرور دیجئے +

مینجر

یہ دھڑکن کیسی؟

(از میاں ایم اسلم صاحب)

تو پھر یہ دھڑکن کیسی؟ میں محرومِ اُلفت ہوں۔ لیکن ایک آس کا سہارا لئے بیٹھا ہوں۔ میں جانتا ہوں۔ کہ گُلِ مراد کبھی شگفتہ نہ ہوگا۔ نخلِ تمنا کبھی بارآور نہ ہوگا۔ تو پھر یہ دھڑکن کیسی؟

رُخصت کی گھڑی سر پر کھڑی ہے۔ میں دیکھتا ہوں لیکن پھر بھی آنکھیں سیر نہیں ہوتیں۔ میں سمجھتا ہوں۔ کہ یہ آخری ملاقات ہے۔ لیکن پھر بھی ایک آس لگائے بیٹھا ہوں۔ اس وحشت کا بھی کچھ ٹھکانا۔ اس اضطراب کی بھی کوئی حد؟

مجھے تیری رُخصت کا وقت یاد ہے........ خوب یاد ہے۔ تیری آنکھیں میرے چہرے پر پیوستہ تھیں۔ میں تیری معصوم آنکھوں میں ایک انہونی روشنی کی جھلک دیکھتا تھا۔ تیرے بھولے بھالے اور معصوم چہرے پر نیلگوں زردی پھیلتی نظر آتی تھی۔ میں سمجھتا تھا........ اور خوب سمجھتا تھا۔ کہ تجھے وہاں سے بلاوا آچکا ہے۔ لیکن پھر بھی میں مایوس نہیں تھا۔ مجھے تیری معصوم زندگی کے وہ آخری لمحے خوب یاد ہیں۔ میرے دل پہ خوب نقش ہیں۔ اور اب اس نقش کو کوئی یاد محو نہیں کر سکتی۔

موت نے گو ہمیں ایک دوسرے سے جُدا کر دیا۔ لیکن موت کا زبردست ہاتھ تجھے میرے دل سے جُدا نہیں کر سکا۔ مجھے ایک خیال ہے۔ نہیں نہیں یقین ہے۔ اور یہی یقین میری بے کیف زندگی کا سہارا ہے...... تو مجھ سے جُدا نہیں۔ تو پھر یہ دھڑکن کیسی؟ اور اتنا اضطراب کیسا؟

تیرے کھیلنے کی چیزیں جہاں جہاں تو نے رکھی تھیں۔ وہیں پڑی ہیں۔ اور تا دمِ زیست یوں ہی رکھی رہیں گی۔ کیوں؟

مجھے یقین ہے اور میرا دل محسوس کرتا ہے۔ کہ تو دن میں کئی کئی بار اپنے کھلونوں سے آکر کھیلتا ہے۔

(محبوب) تیری موجودگی سے میرے تاریک گھر کی فضا میں ایک رونق ۔ ایک برکت نظر آتی ہے۔ قلب کو راحت ملتی ہے .... میں تجھ کو دیکھتا ہوں ۔ لیکن نہیں کہہ سکتا ۔ کہ کس طرح دیکھتا ہوں .... لیکن جب دیکھتا ہوں ۔ تو پھر یہ دھڑکن کیسی ؟

(محروم) میں تیری آواز کو ترستا ہوں .... میں وہ قسمت کا ہیٹا ہوں جو تیرے معصوم پیار سے محروم ہوا ہے

در جہاں مثلِ چراغِ لالۂ صحرا ستم
نے نصیبِ محفلے نے قسمتِ کاشانۂ

طمانیت

ایک نوجوان دار السلطنت کے ایک پُر رونق بازار میں سے اُچھلتا کودتا جا رہا ہے۔ اُس کی حرکات سے مسرت عیاں ہے۔ آنکھوں میں چمک لبوں پہ مسکراہٹ اور چہرے سے شادابی نمایاں ہے .... وہ طمانیت اور انبساط کا مجسمہ معلوم ہوتا ہے +

بات کیا ہے۔ کیا اس کو بہت بڑی جائداد مل گئی ہے؟ کیا وہ اپنی محبوبہ سے ملنے جا رہا ہے؟ یا اُس نے صرف پیٹ بھر کر اچھا کھانا کھایا ہے۔ اور اُس کیفیت کو محسوس کر رہا ہے۔ جو سیر ہونے کے بعد پیدا ہوتی ہے؟ یقیناً لوگوں نے اُسے تختِ شاہی پر تو بٹھا نہیں دیا!

نہیں ان میں سے کوئی بھی بات نہیں۔ اصل معاملہ یہ ہے۔ کہ اُس نے ایک دوست کے خلاف ایک تہمت تراشی ہے۔ خود ہی اس خبر کو عوام میں پھیلایا ہے۔ اور اب اُس نے خود ہی ایک اور دوست کی زبانی یہ خبر سُنی ہے۔ اور خود ہی اس خبر پر یقین بھی کر لیا ہے +

یہی وجہ ہے کہ یہ نوجوان اس قدر مسرور اور مطمئن ہے +

(ترجمہ) بدر الدین

تعلیم اور تجارت

(از جناب میاں ایم اسلم صاحب)

ہندوستان سے باہر جس مُلک میں بھی لوگ اپنے بچوں کو تعلیم دلاتے ہیں۔ اُن کا مقصد یہ ہرگز نہیں ہوتا۔ کہ کالج کی ڈگریاں حاصل کر لینے کے بعد ان کے بچے حکومت کی ملازمت میں منسلک ہو جائیں +

یہ لعنت صرف ہندوستان ہی کے حصّے میں آئی ہے۔ کہ مُلک کے نوجوان بے حد کوشش سے علمی ڈگریاں حاصل کر چکنے پر ملازمت کی جستجُو میں سرگرداں نظر آتے ہیں۔ اس میں کچھ شک نہیں۔ کہ تعلیم یافتہ طبقے کے لوگ اگر ملازمت اختیار نہ کریں۔ تو حکومت کی کل آسانی سے نہیں چل سکتی۔ لیکن کیا یہ ضروری ہے کہ کالجوں اور مدرسوں سے نکلتے ہی تلاشِ معاش کے لئے صرف ملازمت ہی کی جستجُو کی جائے۔ ہم اس قسم کی مثالوں کو پیشِ نظر رکھ کر کہہ سکتے ہیں۔ کہ ہندوستانیوں کا باوا آدم ہی نرالا ہے۔ اس جگہ قومی پستی اس حد تک پُہنچ چکی ہے۔ کہ سرکاری ملازمت ہی کو ایک باعزّت اور باوضع زندگی قرار دیا گیا ہے۔ لیکن اور مُلکوں میں یہ حال نہیں +

یورپ میں عام طور پر ایک لوئر سٹینڈرڈ تک جو ہندوستان میں انٹرنس کے درجہ کا ہوتا ہے۔ یکساں تعلیم دی جاتی ہے۔ اس سٹینڈرڈ کو عبور کر لینے کے بعد طالب علم کو یا اُس کے والدین کو یہ فیصلہ کرنا پڑتا ہے۔ کہ مراحلِ حیات طے کرنے کے لئے کونسا راستہ اختیار کیا جائے۔ اس فیصلے کے لئے بچّے کی طبیعت کی رفتار پر نگاہ رکھنا نہایت ضروری ہوتا ہے۔ بچّے کے مذاق کے مطابق یا خاندان کے طرزِ زندگی کو مدِّنظر رکھتے ہوئے لوئر سٹینڈرڈ کے بعد لڑکے کی تعلیم شروع ہوتی ہے۔ عام طور پر تاجر کا بیٹا تاجر بنتا ہے۔ ایسی مثالیں بھی موجود ہیں جن سے اس خیال کی تردید ہوتی ہے۔ لیکن وہ گنتی کی مثالیں ہیں +

یورپ میں قومی اور ملکی آزادی کو برقرار رکھنے کے لئے تجارت کو سب پیشوں پر فوقیت دی جاتی ہے۔ وہ لوگ جو اپنے لڑکوں کو کاروباری زندگی میں ڈالنا چاہتے ہیں وہ ابتدائی تعلیم حاصل کر لینے کے بعد

ایسی درس گاہوں میں بھیج دیتے ہیں جہاں ان کو ضروری تعلیم مل سکتی ہے۔ لیکن افسوس ہندوستان میں نوجوانوں کو اس قسم کی سہولتیں حاصل نہیں۔ یہاں مدرسوں اور کالجوں میں نوجوانوں کو محض تعلیمی ڈگریاں حاصل کرنے کے لئے ایسی کتابیں رٹوائی جاتی ہیں۔ جو اُن کی زندگی کے آئندہ طرزِ عمل میں کچھ فائدہ مند ثابت نہیں ہوتیں +

یورپ میں تاجر کو خاص عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ ان لوگوں کے نقطۂ نظر سے تجارت ایک شریفانہ اور معزز پیشہ ہے۔ اور تاجر بنی نوعِ انسان کی ہر وقت خدمت کرتا ہے۔ قدرتاً ہر ایک شخص کی یہ خواہش ہوتی ہے۔ کہ وہ بلا منت اور کسی کا دست نگر ہوئے بغیر ایک شریفانہ زندگی بسر کرے۔ بعض نوجوان اسی آرزو کو پہلو میں لئے ہوئے ڈاکٹری کا پیشہ اختیار کر لیتے ہیں۔ ڈاکٹری بلاشک وشبہہ ایک بہت معزز اور شریفانہ پیشہ ہے۔ لیکن ڈاکٹر اپنے مُلک کے لئے سیاسی نقطۂ نگاہ سے اس قدر مفید نہیں ثابت ہو سکتا جس قدر ایک تاجر +

تجارت کے لئے یہ ہرگز ضروری نہیں۔ کہ انسان کے پاس بہت کافی سرمایہ ہو۔ یا تجارت کا پیشہ اختیار کرنے والا اعلےٰ تعلیم یافتہ ہو۔ تجارت ایک ایسا دلچسپ اور پُرلطف پیشہ ہے۔ کہ ہر ایک انسان قدرتی طور پر اس کی جانب مائل ہو سکتا ہے۔ لیکن ناواقفیت کے باعث یہ عام طور پر دیکھا جاتا ہے۔ کہ لوگ اس شریفانہ اور بے حد مفید پیشے کی طرف کچھ زیادہ توجہ نہیں دیتے۔ اور نہ ہی اس کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ بلکہ تجارت کی طرف اُس وقت توجہ کی جاتی ہے جب اور سب طرف سے مایوسی ہو جاتی ہے کبھی یورپ کی بھی یہی حالت تھی۔ تعلیم یافتہ نوجوان جب کوئی معقول ملازمت حاصل نہ کر سکتے۔ تو پادری بن جاتے کیونکہ اس وقت "پادری" بن کر مُلک کی خدمت کرنا بھی ایک اہم خدمت تصور ہوتا تھا +

یورپ میں آج کل بڑی بڑی درس گاہوں میں اس بات کا بھی خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ کہ اعلےٰ تعلیم حاصل کرنے والے نوجوانوں کو تجارتی تعلیم کا شوق بھی دلایا جائے۔ پہلے عرف عام میں تاجر اُس کو سمجھا جاتا تھا۔ جو سستے داموں خرید کر مہنگے داموں بیچے۔ لیکن اب یہ پُرانا خیال بالکل دُور ہو چکا ہے اُس کے ساتھ ہی اب وہ زمانہ بھی نہیں رہا۔ جب کہ لوگ گھروں سے مختلف قسم کی اشیا جہازوں میں لاد کر غیر ملکوں کا سفر کیا کرتے تھے اور زر و جواہر سے لدے ہوئے۔ وطن واپس آیا کرتے تھے۔ زمانہ اب اس قدر ترقی کر گیا ہے۔ کہ امریکہ اور افریقہ کی وحشی اقوام جو منکوں اور لوہے کے تاروں کے عوض نہایت قیمتی

کھالیں اور ہاتھی دانت دے دیا کرتی تھیں۔ اب اپنے مال کی قدر و قیمت سے آشنا ہوگئی ہیں +

اب وہ زمانہ ہے۔ کہ خریدنے والا اور فروخت کرنے والا دونوں یہ جانتے ہیں۔ کہ منڈی میں سب سے زیادہ مقبول وہی چیز ہے جس کے دام کم ہیں۔ اس زمانے میں ایک ہوشیار تاجر وہی شخص متصور ہوتا ہے جو سستا مال بیچے اور مقابلتاً کم فائدہ حاصل کرنے پر قانع رہے +

یہ تعلیم ہی کی بدولت ہے۔ کہ ہم لوگ تجارت کو ایک معزز پیشہ خیال کرنے لگے ہیں۔ اور تعلیم اب اس قدر ترقی کر چکی ہے۔ کہ ایک کامیاب تاجر بننے کے لئے یہ ضروری نہیں کہ ہم ضرور کسی تاجر کے گھر ہی پیدا ہوئے ہوں۔ ایک وہ زمانہ تھا۔ کہ ہم ضروریاتِ زندگی کے لئے گاؤں یا قصبے کے دکاندار کے پاس بھاگے جاتے تھے۔ لیکن اب اس دکاندار کی جگہ ہم کو بڑے بڑے سوداگر نظر آتے ہیں۔ اس وقت ان سوداگروں کا یہ کام ہے۔ کہ وہ دنیا کے مختلف حصوں سے چیزیں منگوا منگوا کر ذخیرہ جمع کرتے ہیں اور منافع پر آگے بیچتے ہیں۔ لیکن اب اس گروہ کے مقابلے پر ایک اَور جماعت کھڑی ہوگئی ہے۔ جو دوسرے ملکوں سے مختلف چیزیں منگوا کر خود ان کے مرکب تیار کرتی ہے اور پھر اپنے کارندوں کی معرفت دنیا کے ہر کونے میں ان کو پہنچاتی ہے۔ اور یہی وہ جماعت ہے جو سیاسی نقطۂ نگاہ سے ملک کی آزادی اور قومی وقار قائم رکھ سکتی ہے۔ اور یہی وہ جماعت ہے جس کی تقلید ہر ایک کو تعلیم حاصل کر چکنے کے بعد کرنی چاہیئے +

جب تک ایک ملک ضروریاتِ زندگی کے لئے دوسرے ملک کا دستِ نگر ہوگا۔ نہ وہ اپنا وقار قائم رکھ سکتا ہے اور نہ ہی آزادی کی ہوا کھا سکتا ہے۔ اسی لئے راہبرانِ قوم کی یہ کوشش بھی ہونی چاہیئے کہ وہ ملک کی اعلےٰ تعلیمی درس گاہوں میں ٹکنیکل تعلیم کے رواج کی کوشش کریں تاکہ ملک کے نوجوان اعلےٰ تعلیم پاکر جب میدانِ عمل میں نکلیں۔ تو تلاشِ معاش کے لئے ریلوے دفاتر کے دروازوں کی پاسبانی کرتے ہوئے یا ملکی عدالتوں کے کمروں کے سامنے گدھ کی طرح شکار کی تاک میں بیٹھے نظر نہ آئیں +

ہمارے ملک میں ملازمت کے بعد اعلےٰ تعلیم یافتہ نوجوان وکالت کا پیشہ اختیار کرتے تھے۔ اور اس کو ایک نہایت شریفانہ اور باعزت ذریعۂ معاش تصور کرتے ہیں +

روم کا مشہور ادیب "سسرو" جو ایک اعلےٰ درجے کا وکیل بھی تھا۔ کہتا ہے۔ کہ وکالت کا پیشہ روم کے اعلےٰ خاندان کے صرف اعلےٰ تعلیم یافتہ نوجوان ہی اختیار کر سکتے تھے۔ یہ پیشہ تمام پیشوں سے معزز سمجھا جاتا تھا۔ حکومت اور ملک دونوں وکیل کو خاص احترام اور عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اور وکیل کسی سے ایک کوڑی لئے بغیر عدالتوں میں پیش ہوتے تھے۔ معاوضے میں کسی سے کوئی چیز لینا ایک نہایت کمینہ فعل سمجھا جاتا تھا +

لیکن اب اس معزز پیشہ کی جو گت بنتی عام طور پر دیکھی جاتی ہے۔ وہ کسی شخص سے پوشیدہ نہیں۔ اور نہ ہی کسی تشریح کی محتاج ہے +

اب سوال یہ ہے۔ کہ ہم ایک نوجوان کو تجارتی زندگی کے لئے کس وقت تیار کریں اور کونسی راہ اختیار کرنے کا مشورہ دیں۔ ملک کی حالت کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہم کو اس راستے میں بہت سی دقتیں نظر آتی ہیں۔ لیکن موجودہ ملکی پستی کا علاج صرف تجارت ہی ہے۔ اور اس کے لئے ٹکنیکل تعلیم نہایت ضروری ہے۔ اس سے دونوں مقصد حاصل ہوتے ہیں۔ ایک تو طالب علم درسی تعلیم حاصل کرتا ہے۔ دوسرے وہ ساتھ کے ساتھ تلاش معاش کی فکر سے بھی بے نیاز ہوتا چلا جاتا ہے۔ لیکن اس کام کے لئے ان لوگوں کو جو طالب علم کی تعلیم کے ذمہ دار ہیں ہر وقت مستعد رہنے کی اشد ضرورت ہے اور وہ اس لئے۔ کہ کہ اس کام میں اگر کسی طالب علم کو کامیابی نہ ہوئی تو پھر اس کی آئندہ زندگی بالکل تلخ ہو جائے گی +

اس مسئلے پر مشہور و معروف مسٹر ہنری فورڈ" اپنی کتاب "مائی لائف اینڈ ورک" میں بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

"بچے جب کوئی کام شروع کرتے ہیں۔ تو ان کی یہ خواہش ہوتی ہے۔ کہ ان کے گرد و پیش ایسے ہم جولی ہوں جو ان کی طرح اس کام میں مشغول ہوں۔ اور اگر یہ صورت قائم نہ رہے تو پھر جس کام میں ان کو لگایا جائے۔ ضرور ناکامیابی ہوگی اور اس کا اثر اس قدر مہلک ہوگا کہ بچے کی آئندہ زندگی ناخوشگوار طور پر کٹے گی۔ کاروباری زندگی میں ہر ایک شخص کی یہی خواہش ہوتی ہے کہ اس کے گرد و پیش اپنے ہی جیسے لوگ نظر آیا کریں۔ کیونکہ ایک کو دیکھ کر دوسرا تقویت حاصل کرتا ہے۔ لیکن اس قسم کی صحبت سے سیکڑوں ایسے اشخاص

ناکارہ ہو جاتے ہیں۔ جن سے اچھے اچھے کاموں کی توقع ہو سکتی تھی +

کاروباری زندگی ان قیود سے بالاتر ہے۔ اس میں یہ سوال ہرگز پیدا نہیں ہونا چاہئے کہ ہم فلاں آدمی کے ساتھ کام کرنا پسند نہیں کرتے۔ ہمیں اس بات کو مدِ نظر رکھنا چاہئے کہ ہمیں آدمی سے کام نہیں بلکہ اس کام سے مطلب ہے۔ ممکن ہے ہم اسے اس لئے ناپسند کرتے ہوں کہ وہ ہم سے زیادہ سرگرمی سے کام کرتا ہے" +

ٹکنیکل تعلیم کے لئے یہ ضروری ہے۔ کہ ہم لڑکے کو کسی کارخانے میں داخل کرا دیں۔ وہ کچھ مدّت سے اس کارخانے کے مختلف شعبوں میں کام کرنے کے بعد اپنے لئے خود ہی موزوں راستہ اختیار کرے گا۔ اور پھر اس خاص راستے پر گامزن ہو کر وہ ان لوگوں کی نگاہ میں ایک خاص امتیاز حاصل کرے گا۔ جو اس کارخانے میں اس کے افسر کہلاتے ہوں یہ لوگ اگر تھوڑی سی دلچسپی کا بھی اظہار کریں گے۔ تو وہ لڑکا ایک روز ضرور اس قابل ہو جائے گا۔ کہ تعلیم یافتہ بھی ہو اور تلاش معاش سے بے فکر بھی۔ اس قسم کے کاروبار کے لئے جن لوگوں کو تیار کرنے کا ہم لوگ ارادہ کریں ہمیں ایک بات کی خاص طور پر احتیاط کرنی ہوگی ہمیں لڑکے کی عادات کو اچھی طرح مطالعہ کرنا ہوگا۔ اگر اس قسم کے طالب علم میں فضول خرچی کی عادت ہو تو پھر یہ سمجھ لینا چاہیئے۔ کہ وہ طالب علم اس کام کے لئے موزوں نہیں +

فضول خرچی کی عادت ایک سخت خطرناک عادت ہے۔ اور اس کی ذمہ داری تمام تر بچے کے والدین پر عائد ہوتی ہے۔ تجارتی آدمی کے لئے فضول خرچی کی عادت ایسی ہی ہے۔ جیسے جاندار کے لئے زہر +

ٹکنیکل تعلیم کے ساتھ ساتھ ایک اور چیز کا بھی خیال رکھنا ہوتا ہے اور وہ یہ ہے۔ کہ طالب علم کے دل میں اعلےٰ خیالات پیدا کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس کے دل میں یہ تمنّا پیدا کی جائے۔ کہ وہ ایک روز کارخانے سے نکل کر دنیا کا ایک مشہور کاریگر متصور ہوگا۔ ٹکنیکل تعلیم کے لئے یہ بھی ضروری ہے۔ کہ طالب علم کو یہ عادت بھی ڈالی جائے۔ کہ ہر کام وقت کی پابندی کے ساتھ کیا جائے۔ ایک کامیاب زندگی بسر کرنے کے لئے یہ نہایت ضروری ہے۔ کہ وقت کی پابندی پورے طور پر کی جائے۔ اور آج کا کام کل پر ہرگز ہرگز نہ ڈالا جائے۔ اور کام ختم کر لینے کے بعد نہایت صبر اور حوصلے سے نتائج کے ظہور کا منتظر رہنے کی تعلیم دی جائے +

"ہنری فورڈ" کا قول ہے :-

"کاروباری زندگی میں صرف وہی شخص کامیاب ہو سکتا ہے اور صرف وہی ایک شخص اعلیٰ مدارج حاصل کر سکتا ہے۔ جو اس بات کا خوگر ہو۔ کہ کام ختم کر لینے کے بعد نہایت صبر و تحمل سے نتیجے کا منتظر رہے" ÷

لیکن یہ باتیں جب ہی حاصل ہو سکتی ہیں۔ کہ انسان اعلیٰ تعلیم سے بے بہرہ نہ ہو۔ "صنعت، حرفت اور تجارت" دو ایسی چیزیں ہیں۔ کہ اگر کسی ملک کے تعلیم یافتہ نوجوان اپنے ملک کو پستی اور غلامی کی زندگی سے آزاد کرانا چاہیں۔ تو ان کے ذریعے بغیر کسی متنفس کا خون بہائے آزاد کرا سکتے ہیں۔ صنعت و حرفت اور تجارت کی بدولت ایک قوم دوسری اقوام میں عزت اور افتخار حاصل کر سکتی ہے۔ اور ملک کے فرزند دوسرے ممالک میں جا کر قومی وقار کے ساتھ اپنا سر اونچا کر سکتے ہیں ÷

زندگی

(از جناب لالہ تلوک چند صاحب محروم)

مجھ سے ہے گر داستانِ رنج و غم ہے زندگی — ورنہ تیرا لطف ہے تیرا کرم ہے زندگی

ہر سحر پیغام دیتے ہیں یہ مرغانِ سحر — نالۂ بے اختیارِ صبحدم ہے زندگی

تو نہ ہو تو اے غمِ جاناں یہ ہے بیکار چیز — تیرے ہوتے مغتنم ہے مغتنم ہے زندگی

آہن تاریک ہے بے پرتوِ انوارِ عشق — عشق کے پرتو سے رشکِ جامِ جم ہے زندگی

زندگی وابستہ ہے میری ترے الطاف سے — مجھ کو پیاری اس لئے تیری قسم ہے زندگی

آخرِ جہنّم

(افسانہ)

زیاد کو دُنیا کے تمام ممالک کے جیل خانوں کے متعلق بے انتہا ذاتی واقفیت حاصل تھی۔ وہ ان میں سے ہر ایک پر ایک ضخیم کتاب لکھ سکتا تھا۔ وہ ایک جہازی تھا۔ مشرق سے مغرب اور شمال سے جنوب تک کوئی ایسی بندرگاہ نہ ہوگی جو اُس نے نہ دیکھی ہو +

ایک دن جب اُس کا جہاز مال و اسباب لے کر کسی دوسرے مُلک کی طرف جا رہا تھا۔ زیاد صبح سویرے نیند سے بیدار ہو کر بستر سے اُٹھا۔ اور تختۂ جہاز پر سمندر کا تماشہ دیکھنے آیا۔ اتفاقاً اُس کا پاؤں سیڑھی پر سے پھسل گیا۔ اور وہ سر کے بل نیچے گرا۔ اُس کا سر پھٹ گیا اور اس سے قبل کہ دوسرے جہازی اُس کی مدد کو پہنچیں۔ بیچارے کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی +

حیرت کی بات ہے۔ کہ زیاد جیسا آدمی۔ اس قدر مجرمانہ زندگی بسر کرنے کے بعد پھانسی پر لٹکنے۔ سولی پر چڑھنے، بندوق یا پستول کا نشانہ بننے، گلا دبا کر مار دیا جانے، چاقو یا خنجر سے ہلاک ہونے کے بجائے ایک قدرتی موت مرے خیر..........

جہاز کا روزنامچہ نکال کر امیرِ جہاز نے ایک رپٹ ذیل کے الفاظ میں درج کر دی :۔

"زیاد۔ آج مورخہ ۲۶۔ جون ـــــ۔ عرض بلد ۵۰ طول بلد ۶۰ سیڑھی پر سے پھسل کر مر گیا +" اور بس.........

اُس کے ہمراہیوں نے اُس کے پاؤں میں لوہے کا ایک بڑا سا ٹکڑا باندھ کر اُسے ایک تھیلے میں بند کر دیا۔ اور خدا سے اُس کی مغفرت کے لیئے دعا مانگنے لگے + مگر زیاد اتنا خوش نصیب کب تھا۔ کہ کسی کی دُعائیں اُس کی مغفرت کا باعث بن سکتیں + کیونکہ جہازیوں نے ابھی دعا کے لیئے ہاتھ اُٹھائے ہی تھے کہ اُفق پر ایک بہت بھاری طوفان آتا ہوُا دکھائی دیا۔ جہاز میں بھاگڑ پڑ گئی۔ تمام جہازی دعا کو بیچ ہی میں چھوڑ کر بادبان لپیٹنے میں مشغول ہو گئے۔ ایک دو نے تھیلے کو اُٹھا کر سمندر میں پھینک دیا۔ اور بیچارہ

زیاد میلوں گہرے سمندر کی تہ میں کیچڑ اور مچھلیوں کے درمیان پہنچ گیا +

اگرچہ وہ مر گیا تھا اور امیر جہاز نے بھی روزنامچے میں اُس کی موت کی اطلاع درج کر دی تھی مگر زیاد کو ابھی تک اپنی اچانک موت کا علم نہ ہوا تھا۔ اور جب اُس نے سبزی مائل سمندر کی تہ میں آنکھیں کھولیں تو اس نے یہی سمجھا۔ کہ میں وہی زیاد ہوں۔ مگر دراصل وہ زیاد نہ تھا۔ بلکہ (غالباً آپ سمجھ گئے ہونگے) صرف اُس کی روح تھی۔ اُس نے عمر بھر مذہبی تعلیم حاصل نہ کی تھی۔ اور اگر کبھی تھوڑی بہت کی بھی تھی تو وہ اُسے فراموش کر چکا تھا۔ ورنہ اُسے ضرور معلوم ہوتا۔ کہ میں صرف ایک روح ہوں +

زیاد پہلے کچھ گھبرا سا گیا۔ اور اُس کی گھبراہٹ قدرتی تھی۔ اُس نے اپنی زندگی میں عجیب وغریب مقامات دیکھے تھے۔ مگر یہ جگہ اُن سب سے عجیب تر واقع ہوئی تھی۔ وہاں بادل، ہوا اور سورج تینوں میں سے کسی کا بھی نام ونشان نہ تھا۔ صرف زردی مائل سبز روشنی چاندنی سے کچھ کچھ مشابہ فضا کو منور کئے ہوئے تھی +

زیاد یہ معلوم کرنے کے لئے۔ کہ میں کہاں آ گیا ہوں چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ اُس کی نظر ایک نہایت ہی بدشکل انسان پر پڑی۔ جو لکڑی کے ایک بڑے پیپے پر بیٹھا تھا۔ اُس نے اپنی تمام زندگی میں اس قدر بدوضع آدمی نہ دیکھا تھا۔ اُس کے سر کے گرد ایک سیاہ رومال بندھا تھا۔ دائیں آنکھ کے قریب ایک بڑا سا بدنما پھاہا لگا ہوا تھا + اُس نے ایک ڈھیلا پاجامہ اور بڑے بڑے جہازی بوٹ پہن رکھے تھے۔ اُس کی کمر پر ایک پیٹی تھی۔ جس میں ایک زنگ آلود خنجر اور دو پستول لٹک رہے تھے۔ اس ہیبت ناک آدمی نے زیاد کی طرف دیکھتے ہی حیرت آمیز لہجے میں پوچھا:۔

"تم کون ہو جی؟"

زیاد نے بھی اُسی قدر حیرت میں جواب دیا:۔

"تم کون ہو جی؟"

"مگر تم آئے کہاں سے ہو؟"

"میں تخت رواں' جہاز سے آیا ہوں۔ مگر یہ صرف خدا ہی کو معلوم ہے کہ میں کہاں ہوں۔ کب اور کس طرح پہنچا ہوں؟"

"کہاں ہو؟ تم یہاں عدم آباد میں ہو! اور کہاں؟"

"مگر میں تو ابھی زندہ ہوں مُردوں میں کیسے پُہنچ گیا"؟
یہ الفاظ سُن کر بدوضع آدمی نے ایک بے ساختہ قہقہہ لگایا:۔
"اگر تم اس وقت بھی زندہ ہو تو پھر مروگے بھی کبھی نہیں۔ یہاں تو سب مُردے ہی مُردے ہیں"*
زیاد موت کا نام سُن کر اس قدر خوف زدہ ہوا۔ کہ اگر وہ گوشت اور پوست سے مبرّا ایک رُوح نہ ہوتا۔ تو اس کا تمام خون خُشک ہو جاتا۔ وہ ایک دم چِلّا اُٹھا:۔
"ایں۔ مُردہ! میں زیاد۔ مُردہ"!
زیاد انتہائی بے چینی کی حالت میں تھا۔ اُسے اتنی جلدی مرنے کی توقع ہرگز نہ تھی۔ اور درحقیقت یہ واقعہ ایک انسان کو تذبذب میں ڈالنے کے لئے کافی سے زیادہ ہے۔ آپ ہی غور کیجئے کہ اگر آپ اپنے آپ کو زندہ تصوّر کرتے ہوں اور آپ کو یقین دلادیا جائے۔ کہ آپ مُردہ ہیں تو آپ کی کیا حالت ہوگی۔ یہی ماجرا زیاد کا تھا۔ اُس نے واویلا اور چیخ پکار شروع کردی*
"ہائے اللہ کیا اب مجھے کوئی تنخواہ نہ ملا کرے گی! کیا اب مجھے کبھی دُنیا کی شکل دیکھنی نصیب نہ ہوگی"*
"ہرگز نہیں! دوست ہرگز نہیں! اب تمہارا خاتمہ ہو چکا ہے۔ اب تم مُردہ ہو۔ تحمل سے کام لو اور آہ وزاری چھوڑ دو۔ تم یہاں دُنیا سے کہیں زیادہ آرام میں ہوگے۔ یہاں تم کو بڑے بڑے آدمیوں کی صحبت نصیب ہوگی۔ یہاں بڑے بڑے امیرالبحر۔ مدبّر۔ کپتان۔ ناخدا اور جہازی موجود ہیں۔ آؤ۔ میرے ساتھ ہو لو۔ اس طرف سے دوست، ذرا سنبھل کر، ہوشیاری سے"*
زیاد بیچارہ سہما سمٹا۔ اُس کے پیچھے ہو لیا۔ کچھ دُور جا کر وہ ایک غار کے قریب پہنچ گئے*
"ہاں میں بھُول گیا۔ تمہارا نام کیا ہے"؟
"زیاد"*
"خوب۔ اب ہم اندر چلیں گے۔ مگر دیکھو زبان سنبھال کر رکھنا اور جب تک تم سے سوال نہ کیا جائے مُنہ سے نہ بولنا"*
یہ کہہ کر وہ غار میں داخل ہو گیا۔ زیاد بھی اُس کے پیچھے پیچھے تھا۔ غار کی وسعت دیکھ کر زیاد دنگ رہ گیا یہ اس قدر وسیع تھی۔ کہ اُس کا دوسرا سرا دکھائی نہیں دیتا تھا۔ ہر طرف لوگ تاش، پانسہ، چوسر اور شطرنج وغیرہ کھیل رہے تھے۔ اور بہت سے تمباکو پی رہے تھے۔ ہر طرف شراب کا دَور چل رہا تھا۔

زیاد خوشبو سے پہچان گیا۔ کہ یہ انگوری شراب ہے۔ اب تو اُس کے مُنہ میں بھی پانی بھر آیا ....

یہ ایک عجیب قسم کا مجمع تھا۔ اس میں ہر عمر، ہر رنگ اور ہر مذہب وملت کے آدمی موجود تھے۔ اور اپنی اپنی پسند کے مطابق تفریح میں مشغول تھے +

اتنے میں کسی نے بڑے زور سے آواز دی :۔

"گھنٹی بجاؤ" +

ایک آدمی ایک بہت بڑی گھنٹی کے پاس گیا اور ہتوڑے سے تین مرتبہ اس پر ضرب لگائی۔ گھنٹی کی آواز سُنتے ہی ہر شخص نے کھانا پینا اور کھیلنا ترک کر دیا۔ اور تمام غار میں ایک کامل سکوت چھا گیا۔ گھنٹی کی آواز ابھی کانوں میں گونج رہی تھی۔ کہ غار کے ایک اَور دروازے سے جو کہ پاس ہی تھا۔ ایک عجیب الخلقت آدمی داخل ہوا۔ اُس کا قد سات فٹ تھا۔ ناک بہت ہی بھدّی اور دانت نہایت بدنما۔ اُس کی آواز اس قدر دہشت انگیز تھی۔ کہ زیاد کانپنے لگا۔ یہ عجیب وغریب آدمی ذرا آگے بڑھا اور ایک چوکی پر بیٹھ گیا۔ اُس کے پیچھے پیچھے ایک پست قامت مسخرہ بھی تھا۔ اُس کے سر پر ایک عجیب قسم کی ٹوپی تھی۔ جس کا پُھندنا ادھر اُدھر پھُدک رہا تھا۔ اس مسخرے نے ہتوڑے کو اُٹھا کر گھنٹی پر ایک ضرب لگائی اور بلند آواز میں کہا :۔

"بس خاموش! شہنشاہ ہیبت پناہ افناتان کے نام پر خاموشی"!

افناتان نے ایک ہیبت ناک آواز میں پوچھا ۔" ہماری محفل میں کونسا نیا اضافہ ہوا ہے"؟

زیاد کے ساتھی نے آداب بجا لاتے ہوئے زیاد کی طرف اشارا کیا +

"نام"؟

افناتان نے اپنی قہر آلود نگاہیں اس انداز سے زیاد پر پیوست کرتے ہوئے پوچھا۔ کہ اُس کے بدن میں رعشہ پڑ گیا +

"جناب میرا نام زیاد ہے" +

پست قامت مسخرے نے زیاد کو ڈانٹ کر کہا ۔" ملکِ معظّم کہو۔ گستاخ ۔ ملکِ معظّم"!

افناتان نے حکم دیا ۔" اموات کے رجسٹر کی ننانوے ہزار نوسو ننانوی جلد لاؤ" +

چار آدمی ایک بہت ہی ضخیم کتاب اُٹھا کر لائے۔ زیاد نے اپنی ساری عمر میں اتنی بڑی کتاب نہ دیکھی تھی۔ مسخرا اس کتاب کے ورق اُلٹنے لگا۔ وہ صفحے پر صفحہ اُلٹتا جاتا تھا۔ اور اس طرح بڑبڑاتا جا

" ز .... ز .... ز .... زدار .... زیا .... یہ ہے زیاد۔ سن پیدائش ـــــ۔ ٹھیک ہے نا؟" یہ کہتے ہوئے مسخرے نے اپنی نگاہیں زیاد پر پیوست کر دیں +

"ہاں جناب"

افناتان نے دریافت کیا "اس کی کارگزاری کیسی ہے"؟

اس پر چھوٹے مسخرے نے وہ تمام جرائم اور گناہ جو زیاد سے سرزد ہوئے تھے پڑھنے شروع کر دئے۔ اور میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ان کی تکمیل میں بہت سا وقت صرف ہوا۔ جب اس نے دوسرا ورق اُلٹنے کے لئے ذرا دم لیا تو زیاد نے دیکھا۔ کہ ہر ایک دوستانہ نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھ رہا ہے۔ اُس نے بھی خوشی محسوس کرنی شروع کی۔ وہ اُس لمحے کی خواہش کرنے لگا جب کہ وہ بھی دوسروں کے ساتھ شراب اور چوسر میں شریک ہو سکے گا +

افناتان نے باغاز کو مخاطب کر کے کہا "اب تک تو کارگزاری تسلی بخش ہے۔ مگر خاص طور پر فخر کے قابل کوئی بات نہیں۔ لہٰذا زیادہ مت پھولو" +

مسخرے نے پھر پڑھنا شروع کیا:۔

"بتیس سال کی عمر میں بغاوت اور خُون کے جرائم کا ارتکاب کیا .... اٹھتیس سال کی عمر میں ـــــ"

وہ یہاں پُہنچ کر ٹھہر گیا۔ اور زیاد کے چہرے پر خوف کی ایک لہر دوڑ گئی۔ بعد ازاں مسخرے نے آہستہ آہستہ اور صاف الفاظ میں پڑھنا شروع کیا:۔

"اٹھتیس سال کی عمر میں ایک بھاری طوفان کے دوران میں تختۂ جہاز سے کود کر ایک لڑکی کی جان بچائی" +

ایک خوف ناک سناٹا چھا گیا۔ زیاد نے دیکھا۔ کہ ہر ایک کے چہرے پر تغیر آ گیا ہے اور دوستانہ نگاہوں کی بجائے سب اُسے نفرت اور حقارت سے دیکھ رہے ہیں۔ اُسے معلوم ہو گیا۔ کہ اب اُس کیلئے خوش رنگ اور لذیذ شراب میں کوئی حصہ نہیں +

افناتان نے ایک دل ہلا دینے والی آواز میں پوچھا "زیاد! کیا یہ درست ہے"؟

زیاد نے جھوٹ بولنے کی کوشش کی مگر الفاظ اُس کے حلق میں اٹک گئے +

افنا تان گرج کر بولا:۔
"تم پرلے درجے کے لعنتی ہو۔ ایک دم یہاں سے دُور ہو جاؤ۔ یہ جگہ تم ایسوں کے سے نہیں ہے"
زیاد نے ایک جھٹکا محسوس کیا۔ اُس نے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ وہ نہیں جانتا تھا۔ کہ اب اُسے کن حالات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ مگر آخر کار اس نے اپنی آنکھیں کھولیں۔ اور آپ کیا خیال کرتے ہیں۔ کہ وہ کہاں تھا؟

وہ ایک عجیب وغریب اور عالی شان شہر میں تھا۔ جس کے در و دیوار بالکل سفید سنگِ مرمر۔ اور سڑکیں خالص سونے کی بنی ہوئی تھیں۔ ہر جگہ حسین فرشتے سفید لباس پہنے اپنے سفید براق پروں کو پھیلائے ادھر اُدھر آزادی سے اُڑتے پھرتے تھے۔ دلکش اور سُریلے راگ کی آوازیں پیہم آرہی تھیں۔

وہ حیرت زدہ ہوکر کھڑا تھا۔ اور اُس کی سمجھ میں نہ آتا تھا۔ کہ وہ کہاں ہے اور اُسے کیا کرنا چاہیئے۔ کہ اتنے میں ایک نہایت ہی حسین فرشتہ اُس کے پاس آیا۔ اور اُس نے ایک زمردی تاج سر پر پہننے اور ایک سُنہری طاؤس بجانے کے لئے زیاد کے سامنے پیش کیا۔ اور کہا:۔
"مشفقِ من زیاد آپ کا فردوس میں آنا مبارک ہو"
زیاد نے اب پہچانا۔ کہ یہ فرشتہ وہی لڑکی ہے جسے اُس نے جہاز سے کود کر بچایا تھا۔ وہ غم وغصہ میں دیوانہ ہو رہا تھا۔ اُس نے دونوں چیزیں زمین پر پھینک دیں۔ اور حقارت آمیز لہجے میں بول اُٹھا:۔
"لے جاؤ۔ مجھے ان کی کوئی ضرورت نہیں۔ اگر تمہارا معاملہ حائل نہ ہوتا۔ تو میں کب کا افناتان کی محفل میں شراب وکباب کے شغل میں مشغول نظر آتا"
زیاد کی زبان سے ان الفاظ کا نکلنا ہی تھا۔ کہ ایک مہیب آواز آئی:۔
"اگر جنت تمہیں پسند نہیں تو جہنم میں جا سکتے ہو"
اور بیچارہ زیاد اُس جگہ بھیج دیا گیا۔ جہاں نہ تو حسین فرشتے۔ نہ زمرّدی تاج اور سُنہری طاؤس ہوتے ہیں اور نہ ہی شراب وکباب کی محفلیں۔

بدرالدّین

مدنیّات

چند اصول کی توضیح

(آخری قسط)

(از پرنسپل عبداللہ یوسف علی سی بی ای۔ ایل ایل ایم کنٹب)

(ترجمہ از جناب محمد دین صاحب تاثیر ایم اے)

شہریت کی روح تین اجزا سے ترکیب پاتی ہے۔ پہلی ضرورت ایک اجتماعی ارادے کی ہے۔ یعنی مفادِ عام کے لئے ہم میں ایک ایسا گروہ ہونا چاہیے۔ جو اکثریت کا فائدہ طلب کرے۔ اور بوقتِ ضرورت ذاتی اغراض یا محدود منافع کو جماعتی مفاد پر قربان کر دے۔ یہ چیز نہایت اہم ہے اور چاہیئے کہ جزوِ جبلت بن جائے۔ بلند فطرت لوگوں میں یہ جذبہ مدافعت کے جذبے سے بھی زیادہ قوی ہوتا ہے۔ اور یہ ہے بھی ایک فطرتی جذبہ جو پدری، مادری، نکاحی اور جماعتی جذبات ہی کے سلسلے میں منسلک ہے۔ بلکہ ان بنیادی جذبات کا ایک ارتقائی ارتفاع ہے۔ حقیقت میں اس جذبے کی اصل ارتقائے نفس اور عرفان نفس کے جذبے ہیں۔ جماعتی زندگی میں فرد کو محض دُون اور کم سواد قسم کی خود غرضی کو قربان کرنا پڑتا ہے۔ اور یہ قربانی خود اُس کے نفس کے ارتقا میں مددگار ہوتی ہے۔ اور اس کی افرادی زندگی کو زیادہ مکمل اور حسین بناتی ہے۔ اور خود اس کی شخصیت کا منظر وسیع تر ہو جاتا ہے +

یہ جماعتی ارادہ شہریت کا اساسِ اولیں ہے۔ لیکن بعض دفعہ لوگ جماعتی معیار کو اس اخلاقی سطح سے پست تر کر دیتے ہیں جس کو وہ خود ہی انفرادی اعمال کے لئے قائم کرتے ہیں اس کے روکنے کے لئے ہمیں "جماعتی ضمیر" کو نمو پذیر کرنا چاہیئے۔ ہمیں جیسا کہ بنا چاہیئے۔ کہ یہ نظریہ کہ "سلطنت" اخلاقیات کی حد بندیوں سے آزاد ہے سراسر غلط ہے۔ تاریخ اس رائے کا وقیع ترین ابطال ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی طاقتور سلطنت اپنی رعایا یا دوسری سلطنتوں کے حقوق کا اتلاف کر سکے اور اُسے کچھ عرصے کے لئے اس فعل کی سزا نہ ملے مگر بالآخر وہ اپنے اعمال کی مکافات تک پہنچ کر رہے گی۔ کیا عہد حاضرہ کی تاریخ سے اس کا ثبوت نہیں ملتا؟ یورپ کا جنگ کیا تھا؟ مگر ایک خوفناک حزینہ ڈرامہ جس کی بنا ہی نظریہ تھا

کہ سلطنت کبھی غلطی نہیں کرتی! اس چہار سالہ بربریت نے ضرب المثل تلوار کے کھیت کو سماج کے قلب و جگر
نوجوانوں کے خون سے اس طرح سرسبز کیا کہ گویا اب اس پر خزاں آنے ہی کی نہیں۔ مگر ان ہی چار سال
میں نسلِ انسانی کے پاکیزہ ترین کارنامے بھی ظہور پذیر ہوئے۔ غرور سے افراد کی طرح سلطنت کا سر
بھی نیچا ہوجاتا ہے۔ ہاں فرق اس قدر ہے۔ کہ سلطنت کی سرنگونی کے اثرات بہت زیادہ عمیق ہوتے
ہیں مجھے اس سے دینیات اسلامی کی ایک نہایت وقیع ترین تمثیل یاد آئی ہے۔ خدا کے مقرب ملائکہ میں
احسن ترین تقویم ابلیس کی تھی۔ خدا نے اسے ہر عطیے سے سرفراز کیا مگر اس کے غرور اور اس کی بے یقینی
نے اسے اسفل السافلین کر دیا۔ اسی طرح سلطنت کسی قدر بھی طاقتور اور خوش انتظام ہو۔ اگر وہ خود
اعتمادی کی فراوانی یا غرور سے دوسروں کو حقیر سمجھنے کی وجہ سے اخلاقِ حسنہ کی حدود سے متجاوز ہو جائے
تو پھر قضا و قدر کے عمال اپنے آہنی ہاتھوں سے اس کی گردن مروڑ دیتے ہیں اور اس کے کھوئے ہوئے
ہوش و حواس قائم کر دیتے ہیں + اس کی سربلندی انکسار میں بدل جاتی ہے اور اس کا نشۂ کامرانی خمار کی
نزع کی سی کیفیتوں میں انجام پذیر ہوتا ہے۔ دوسری طرف جو سلطنت اپنا طریقۂ عمل نفسیاتِ انسانی کے
ادراک پر استوار کرتی ہے وہ کامیاب ہوکر رہتی ہے۔ سلطنت کے اندرونی حالات پر بھی یہی اصول عملدرآمد
کرتے ہیں۔ مدنیات اور اخلاقیات دونوں میں اچھے اعمال اور اچھے اطوار کارفرما ہوتے ہیں اور جب
ان کا جوڑ شہری خصائل سے ہو تو پھر ان سے دلپذیر اور خوشنما اور کوئی شے نہیں +

جماعتی ارادے اور جماعتی ضمیر کے بعد تیسرا جزو تعاونِ کار ہے۔ یہ مدنیات کا عملی حصّہ ہے۔
تعاونِ کار کا مادّہ ہم سب میں موجود ہے۔ لیکن ذاتی اور برادری کے اغراض اس کو دبائے رہتے ہیں۔
شہریت کی حقیقی روح ہم کو ان حاسدانہ جذبات سے بالاتر کر دیتی ہے۔ اور ہم جماعتی ارادے اور جماعتی
ضمیر کے بنائے ہوئے راستے پر چلنے لگتے ہیں۔ اور اس طرح نہ صرف انفرادی افعال میں بلکہ ہمیں
شہری اعمال و تواریخ میں ایک خاص غرور اور ذمہ داری کا احساس ہونے لگتا ہے۔ اور آج کل تو ترقی یافتہ
سلطنتوں نے عورتوں کو بھی رائے دہندگی کا حق دے دیا ہے۔ اب مرد و زن میں سماجی خدمت
کرنے کا ایک نیا شوق پیدا ہوگیا اور ہر طرف متعدد سماجی مواقع نکل آئے ہیں۔ جن میں ہر کوئی کام
کرسکتا ہے۔ اور تو اَور بچوں کے حقوق بھی تسلیم کر لئے گئے ہیں۔ اور یہ حقوق خاندانوں ہی میں نہیں
بلکہ سلطنت میں بھی شامل کر لئے گئے ہیں۔ اب ہمیں خود بچوں کو اس نئی روحِ مدنیت کا محافظ متصور

کرنا چاہیئے۔ اور ہر کہ ومہ مرد و زن پیر و جوان کو اس کا حصّہ دار سمجھنا چاہیئے +

اسی باعث مدنیات تعلیم کے ابتدائی مدارج میں بھی اہم ہے۔ جیسے پہلے کہہ چکا ہوں۔ مدنیات محض ایک ذہنی علوم کی شاخ نہیں۔ مدنیات کی ترویج و تربیت کے لئے ایک خاص روح ایک خاص قانون درکار ہے۔ اور یہ کام ابتدائی مدارس ہی میں شروع ہو جانا چاہیئے۔ کھیل کود اور تعلیم میں ان کی مختلف جماعتیں ہوں گی۔ ان کے دل میں یہ خیال ابتدا ہی سے جاگزیں ہو جانا چاہیئے۔ کہ یہ تمام جماعتیں الگ الگ اور باہم مل کر اس طرح کام کریں کہ ان کے سکول کا نام روشن ہو۔ اور یہ سکول سلطنت کا ایک آئینہ ہوگا۔ سکول کی شہرت کا خیال اور اس کے نام کا احترام ان میں ایک ایسی روح پھونک دے گا جو انہیں بڑے ہو کر مدنیاتی طریق کار پر چلائے گی۔ اور اس طرح ہماری سلطنت محض اتفاقی امور کا مجموعہ نہ ہوگی۔ بلکہ تعبیر ہوگی ہماری ان خوابوں کی جو ہم حرّیت، جماعتی ذمہ داری، جماعتی غرور اور صحیح طرز عمل کے متعلق ہر وقت دیکھتے رہتے ہیں +

بادۂ کہن

نہ دردِ محبّت نہ جوشِ جوانی — یہ جنّت ہے! تو ہائے دُنیائے فانی!!

تو پھر آ گئی گردشِ آسمانی — بڑی مہربانی! بڑی مہربانی!

سُناتا ہے کیا حیرت انگیز قصّے — حسینوں میں کھوئی ہو جس نے جوانی

نظر اَور ذوقِ نظر دینے والے — عجب شئے بنا دی ہے دُنیائے فانی

نصیحت سے روکا بہت ناصحوں کو — کسی نے ہماری نصیحت نہ مانی

تسلّی دئیے جاؤ ناداں دل کو

کئے جاؤ باتیں زبانی زبانی

(از "فردوس") — حفیظ جالندھری

شکستہ پر

(۱)

موسمِ بہار میں ایک مادہ بٹیر جو افریقہ سے آئی تھی۔ تکان سے نیم مُردہ ہو کر اور پرواز چھوڑ کر ایک گھنی جھاڑی کے پاس سرسبز کھیت میں اُتری۔ کچھ دن آرام کرنے کے بعد اُس نے شاخیں چنتے اور تنکے اکٹھے کر کے مٹّی کے ایک تودے پر اپنے لئے ایک گھونسلا بنایا۔ تاکہ وہ بارش سے محفوظ رہ سکے پھر سات یوم تک وہ متواتر ایک انڈا روز دیتی رہی۔ یہ انڈے بہت چھوٹے اور نازک تھے، اُس نے اُن پر بیٹھ کر اُنہیں سینا شروع کیا +

کیا آپ نے کبھی مرغی کو انڈوں پر بیٹھے دیکھا ہے؟ بالکل اُسی طرح بٹیر بیٹھی رہی، بارش ہوئی، آندھی چلی، لیکن وہ اپنی جگہ سے بالکل نہ ہلی۔ اور ایک قطرہ بھی انڈوں تک نہ پہنچ سکا۔ تین ہفتوں کے بعد اُن میں سے سات خوب صورت ننھے بچّے نکلے۔ جو چڑیا کے بچوں کی مانند بالکل ننگ دھڑنگ نہیں بلکہ ایک زرد سے روئیں میں لپٹے ہوئے چھوٹے چھوٹے سات ریشمی گیندوں سے مشابہ تھے۔ انھوں نے انڈوں سے نکلتے ہی دانے دُنکے کی تلاش شروع کر دی، بعض دفعہ بٹیر اُن کے لئے ایک چیونٹی یا ٹڈا پکڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیتی۔ اور وہ اپنی ننھی ننھی چونچوں سے فوراً ہڑپ کر جاتے +

وہ بہت خوب صورت، چالاک اور فرمانبردار تھے۔ ہمیشہ اپنی والدہ کے قریب رہتے۔ اور جب وہ اُنہیں "پٹ پٹ" کہہ کر پکارتی وہ تیزی سے دوڑ کر اُس کے پاس پہنچ جاتے + ایک دن بیساکھ کے مہینے میں جب کسان کھیت کاٹنے آئے تو بڑا بچہ اپنی والدہ کی آواز پر جلدی واپس نہ آسکا اور ایک لڑکے نے دوڑ کر اُسے پکڑ لیا۔ آہ اُس خوف و ہراس کو صرف وہی بیان کر سکتا تھا۔ جو اُس نے لڑکے کی مٹھی میں محسوس کیا۔ اُس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ خوش قسمتی سے ایک بوڑھے کسان نے اُس لڑکے کی منّت کی اور کہا۔ "ابراہیم، اسے چھوڑ دو، بچّہ ہے۔ بیچارہ مشکل سے چل پھر سکتا ہے" +

اس مصیبت سے نجات پا کر وہ دوڑ کر اپنی ماں کے پاس گیا اور اُسے سارا قصّہ سُنایا۔ وہ

کہنے لگی :" دیکھا میری بات نہ ماننے کا نتیجہ ؟ جب تم بڑے ہو جاؤ۔ تو جو تمہارے جی میں آئے کرنا، لیکن جب تک تم چھوٹے ہو۔ تمہیں میری ہر بات ماننی چاہیئے۔ نہیں تو کسی مصیبت میں پھنس جاؤ گے "۔

اسی طرح وہ خوشی اور اطمینان کی زندگی بسر کرنے لگے۔ کھیت کی کٹائی اور گیہوں کے انبار سے بے شمار دانے زمین پر پھیل گئے۔ جن سے اُنہیں کافی خوراک مِل گئی۔ کھیت کے قریب پانی نہ تھا۔ لیکن اُنہیں پیاس کی تکلیف نہ ہوتی تھی۔ وہ گھاس پر سے شبنم کے قطرے پی کر گزارا کر لیتے تھے۔ دن کو جب گرمی زیادہ ہوتی وہ جھاڑی کے سائے میں چلے جاتے اور شام کو پھر کھیت میں واپس آجاتے۔ سرد راتوں میں وہ بٹیر کے پروں کے نیچے سمٹ کر بیٹھ جاتے۔ اب اُن کے پروں کا رُواں بتدریج پروں میں تبدیل ہوگیا۔ اور اُنہوں نے اپنی ماں کی مدد سے اُڑنا شروع کیا۔ اُڑنے کا سبق صبح طلوع آفتاب سے قبل شروع ہوتا۔ کیونکہ دن کو چیلوں کا سخت خطرہ تھا۔ جو کھیت پر منڈلاتی رہتی تھیں۔ ایک دن بٹیر نے اُن سے کہا :" کیا تم تیار ہو ؟

اُنہوں نے جواب دیا :" ہاں "۔

" ایک، دو، تین "۔

جوں ہی اُس نے تین کہا پھُر پھُر پھُر سب اُڑنے لگے ! اور تھوڑی دُور جاکر واپس آ گئے۔ اُن کی والدہ نے اُنہیں بتایا۔ کہ تم یہ سب کچھ ایک لمبے سفر کے لئے سیکھ رہے ہو۔ جو تمہیں موسمِ گرما کے اختتام پر کرنا ہے۔ وہ کہنے لگی :" ہم کئی دنوں تک زمین سے بہت اونچا اُڑینگے۔ اور اپنے نیچے بڑے بڑے شہر، جنگل اور دریا دیکھیں گے "۔

(۲)

بیساکھ کے اختتام پر۔ سہ پہر کے وقت جب وہ اپنی ماں کے قریب ہی کھیل میں مشغول تھے۔ ایک گاڑی کھیت کے پاس ٹھیری۔ اُنہوں نے اپنی سیاہ آنکھیں اُٹھا کر دیکھا۔ اُنہیں ایک آواز سُنائی دی جو کہہ رہی تھی :" ٹیپو ! ٹیپو "!

بچے اس کا مطلب بالکل نہ سمجھے۔ لیکن اُن کی والدہ جانتی تھی۔ کہ یہ کوئی شکاری ہے جو اپنے کُتے کو بلا رہا ہے۔ وہ خوف سے بُت بن کر کھڑی ہوگئی۔ جھاڑی اُن کی جائے پناہ تھی۔ لیکن عین اُسی سمت سے شکاری آرہا تھا۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد اُس نے کہا :" تم سب زمین کے ساتھ لگ جاؤ

میں اُڑتی ہوں تم بالکل نہ ہلنا، نہیں مارے جاؤ گے۔ سمجھے؟"

بچوں نے آنکھیں میچی ہیں۔ گویا سمجھ گئے ہیں۔ اور چُپ چاپ بیٹھ گئے۔ وہ کُتے کی آواز کو بخوبی سُن سکتے تھے۔ جو کھیت میں اِدھر اُدھر پھر رہا تھا۔ وقتاً فوقتاً شکاری پکارتا تھا۔ "کہاں ہو؟ ٹیپو! ٹیپو!" آواز بالکل نزدیک آگئی۔ کُتے نے اُنہیں دیکھ لیا اور وہیں ٹھہر گیا۔ اُس کی آنکھیں اُن پر جمی تھیں۔

"مت ہلو" بٹیر نے کہا اور خود تیزی سے آگے دوڑی۔"

کُتے نے آہستہ سے اُس کا تعاقب شروع کیا۔ شکاری جلدی جلدی چلنے لگا۔ اُس کی ٹانگیں اس قدر نزدیک تھیں کہ بچے اُس کے بوٹ پر ایک چیونٹی کو رینگتے دیکھ سکتے تھے۔ اُن کے دل تیزی سے دھڑکنے لگے۔ چند لمحوں کے بعد بٹیر اُٹھی اور کُتے کے آگے زمین کے ساتھ اُڑنے لگی۔ اُس نے پیچھے بھاگنا شروع کیا۔ شکاری بھی پیچھے ہی تھا۔ لیکن وہ کُتے کے زخمی ہونے کے خوف سے بندوق نہ چلا سکتا تھا۔ بٹیر نے بڑی ہوشیاری سے اپنے تئیں زخمی ظاہر کیا۔ اور کُتے نے اُسے پکڑنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ لیکن جب اُسے یقین ہو گیا۔ کہ میں بندوق کی زد سے باہر ہوں وہ تیزی سے اُڑ کر جھاڑی میں چھپ گئی۔

اس اثنا میں بڑا بچہ اپنے دوسرے بھائیوں کی مانند بے حس و حرکت رہنے کی بجائے اُڑا شکاری نے اُس کی آواز سُن لی۔ اور مُڑ کر بندوق چلا دی۔ وہ ذرا دُور تھا۔ صرف ایک چھرہ اُس کے پروں میں لگا۔ وہ گرا نہیں بلکہ کوشش کر کے جھاڑی تک پہنچ گیا۔ لیکن اُس کے پروں کی حرکت سے اُس کا بازو ٹوٹ گیا۔ اور وہ شکستہ پر ہو کر گر پڑا۔

شکاری نے یہ دیکھ کر کہ جھاڑی بہت گھنی ہے اور دوسرے یہ کہ ایک چھوٹا سا بچہ ہے اُسے تلاش کرنا مناسب نہ سمجھا۔ اُدھر دوسرے بچے اپنی جگہ سے بالکل نہ ہلے۔ بلکہ خاموشی سے انتظار کرتے رہے۔ کبھی کبھی اُنہیں بندوق کی آواز آتی تھی۔ اب شام ہو گئی تھی اور جھینگروں کی آواز کے سوا کچھ سنائی نہ دیتا تھا۔ لیکن جب رات ہوئی اور چاند نکلا۔ تو اُنہوں نے اپنی ماں کی آواز سُنی جو کھیت کے اُس سرے سے اُنہیں بلا رہی تھی۔ "پٹ پٹ! پٹ پلیک!" وہ تیزی سے اُس کی طرف اُڑے۔ اُس نے اُنہیں شمار کیا۔ ایک غائب تھا۔ اُس نے پوچھا "بڑا کہاں ہے؟"

"ہمیں معلوم نہیں ـــ وہ اُڑ گیا تھا۔"

بیچاری بٹیر نے زور زور سے پکارا۔ ایک کمزور آواز جھاڑی میں سے آئی "پیسو! پیسو!" جب اُس نے اُسے تلاش کرکے اُس کا شکستہ پر دیکھا۔ تو اُس کے دل پر ایک کاری ضرب لگی اور اُسے معلوم ہوگیا۔ کہ اس کی قسمت میں کیا لکھا ہے اور اس کا مستقبل کیا ہے۔ لیکن اُس نے اپنا غم ظاہر نہ کیا تاکہ وہ بددل نہ ہوجائے +

اب اس غریب بچے کی زندگی سخت اجیرن ہوگئی وہ بڑی مشکل سے حرکت کرسکتا تھا۔ وہ اپنے بھائیوں کو اُڑنے کی تعلیم لیتے دیکھتا۔ تو اُس کی آنکھوں میں آنسو بھر آتے۔ رات کے وقت جب دوسرے بچے اپنی والدہ کے گرم پروں کے نیچے محو خواب ہوتے وہ بیقراری سے پوچھتا "اماں کیا میں اچھا ہوجاؤں گا؟ یا نہیں ؟"

وہ اپنے آنسو ضبط کرکے جواب دیتی "ہاں۔ ہوجاؤ گے ؟"

موسم گرما ختم ہوگیا۔ کسان ہل لے کر کھیت میں آگئے۔ بٹیر اور اس کے بچے قریب ہی مکی کے کھیت میں چلے گئے۔ چند عرصہ بعد کسان مکی کاٹنے آگئے۔ اب بٹیر اور اس کے بچے لمبی لمبی گھاس میں آگئے +

لمبے اور خوشگوار دن چھوٹے اور اُداس دنوں میں تبدیل ہوگئے۔ اور جھاڑی کے پتے بھی زرد ہونے لگے۔ شام کو ابابیل اُڑتے دکھائی دیتے۔ بعض دفعہ پرندوں کے گروہ گزرتے دکھائی دیتے۔ اور سرد راتوں کے سکوت میں سارسوں کے چیخنے کی آواز آتی۔ یہ سب کے سب ایک ہی سمت جنوب کی طرف دیس چھوڑ پردیس جارہے تھے +

غریب بٹیر کے دل کی عجیب حالت ہوگئی۔ اپنے بچے کے شکستہ پر کا خیال کرکے اُس کی آنکھیں پُرنم ہوجاتیں اور وہ غم سے نڈھال ہوجاتی۔ وہ بڑی خوش قسمت ہوتی اگر وہ اپنے تئیں دو ٹکڑے کرسکتی۔ تاکہ اُس کا آدھا جسم اُن مضبوط اور توانا بچوں کے ساتھ جاتا جو سردی سے تکلیف میں مبتلا تھے۔ اور آدھا جسم اُس زخمی بچے کے ساتھ رہتا۔ جو اُسے اتنا پیارا تھا +

بڑے سوچ بچار کے بعد ایک دن بٹیر نے اپنے دل سے فیصلہ کرلیا۔ کہ سب بچوں کی موت سے یہ بہتر ہے۔ کہ ایک بچہ مرجائے۔ اور پیچھے مُڑکر دیکھے بغیر، تاکہ اُس کا استقلال جواب نہ دے جائے۔ وہ تندرست بچوں کو ساتھ لے کر اُڑ گئی۔ زخمی بچہ رو کر کہنے لگا "امی مجھے نہ چھوڑو! امی مجھے اکیلا نہ چھوڑو!"

اُس نے اُن کے پیچھے اُڑنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ ناکام رہا۔ اور اُسی جگہ بیٹھا آنسو بھری آنکھوں سے

اُن کا تعاقب کرتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ اُفق پر اُس کی نظروں سے غائب ہو گئے +

تین دن بعد تمام خطے میں سردی کا دور دورہ ہو گیا سخت برف باری ہوئی۔ سرد ہوائیں چلنے لگیں جس سے سردی اَور بھی ناقابلِ برداشت ہو گئی +

(۳)

جھاڑی کے قریب وہ شکستہ پر بچہ، سردی سے اکڑا ہوا پڑا تھا۔ غم نصیب بڑی تکلیف میں نیم غشی کی حالت میں مبتلا تھا۔ اُس کے دماغ میں گذشتہ ایام کی یاد بجلی کی مانند کوند رہی تھی ۔۔ کھیت، اشتکاری کا بوٹ، اُس پر رینگتی ہوئی چیونٹی اپنے بھائیوں کے ساتھ کھیلنا اور اپنی والدہ کے گرم پر۔ یکے بعد دیگرے اُس کے سامنے آ گئے۔ اور وہ درد و کرب سے تڑپنے اور زمین پر لوٹنے لگا۔ اور اپنے دونوں پنجوں کو جوڑ کر لیٹ گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ ہاتھ جوڑ کر دعا میں مشغول ہے +

(ماخوذ) (سراج الدین احمد نظامی)

اشتہار

تجارت کو فروغ دینے کا بہترین ذریعہ ہے۔ اور مخزن اشتہار دینے کا بہترین ذریعہ۔

آپ مخزن میں اشتہار دیکر اپنی تجارت کو فروغ دیں +

نرخ اشتہارات

تفصیل	ایک ماہ کے لئے	تین ماہ کے لئے	چھ ماہ کے لئے	سال بھر کے لئے
عام اشتہارات میں				
پورا صفحہ	سات روپے ۷	بیس روپے ۲۰	اڑتیس روپے ۳۸	بہتر روپے ۷۲
نصف صفحہ	چار روپے ۴	گیارہ روپے ۱۱	اکیس روپے ۲۱	چالیس روپے ۴۰
چوتھائی صفحہ	دو روپے ۲	چھ روپے ۶	گیارہ روپے ۱۱	اکیس روپے ۲۱

تفصیل	ایک ماہ کے لئے	تین ماہ کے لئے	چھ ماہ کے لئے	سال بھر کے لئے
ریڈنگ میٹر میں				
پورا صفحہ	دس روپے ۱۰	اٹھائیس روپے ۲۸	چون روپے ۵۴	سو روپے ۱۰۰
نصف صفحہ	پانچ روپے ۵	چودہ روپے ۱۴	اٹھائیس روپے ۲۸	باون روپے ۵۲
چوتھائی صفحہ	تین روپے ۳	آٹھ روپے ۸	سولہ روپے ۱۶	تیس روپے ۳۰
ٹائیٹل	بارہ روپے	تینتیس روپے ۳۳	چونسٹھ روپے	ایک سو بیس روپے ۱۲۰

خط و کتابت و ترسیل زر بنام منیجر رسالہ مخزن بھاٹی دروازہ لاہور ہونی چاہیئے +

ٹائیٹل پر ایک صفحے سے کم کا اشتہار نہیں لیا جاتا +

جواہرات

نیلگوں آسمان پر سفید سفید بادل تیر رہے تھے۔ آمدِ سحر کی خبر پا کر چاند کا رنگ فق ہو گیا۔ اور اُس نے بادل کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے کے پیچھے اپنا مُنہ چھپا لیا +

مرمریں محل کی ایک کھڑکی کے پاس جس کے نیچے روپہلی ندی گنگناتی ہوئی بہتی چلی جا رہی تھی ایک نوعروس صبح کی پُر تبسم فضا میں بُت بنی کھڑی تھی +

بُلبُلیں قفس کے گوشے میں آرام کر رہی تھیں۔ محل کے دروازے کے سامنے شکارے نسیم سحر کی پیدا کی ہوئی ہلکی ہلکی موجوں کے بہاؤ میں لڑکھڑاتے ہوئے جا رہے تھے + دُلہن کے پیچھے ایک پلنگ پر لباسِ نوعروسی پڑا تھا۔ ایک زمرد کی ترشی ہوئی صندوقچی پر زیورات پریشان تھے +

دُلہن اپنے ہاتھوں میں جواہرات کا ایک ہار لئے ہوئے تھی۔ کمرے کی تاریک فضا میں اس ہار کے دانے اس طرح دمک رہے تھے جیسے کسی مقدس بزرگ کے پُر نور چہرے کے گرد روشن حلقہ بنا ہُوا ہو۔ اُس نے اپنی نازک گردن میں اس ہار کو پہنا اور پھر اُتار دیا۔ اور ندی میں طلوعِ آفتاب کا نظارا کرنے کے لئے دریچے میں سے جھانکنے لگی۔ ندی میں سے سورج کا لرزتا ہُوا عکس اُس کے سُنہری بالوں کو الگ الگ کر کے منوّر کر رہا تھا +

دُلہن اس قدر مسرور تھی کہ اُس کے ذہن میں کسی ایک خیال کی گنجائش نہ تھی۔ اور دُھندلی فضا میں ندی کے اُس پار جھلملاتی ہوئی بستی کا خوب صورت نظّارہ اُس کی مستور مسرتوں کا ایک پرتو تھا +

جب سورج نے دُور اُفق پر درختوں کے جھنڈ سے سر نکالا سپید ہار کے دانے اور بھی جگمگانے لگے +

ایک سُبک رفتار شکارہ بادل کے سائے کی مانند محل کے اُس طرف نمودار ہُوا +

دُلہن کی نگاہ اُس پر پڑی شکارے کے اندر کافوری کفن میں لپٹا ہُوا ایک جنازہ رکھا تھا۔ اور اُس کے سرہانے ایک عورت بنفشئی لباس پہنے رو رہی تھی۔ کفن پر کچھ زرد رنگ کے پھول پڑے تھے +

اس دردناک منظر نے دُلہن کے نازک دل پر اس قدر اثر کیا۔ کہ اُس کا تمام جسم کانپ اُٹھا۔ اور اُس کے ہاتھوں سے زمرد کی مالا گر کر شکارے میں بیٹھی ہوئی غمگین عورت کی گود میں جا پڑی۔ شکارہ تھوڑی دیر میں سورج کی شعاعوں میں غائب ہو گیا +

دُلہن کو ہار کے کھو جانے کی کوئی خبر نہ تھی۔ غمزدہ ماں اور جنازے نے اس کی منتظر خوابوں کو آوارہ کر دیا تھا +

اُس نے محسوس کیا کہ قسمت کا مہیب ہاتھ اُس کی راحتوں اور اُمیدوں کو چھیننے کے لئے رات کی سیاہی کی طرح آہستہ آہستہ اُس کی طرف بڑھتا چلا آ رہا ہے۔ وہ معمورۂ عالم میں تن تنہا رنج اور دہشت سے کانپ رہی تھی۔ اور سورج کی کرنیں جو کہ تھوڑی دیر پہلے جواہرات کو منور کر رہی تھیں۔ اُس کے آنسوؤں میں چمکنے لگیں +

دوسری عورت نے ہار کو اپنی گود میں گرتے ہی دبوچ لیا۔ اور جب اُس نے ایسے انمول جواہرات کو اپنے قبضے میں پایا۔ جن کا ثانی اُسے تمام عمر نصیب نہ ہوا تھا۔ اُس کے پُر درد آنسوؤں میں ایک مسکراہٹ نمودار ہو گئی۔ اُس نے ملّاح کی نظر بچا کر بچے کے کفن کی طرح سپید ہار کو اپنے بنفشئی لباس میں چھپا لیا۔ اور اس نعمتِ غیر مترقبہ نے اس کے دل سے سب رنج و غم مٹا دیا +

بدرالدین

مختصر تبصرہ

غزال ۔ ایک پاکباز ترک دہقانی لڑکی کی داستان ہے۔ جس نے اپنی پاکبازی اور استقلال سے تمام مصائب پر فتح پائی۔ اور نہایت جرأت و ہمّت کے ساتھ اپنے منگیتر کو مشکلات سے نکال لائی۔ میاں اسلم صاحب ایسی کہانیاں لکھنے میں یدطولیٰ رکھتے ہیں۔ اندازِ بیان ایسا صاف سلجھا ہوا اور دلچسپ ہے۔ کہ واقعی کتاب ایک دفعہ شروع کرکے ختم کئے بغیر رکھنے کو جی نہیں چاہتا + ہمیں یقین ہے۔ کہ میاں صاحب کی دوسری تصانیف کی طرح یہ کتاب بھی بے حد مقبول ہوگی + عورتیں مرد بچے بوڑھے ہر طبقے کے لوگ اس کہانی سے لطف اُٹھا سکتے ہیں۔ زبان نہایت سلیس ہے۔ لکھائی چھپائی عمدہ کاغذ سفید ٹائٹل پختہ اور سادہ حجم ۱۰۰ صفحہ تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ ۔ نسیم بک ڈپو بازار بارود خانہ سے طلب کیجئے + قیمت صرف ۱۰

چار سہیلیاں ۔ یہ کتاب میاں ایم اسلم صاحب نے حال ہی میں تصنیف کی ہے۔ اس میں سانپوں کا بادشاہ کالی پہاڑی ۔ گل لالہ ۔ طلسماتی صراحی ۔ چار پُرلطف کہانیاں ہیں۔ اصل میں یہ کہانیاں میاں صاحب نے اپنی پیاری بیٹی اصغری کو سنانے کے لئے تصنیف کی ہیں۔ اور وہ انہیں نہایت شوق سے سنا کرتی تھی "اصغری" قضائے الٰہی سے انتقال کر گئی۔ میاں صاحب نے یہ کتاب معصومہ کی یادگار کے طور پر نہایت اہتمام سے شائع کی ہے۔ اس میں تین چار سہ رنگی اور دو رنگی تصویریں ہیں۔ جو بہت خوبصورت ہیں۔ صاف اور سلیس نظمیں بھی ہیں۔ میاں صاحب کی نظم اپنی مرحوم بچی کے متعلق اور راقم الحروف کی نظم "ننھی اصغری" بھی شاملِ کتاب ہیں۔ یہ کتاب بچوں اور عورتوں میں بے انتہا پسند کی جائے گی۔ کاغذ لکھائی چھپائی بہت ہی عمدہ۔ قیمت عہ نسیم بک ڈپو بارود خانہ لاہور سے طلب کیجئے +

رقعات عالمگیری

شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کے اُن فارسی خطوط کا اُردو ترجمہ جو شہنشاہ نے اپنے شاہزادوں اور دوسرے صوبے داروں اور سرداروں کے نام لکھے +

یہ کتاب ایم عبدالوحید خان متعلم اسلامیہ کالج لاہور نے ترجمہ کی۔ اور مولوی فیروزالدین اینڈ سنز نے شائع کی ہے ترجمہ صاف اور سلیس ہے۔ شہنشاہ عالمگیر کی ذہنیت کے متعلق جو غلط پروپاگنڈا پھیلایا جا چکا ہے۔ یہ کتاب اُس کے ازالے کے لئے بہت کارآمد ہے۔ عالمگیر کے اپنے خطوط ایک بے نظیر رواداری و تدبر کے شاہد عادل ہیں۔ ہم چاہتے ہیں یہ کتاب ہندوستان کے ہر اُردو خواں طبقے میں پڑھی جائے۔ تقطیع $\frac{20 \times 30}{16}$ حجم سوا دو سو صفحات کاغذ لکھائی بھی بہت اچھی۔ قیمت آٹھ آنے ۔ ۸ر

مولوی فیروزالدین اینڈ سنز بک ڈپو لاہور سے منگائیے

رسائل

نیرنگ خیال عید نمبر۔ ہمارے قلبی دوست حکیم محمد یوسف حسن صاحب کئی ماہ کی دوڑ دھوپ اور محنت کے بعد نیرنگ خیال کا ایک ایسا شاندار نمبر شائع کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ جسے دیکھ کر دُنیائے اُردو میں مسرت کی ایک لہر دوڑ رہی ہے +

۳۲ تصویریں۔ جن میں سے ۴ سہ رنگی ایک روپہلی ایک سنہری ہے۔ ان تصاویر میں ۴ تصویریں اُسی مصوّر کے موقلم سے تعلق رکھتی ہیں جو اس وقت اپنا ثانی نہیں رکھتا +

مضامین کی ندرت رسالے کے شایان شان ہے۔ مضامین نگاروں میں مولوی سید ممتاز علی صاحب اور خواجہ حسن نظامی جیسے بزرگ اور سید امتیاز علی تاج۔ جناب محمد دین تاثیر۔ جناب پریم چند۔ میاں ایم اسلم جیسے مشاہیر۔ علامہ اقبال کے علاوہ جناب سالک، جناب مہر، جناب فانی۔ پنڈت ہری چند اختر جیسے شعراء گراں پایہ شامل ہیں + ہم بلا خوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ ایسا خاص نمبر اُردو زبان میں آج تک شائع نہیں ہوا +

یہ مجموعہ جو رنگا رنگ کی دلچسپیوں سے معمور ہے۔ پورے ۲۵۸ صفحات پر ختم ہوا ہے۔ اس حجم میں صرف ۲۸ صفحہ اشتہارات اور ۹ صفحے فہرست وغیرہ کے ہیں +

کاغذ نہایت عمدہ، طباعت نورٌ علیٰ نور قیمت عمہ ر (دفتر نیرنگ خیال لاہور سے منگائیے)

پیشوا عید نمبر۔ ہمارے دوست سید عزیز حسن صاحب بقائی دہلوی نے پندرہ روزہ پیشوا کا عید نمبر بھی نہایت شان اور آب و تاب سے شائع کیا ہے +

مذہبی اخلاقی اور تاریخی مضامین نہایت خوبی سے لکھے اور ترتیب دئے گئے ہیں۔ چونکہ فضول زوائد سے پرہیز کیا گیا ہے اس لئے ضخامت ۵۰ صفحات سے زیادہ نہیں +

رسالے میں غازی محمد بن قاسم کی تصویر بھی ایک خاص شان رکھتی ہے۔ ہم جناب بقائی کو ایسا جامع عید نمبر نکالنے پر ہدیۂ مبارکباد پیش کرتے ہیں۔ پندرہ روزہ پیشوا کا سالانہ چندہ تین روپے ہے +

دفتر پیشوا کوچہ چیلاں دہلی سے طلب کیجئے +

رفیق۔ طالب علموں کے لئے یہ رسالہ سیالکوٹ سے حال ہی میں شائع ہوا ہے۔ مضامین اچھے ہیں۔ اس کے مدیر ہمارے دوست جناب غلام حیدر صاحب چشتی طالب علموں کی تعلیم و تربیت میں خاص مہارت رکھتے ہیں ہماری دعا ہے۔ کہ رفیق صحیح مضمون میں طالب علموں کا رفیق ثابت ہو۔ پہلے پرچہ کی ضخامت ۳۲ صفحے ہے تقطیع چھوٹی ۲۰×۳۰/۱۶ قیمت سالانہ عہ؍ دفتر رسالۂ رفیق سیالکوٹ سے طلب کیجئے +

آفتاب۔ یہ رسالہ جو ہمارے کرم فرما آغا شاعر قزلباش دہلوی کی ادارت میں جھالاواڑ سے نکلتا تھا اب لاہور سے شاعر صاحب کی نگرانی اور دیوان آتم انند صاحب شرر بی۔اے کی ادارت میں نکلنا شروع ہوا ہے۔ ہمارے خیال میں رسالے کی ادبی خوبیوں کے لئے جناب آغا شاعر اور دیوان آتم آنند کا نام نامی کافی سے زیادہ ضمانت ہے۔ تقطیع ۲۲×۳۰/۱۶ ضخامت ۴۸ صفحے کاغذ طباعت عمدہ ٹائیٹل ہلکا۔ چندہ سالانہ للعہ؍ روپے

آغا شاعر اینڈ سنز دفتر آفتاب داتا گنج بخش لاہور سے طلب کیجئے

اڈیٹر

تصحیح۔ گزشتہ ماہ حسن یوسف کا جو اشتہار شائع ہوا تھا۔ اُس میں کارخانے کا پتہ درج نہیں ہوا۔ ناظرین نوٹ کریں۔ کہ دفتر حسن یوسف رجسٹرڈ اندرون لوہاری دروازہ لاہور ہے +

تأثرات

(جناب محمد دین تاثیر ایم۔ اے)

جنت کا ہر اک ہے اشتیاقی ساقی　　لا۔ خم میں جو رہ گئی ہے باقی ساقی
تو بھی ہے شراب بھی ہے موجود　　جنت ہے یہی شراب و ساقی ساقی

تو دل بھی ہے دل کی آرزو بھی　　منزل بھی ہے گرمِ جستجو بھی
اے عقدہ کشائے رازِ ہستی!　　اس کل کا ہے ایک جزو تو بھی

لازم نہیں کرم کے لئے کیا ہو۔ کیا نہ ہو　　یہ راز جانتا نہیں۔ جو آشنا نہ ہو
کہتے ہو میرے ڈر سے گناہوں کو چھوڑ دو　　یہ تم اسے کہو جو تمہیں جانتا نہ ہو

صحرا مرا۔ دشت میرا۔ راغ میرا　　ہر چیز میں ہے سراغ میرا
میں خاک بسر ہوں در بدر ہوں　　عالی ہے مگر دماغ میرا

تین قسمیں

ایک طبعزاد افسانہ

(از گمنام)

میرے والد نے مجھے بلایا۔ اور کہا" بیٹا۔ کیا بلحاظ سن و سال اور کیا بلحاظ فہم و فراست تم اب جوان ہو۔ اب تمہاری حیات کے بیدار ہونے کا وقت آگیا ہے۔ میں چاہتا ہوں۔ کہ تم خرافات سے بچو"۔

میری آنکھیں جھک گئیں۔ اُنہوں نے سلسلۂ گفتگو جاری رکھتے ہوئے فرمایا" جوانی برسات کی طرح ہے۔ برسات میں حشرات الارض کو پر لگ جاتے ہیں۔ اور جوانی میں انسانوں کو۔ اس عمر میں لوگ بہت سی غلطیاں کرتے ہیں۔ لیکن ایک غلطی سب غلطیوں کی بیخ و بنیاد ہے۔ اس غلطی سے بنے ہوئے گھر بگڑتے ہیں۔ اطمینان قلب مفقود ہو جاتا ہے۔ مقاصدِ زندگی تہ و بالا ہو جاتے ہیں۔ اور انسان کی حالت اس پتے کی سی ہو جاتی ہے۔ جسے ہوا کا ہر جھونکا ادھر اُدھر لے جاتا ہے۔ یا اُس کاغذی کشتی کی طرح جسے بچے سطح آب پر چھوڑ دیتے ہیں۔ عام گفتگو میں اس مصیبتِ عظمےٰ کو عشق کہتے ہیں۔ اور میں چاہتا ہوں۔ کہ تم عشق سے بچو۔ اور یقین جانو کہ دُنیا کچھ بھی کہے اس بلا سے بچنا ایک اختیاری امر ہے۔ سو تم سچے دل سے میرے سامنے قسم کھاؤ۔ کہ تم اپنی زندگی میں کسی پر عاشق نہیں ہوگے"۔

میں خود بھی عشق کے متعلق بہت کچھ سُن چکا تھا۔ شعر و شاعری سے مجھے کچھ مس نہیں۔ لیکن شعر ہر ایک کی نگاہ سے گزرتے ہیں۔ اور مجھے شعرا کے کلام سے یہی معلوم ہُوا تھا۔ کہ عشق کرنے والے راتوں کو سو نہیں سکتے۔ کباب سیخ کی طرح ہر سو کروٹیں بدلتے ہیں۔ گریہ و زاری ان کا معمولی شغلہ ہے۔ غرضکہ اس قسم کی لئی باتیں پہلے ہی میرے دماغ میں تھیں۔ اس پہ والد صاحب کی تقریر۔ میں نے کمال درجے کے خلوص و انتہائی نیک نیتی سے قسم کھائی۔ کہ اپنی تمام عمر میں کبھی کسی پر عاشق نہیں ہوں گا۔

(۲)

میں اپنے تعلیمی اور تفریحی مشاغل میں انہماک سے حصہ لیتا رہا۔ کلب کی زندگی۔ ٹینس۔ بلیرڈ۔ برج۔ الغرض میری دلچسپی کے معمولی سلسلے جاری رہے۔ زندگی کے دن آرام سے گزرا کئے۔ یہاں تک

کہ موسم سرما گزشتہ صدیوں کا ایک جزو بن گیا اور بہار نے مستی اور رنگ کو ہر چہار طرف منتشر کر دیا +

ایک شب میں غنودگی کے عالم میں تھا۔ کہ یکایک میری آنکھوں کے سامنے مس لال کی تصویر کھچ گئی وہ غنودگی جاتی رہی اور میں ادھر ادھر کی باتیں سوچنے لگا "دو چار دن سے کھیل کا مزا نہیں آیا۔ کسی دن دریا پہ چلیں۔ اعجاز خوب ٹینس کھیلتا ہے"۔ غرضکہ اسی قسم کے بے ربط اور غیر مسلسل خیالات جو عام طور پر سونے سے پہلے دماغ میں آیا کرتے ہیں۔ میرے دماغ میں بھی آ رہے تھے۔ کہ ایک مرتبہ پھر مس لال کی صورت میری آنکھوں کے سامنے آ گئی +

اور جب مس لال کے تصور نے آمد و رفت میں افراط تفریط سے کام لیا۔ تو مجھے تعجب ہوا اور میں نے کہا۔ کہ اب مس لال کا خیال دماغ میں نہیں آنے دوں گا۔ لیکن سلسلہ بدستور جاری رہا +

معاً میرے دل میں یہ شبہ پیدا ہوا۔ کہ فتنہ پردازانِ قضا و قدر مجھے عشق کی دار پر لٹکانا چاہتے ہیں۔ میں گھبرا کے اُٹھا اور اپنے آپ کو تسلی دینے کے لئے میں نے دل ہی دل میں کہا "نہیں یہ ناممکن ہے۔ میں اپنی قسم نہیں توڑ سکتا۔ عاشق کی حالت اس پتے کی سی ہو جاتی ہے جو ہوا کے ہر جھونکے کے ساتھ اڑ جاتا ہے۔ عشق سے مقاصد زندگی تہ و بالا ہو جاتے ہیں۔ عشق نے اکثر قوموں کو کھا کے چھوڑا ہے۔ اس سے اجتناب لازمی ہے ——"

لیکن مس لال مسکراتی ہوئی اور ریکٹ کو اپنے مخصوص پیرائے میں ہلاتے ہوئے میرے سامنے آ کے کھڑی ہو گئی —— میں اپنے آپ پر جھنجلایا "آخر مس لال کا خیال بار بار کیوں آئے لیکن اس میں کچھ شک نہیں کہ یہ تصویر اچھی ہے" +

قصہ مختصر میں نے تھوڑی ہی دیر بعد اپنے آپ سے کہا "عاشق کی حالت ضرور سوکھے ہوئے پتے یا کاغذی کشتی کی سی ہو جاتی ہوگی۔ عشق سے مقاصد ضرور تہ و بالا ہو جاتے ہونگے۔ لیکن اس میں کچھ شک نہیں کہ مس لال کا تصور نہایت ہی پیاری شے ہے۔ اور اس کی خاطر مقاصد قربان ہو سکتے ہیں" +

اور اس کے بعد مختلف لباسوں میں۔ مختلف حالتوں میں ٹینس کھیلتے ہوئے۔ ہنس بانستے ہوئے مسکراتے ہوئے۔ کھیل جیت لینے کے بعد۔ کھیل ہار جانے کے بعد۔ غرضکہ میں مس لال کی نئی سے نئی ذہنی تصاویر کھینچتا رہا۔ یہاں تک کہ نیند نے مجھے اپنی آغوش میں لے لیا +

جب میں سو کے اُٹھا تو میں نے محسوس کیا۔ کہ وہ دُنیا جو کل شب تک میری تھی اب میری نہیں۔ آفتاب کی اوّلین کرنیں حسبِ معمول میرے کمرے میں کھیل رہی تھیں۔ لیکن آج اُن میں ایک نیا انداز ایک نیا رنگ تھا۔ گلدانوں میں وہی پھول رکھے تھے۔ جو گزشتہ شام مالی چھوڑ گیا تھا۔ لیکن ان کا تبسّم مختلف تھا۔ ہوا کے جھونکے آپس میں کچھ سرگوشیاں کر رہے تھے۔ اور اُس دن مجھے ایسا معلوم ہوا۔ کہ کارنس پر رکھے ہوئے وینس کے چھونے سے مرمریں بُت میں جان ہے +

میں کلب میں گیا۔ تو مس لال موجود تھی۔ مجھ پر کیا گزری اس کا ذکر فضول ہے۔ مختصراً یہ کافی ہے۔ کہ میں ٹینس بہت خراب کھیلا۔ برج میں تمام ربر ہارا۔ بلیرڈ میں آدھے گھنٹے کے عرصے میں چالیس سے زیادہ نمبر نہ بنا سکا ــــــ لیکن مس لال میرے ساتھ ایک خاص التفات سے پیش آئی۔ میں نے اس کی نگاہوں میں ہمدردی اور اس کی مسکراہٹ میں مہربانی دیکھی۔ اور بوجوہ مجھے یقین ہو گیا۔ کہ وہ میرے راز سے بخوبی واقف ہو چکی ہے۔ اس رات میں دیر تک یہ مصرع پڑھتا رہا۔ ع

عشق اوّل در دلِ معشوق پیدا می شود

یہ مفاہمت کا سلسلہ جاری رہا۔ میرے اس کے تعلقات ظاہراطور پر کچھ زیادہ گہرے نہ تھے۔ ہماری گفتگو سمیّات کی حد سے کبھی بھی متجاوز نہ ہوئی تھی۔ لیکن کون نہیں جانتا۔ کہ جذبات کی دُنیا میں ایک نگاہ ایک ہلکا سا تبسم گھنٹوں کی گفتگو سے زیادہ معنی خیز ہوتا ہے۔ معاملاتِ دل کی نزاکت گرانباریِ الفاظ کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ میں مطمئن رہا اور دو جہان سے بے نیاز +

لیکن آخر مجھے یقین ہو گیا۔ کہ خود مس لال کی تمنا ہے۔ کہ میں اپنا راز ظاہر کر دوں۔ یعنی یہ کہ اسے الفاظ کا جامہ پہنا دوں۔ کیونکہ حقیقت میں میرا راز اُس کے لئے کوئی راز نہ تھا۔ چنانچہ ایک دن میں نے دھڑکتے ہوئے دل سے لیکن جواب کے متعلق کامل یقین رکھتے ہوئے کہا۔

"مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے" +

جواب ملا "کہئے" +

"مس لال ــــــ عرض یہ ہے ــــــ میں کیسے کہوں ــــــ مطلب یہ ہے ــــــ شاید میں کبھی جرأت نہ کرتا اگر مجھے یقین نہ ہوتا۔ کہ آپ جانتی ہیں کہ میں ــــــ آپ کی محبت بھری نگاہیں ــــــ آپ کی مسکراہٹ ــــــ"

اس کے بعد جو کچھ ہوُا اس کے متعلق خاموش رہنا بہتر ہے۔ نتیجہ یہ ہوُا کہ وہ دُنیا جو شام تک میری تھی میری نہ رہی۔ ہر طرف ایک تاریکی سی چھاگئی۔ ہوا کے جھونکے مجھے کاٹنے لگے۔ اور میں نے اپنے کمرے کا دروازہ اس قدر زور سے کھولا۔ کہ کارنس پر رکھا ہوُا وینس کا خوبصورت مرمرین بُت دھماکے سے زمین پر گر پڑا +

اس رات میں اپنے آپ سے، اس دُنیا سے، اپنے خدا سے خفا رہا۔ میں شاکی تھا۔ کہ بنانے والے نے یہ دُنیا کیوں بنائی۔ اور بہر حال میرے لئے اس غمکدے میں آنا کیوں ضروری سمجھا گیا۔ میں رات بھر تڑپتا رہا۔ دل میں مایوسی۔ حسرت وغم۔ افسوس اور عبرت کے جذبات پیدا ہوئے۔ مجھے اپنی ٹوٹی ہوئی قسم یاد آئی۔ پشیمان ہوا۔ اور سحر کے قریب میں نے دیوار پر لٹکے ہوئے قرآن کے سامنے کھڑے ہو کے قسم کھائی۔ کہ آئندہ کسی پہ عاشق نہیں ہونگا +

(۳)

میں نے کلب میں جانا آنا چھوڑ دیا۔ میری طبیعت دُنیا کی ہر بات سے اُکتا گئی۔ ان دنوں میں واقعی اس پتے کی طرح ہوگیا جسے ہوا کا ہر جھونکا ادھراُدھر اڑائے پھرتا ہے۔ لیکن وقت کی مساعدت سے آہستہ آہستہ زخم دل بھر گئے۔ میں اپنے مشاغل میں مصروف ہوگیا۔ اور اس واقعے کی یاد میرے لئے ایک غم انگیز افسانے کی یاد سے زیادہ نہ رہی +

انہیں دنوں میں اتفاق سے میری والدہ کی مُنہ بولی بہن اور اُن کی لڑکی آمنہ ہمارے ہاں آگئیں اور اس وجہ سے بھی میری طبیعت کافی بہل گئی + آمنہ میری بچپن کی سہیلی تھی۔ ہم دونوں اکھٹے کھیلا کرتے تھے۔ مجھے خوب یاد ہے کہ میں اسے تنگ کیا کرتا تھا۔ اسے ڈرایا کرتا تھا۔ اور وہ بیچاری مجھ سے ہمیشہ آزردہ خاطر رہتی تھی۔ لیکن اسے مجھ سے محبت تھی۔ اور مجھے اس سے۔ میں اسے اپنی چھوٹی بہن کی طرح چاہتا تھا۔ اور میری چھوٹی بہن بھی مجھ سے ہمیشہ شاکی رہتی تھی + آمنہ اب جوان تھی۔ ہم دونوں شروع شروع میں تو جھجکتے رہے لیکن بہت جلد گھل مل گئے۔ ہر وقت اکھٹے رہنے لگے۔ میرے اور اُس کے درمیان صحیح اور سچی دوستی کے تعلقات پیدا ہوگئے۔ اور میں اپنے آپ کو انتہا درجے کا خوش نصیب سمجھنے لگا۔ کیونکہ عشق کے عافیت سوز اور محترق القلوب ہونے کے متعلق مجھے یقین ہو چکا تھا۔ اور دوستی جسے اب میں زندگی کی بہترین نعمت سمجھتا تھا مجھے حاصل تھی۔ میں نے اسے اپنی عاشقی کی داستان بھی سُنائی۔ اور مس لال سے میرا

اظہارِ عشق اور اُس کا جواب میرے اور آمنہ کے درمیان مذاق کا ایک مستقل موضوع تھا +

لیکن مجھے جلد ہی معلوم ہوگیا۔ کہ آمنہ کے لئے میرے دل میں فقط دوستی کے جذبات ہی نہیں بلکہ مجھے اس سے عشق بھی ہے۔ اور وہ اس طرح کہ ایک دن وہ ہمارے کلب کے نئے ممبر اور ٹینس کے مشہور کھلاڑی اعجاز اور اُس کی ہمشیرہ کے ساتھ سیر کرنے چلی گئی۔ میں گھبرایا ہوا اِدھر اُدھر پھرتا رہا ٹینس کورٹ سے بلیرڈ روم میں چلا گیا۔ اور وہاں سے کلب رستوراں میں اور وہاں سے پھر ٹینس کورٹ میں۔ الغرض جب تک آمنہ واپس نہیں آگئی۔ میں آتش زیر پا رہا۔ رشک بلکہ حسد کی آگ میں جلتا رہا۔ اور مجھے معلوم ہوگیا کہ میں اس وقت تک اپنے آپ کو دھوکا دے رہا تھا۔ اور درحقیقت میں آمنہ کا عاشق ہوں۔ جب آمنہ واپس آئی تو وہ مُسکرا رہی تھی۔ میں اَور بھی جل گیا۔ لیکن کیا کرسکتا تھا ہاں اعجاز کے ساتھ میں کافی بدتمیزی سے پیش آیا۔ مجھے اپنی قسم اور گزشتہ تجربے کا خیال بھی آیا۔ لیکن میں نے کہا کہ پہلی مرتبہ میرے جذبات کی بنیاد عشق پر تھی۔ اس دفعہ دوستی پہ ہے۔ اور عشق اور دوستی کا اجتماع جذبات کی دُنیا میں بلند ترین تخیل ہے +

اس کے بعد تین چار دن اطمینان سے گزرے۔ اعجاز آتا رہا۔ لیکن میرے حسد کی آگ بھڑکانے والی کوئی بات نہیں ہوئی۔ اور میں اس غیر خوشگوار واقعے کو محض اتفاق سمجھ کے تقریباً تقریباً فراموش کرچکا تھا۔ کہ ایک دن شام کے دُھندلکے میں جب ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ اور تمام فضا خوشبوؤں سے مہک رہی تھی۔ آمنہ نے کہا:۔

"مجھے کچھ تم سے کہنا ہے" +

میرا دل خدا جانے کن اُمیدوں میں دھڑکنے لگا۔ میں نے جواب دیا۔ "مجھے بھی کچھ تم سے کہنا ہے"

وہ بولی "تم کہو" +

مَیں نے جواب دیا "نہیں تم کہو" +

آمنہ نے کہا۔ "میرے دوست میرے عزیز دوست۔ میں ایک مصیبت میں ہوں۔ مَیں محسوس کرتی ہوں کہ تم اعجاز کو اچھا نہیں سمجھتے۔ لیکن میرے دوست میرے بھائی! مجھے اس سے محبت ہے۔ مجھے یہ بات کہتے ہوئے حجاب سا آتا ہے۔ لیکن میں تم سے کوئی بات چھپا نہیں چھپا سکتی۔ میں اس لال کے متعلق تمہاری باتیں سن کے مذاق اُڑایا کرتی تھی۔ لیکن آہ اب مجھے حقیقت معلوم ہوئی ہے۔ میرے عزیز۔ تم

ہماری مدد کرو ——"

میں یہ تمام گفتگو سنتا رہا اور تعجب ہے۔ سخت تعجب ہے کہ میرا دل پھٹ نہیں گیا۔ بہرحال دنیا میری نگاہوں میں تاریک ہوگئی۔ ہوا کے جھونکے مجھے کاٹنے لگے۔ اور واپس آنے پر میں نے اپنے کمرے کا دروازہ پھر اس قدر زور سے کھولا کہ کارنس پہ رکھا ہوا وینس کا مرمریں بت نیچے گر پڑا +

اور ایک دفعہ پھر میں دنیا سے۔ خدا سے۔ اپنے آپ سے خفا ہوگیا۔ دنیا کی تخلیق اور خاص طور پہ اپنی تخلیق کا سبب بار بار پوچھتا رہا۔ دوستی کو فریب اور واہمہ کہتا رہا۔ مایوسی حزن و ملال اور عبرت کی لہریں دل و دماغ میں رات بھر دوڑتی رہیں۔ اور آخر سحر کے قریب مسجد میں گیا۔ اور قرآن پہ ہاتھ رکھ کے قسم کھائی کہ اب کسی پر عاشق نہیں ہونگا +

(۴)

اس واقعے سے مجھے سخت صدمہ ہوا۔ زندگی پہ میری کوئی گرفت نہ رہی اور میں دوبارہ اس پتے کی کی طرح ہوگیا۔ جسے ہوا کا یہ جھونکا اڑا کے لے جاتا ہے۔ یا اس کاغذی کشتی کی طرح جسے لڑکے سطح آب پر چھوڑ دیتے ہیں۔ میں بیمار ہوگیا۔ اور تبدیل آب و ہوا کے بہانے سات ماہ تک گھر سے غائب رہا۔ (آمنہ اور اعجاز کی شادی تیسرے مہینے ہوگئی تھی) جب واپس آیا تو خیر سکون قلب حاصل ہوچکا تھا لیکن دنیا و مافیہا کو میں ایک سراب سے زیادہ نہ سمجھتا تھا۔ کسی قسم کی کوئی آرزو یا خواہش میرے دل میں نہ تھی۔ میں اداس اور خاموش رہنے لگا۔ میں نہیں کہہ سکتا۔ کہ میرے بزرگوں نے مجھے کس مرض میں مبتلا سمجھا لیکن میری بدقسمتی سے جو علاج سوچا گیا وہ یہ تھا کہ میری شادی کردی جائے +

میں اپنے آپ سے بیزار رہتا۔ اور تفریح کے تمام مشاغل کو خیرباد کہہ چکا تھا۔ ہاں دریا پہ اکثر جایا کرتا تھا۔ ایک دن میں اپنی کشتی کو رو پہ چھوڑ کے آنکھیں بند کئے بے حس و حرکت لیٹا ہوا تھا کہ میرے کان میں ایک چیخ کی آواز آئی۔ میں گھبرا کے اٹھا۔ مجھ سے تیس چالیس گز کے فاصلے پر کنارے سے دو تین گز ادھر ایک نوجوان لڑکی تیزی سے بہتی ہوئی جا رہی تھی۔ اور ایک نوعمر لڑکا کنارے پر کھڑا چلا رہا تھا۔ میں فوراً کشتی سے کودا۔ اور جب وہ آخری مرتبہ زیر آب جانے والی تھی۔ ٹھیک اس وقت میں نے اسے بالوں سے پکڑ لیا۔ اور معمولی کوشش سے کنارے پر لے آیا +

ظاہر ہے کہ میں ان دونوں کے ساتھ (بعد میں معلوم ہوا کہ یہ بہن بھائی تھے) ان کے مکان پہ گیا۔ میرا کس قدر شکریہ ادا نہیں کیا گیا۔ ان کی والدہ بار بار میری بلائیں لیتی رہیں۔ اور فرمانے لگیں۔ "جس نے میری رقیہ کی جان بچائی ہے۔ وہ مجھے اپنی جان سے پیارا ہے۔" "رقیہ" بھی مجھے کنکھیوں سے دیکھتی رہیں۔ اور آخر کچھ شرما لجا کے شکریہ ادا کرنے لگیں۔ غرضکہ میں اس مکان میں سب کی آنکھوں کا تارا بن گیا +

لیکن افسوس ہے کہ میں اب سچے سے سچے جذبات کی بھی قدر نہیں کر سکتا تھا۔ کیونکہ مجھ میں یہ اہلیت ہی باقی نہ رہی تھی۔ بہرحال میں ان کے ہاں آتا جاتا رہا اور سلسلہ راہ و رسم باقاعدہ طور پر جاری ہو گیا ان ہی دنوں میں رقیہ کی والدہ کے دماغ میں یہ خیال پیدا ہو گیا۔ کہ میں رقیہ کی جان کا مالک ہوں۔ کیونکہ اگر میں نہ ہوتا تو رقیہ بھی نہ ہوتی۔ اس خیال نے ان کے دماغ میں خیالات کی ایک زنجیر پیدا کر دی۔ اور انہوں نے صاف الفاظ میں تو نہیں لیکن خیر مجھ پہ یہ واضح ضرور کر دیا کہ وہ چاہتی ہیں کہ جس زندگی کو میں نے بچایا ہے۔ اس زندگی کا قانوناً اور شرعاً میں ہی مالک بن جاؤں +

میں نے یہ سوچا۔ کہ آخر مجھے شادی کرنی پڑے گی۔ میں والدین کا اکلوتا بیٹا ہوں۔ اور وہ اصرار پر اصرار کر رہے ہیں۔ وہ چیز جسے عشق کہتے ہیں۔ اب میرے لئے ممکن نہیں۔ شاید قدرت نے کچھ مصلحت سوچی ہو۔ ورنہ روز روز دریا میں کون گرتا ہے اور کون بچانے کے لئے عین وقت پہ موجود ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں جو احسان میں نے اس خاندان پہ کیا ہے اس کی تکمیل اسی طرح سے ہو سکتی ہے کہ میں رقیہ سے شادی بھی کر لوں۔ چنانچہ میں نے اپنی رائے کا اظہار کر دیا اور بزرگوں کی وساطت سے یہ معاملہ طے ہو گیا۔ اور میری اور رقیہ کی منگنی ہو گئی +

رقیہ کو مجھ سے محبت ضرور تھی۔ لیکن اس محبت کی موجب میری ذات نہ تھی۔ بلکہ یہ فعل کہ میں نے اس کی جان بچائی ہے۔ وہ یہ سمجھتی تھی کہ اس کا فرض ہے کہ وہ مجھ سے محبت کرے۔ منگنی کے تھوڑے ہی دن بعد جب میری اس سے ذرا بے تکلفی ہو گئی تو وہ میرے طرزِ عمل اور میری گفتگو سے تاڑ گئی کہ میں اپنے وہم میں اس پہ ایک قسم کا احسان کر رہا ہوں ورنہ مجھے اس سے عشق نہیں —— اس کا نتیجہ ایک ہی ہو سکتا تھا۔ اس نے منگنی توڑ دی اور مجھے ملنے سے انکار کر دیا +

اور اب مجھے معلوم ہوا۔ کہ رقیہ سے مجھے فی الحقیقت عشق تھا۔ کیونکہ جب میں اس سے آخری مرتبہ

..دا ہوا تو دُنیا میری آنکھوں میں تاریک تھی۔ آفتاب کی کرنیں میرے بدن میں سوئیوں کی طرح چُبھ رہی تھیں ..ا کے جھونکے مجھے کاٹنے کو دوڑتے تھے۔ اور میں نے اپنے کمرے کا دروازہ اس قدر زور سے کھولا کہ ..تاربس پر رکھا ہُوا وینس کا مرمریں بُت زمین پر گر پڑا +

اور میں اپنے آپ سے۔ اس دُنیا سے۔ اپنے خدا سے خفا ہوگیا۔ اور دیر تک دُنیا کی اور ..ص طور پر اپنی تخلیق کی وجہ پوچھتا رہا +

اور آج کل میں واقعی اُس پتّے کی طرح ہوں جو ہوا کے ہر جھونکے کے ساتھ اُڑ جاتا ہے۔ یا اُس ..غذی کشتی کی طرح جسے برسات کے موسم میں بچے سطحِ آب پر چھوڑ دیتے ہیں +

اور میں چاہتا ہوں کہ پھر قسم کھاؤں لیکن اب مجھے اپنی قسم کا اعتبار نہیں +

جیحوں بہ قطرہ

(اُستاذی گرامی مدظلہٗ)

یک اشکِ خوں بدجلۂ و جیحوں برابر است — در وادیِ بلا کم و افزوں برابر ست
در کارگاہِ عقل بود رنگِ امتیاز — در بزمِ عشق لیلیٰ و مجنوں برابر ست
مُفت ست گر ز غمزۂ خوں ریز جاں بریم — یک خونِ بے گناہ بصد خوں برابر ست
در نزع بر زبانِ زلیخا جزا ایں نبود — یک آہ با ہزار شبیخوں برابر ست
منصور را ز نکتۂ وحدت خبر کنید — چوں اے پسر چگونہ بہ بیچوں برابر ست
اللّٰہی ست دیگر و لاہی دگر بود — غافل کجا بحضرت ذوالنوں برابر ست
از حرفِ بوسہ لغزشِ مستانہ گل کند — موجِ شراب و آں لبِ میگوں برابر ست
آنجا کہ نامرادیِ ما خیمہ بر زند — اُمید با فسانۂ و افسوں برابر ست

آنجا کہ شد گرامیِ غمدیدہ اشک ریز
یک قطرہ با تلاطمِ جیحوں برابر ست

چغتائی کی تصویر

وی آنا کا ایک نامور مصوّر مشرق کی رعنائیوں کے خواب صورت پذیر ہوتے ہوئے دیکھنے کے لئے اپنے ملک کو چھوڑ کر ہندوستان پہنچا۔ یہاں کے جا بجا مظاہرِ جمالیات کا مطالعہ کرنے کے بعد۔ یعنی اجنتا تاج محل۔ سیکری۔ دہلی وغیرہ سے ہو کر اُسے عہدِ حاضرہ کے فنونِ لطیفہ کے نمونوں کو دیکھنے کی ہوس ہوئی۔ مگر اس کی مایوسی کی کوئی انتہا نہ رہی جب اُسے بنگالی مصوری کی اختراعات فائقہ دکھائی گئیں۔ بھلا ان بے کیف نقالیوں سے ایسا نامور مصوّر اور نقاد جس کی آنکھوں نے دُنیا بھر کی شاہکار تصویریں دیکھی ہوں۔ کیسے لطف اندوز ہو سکتا تھا۔ آخر وہ پنجاب پہنچا۔ اور اس مردم خیز فضا میں آکر اسے یقین ہؤا۔ کہ ہندوستان میں ابھی مغلیہ روایات زندہ ہیں۔ ظاہر ہے کہ وہ اوّل اوّل حضرتِ علاّمہ کے آستان پر حاضر ہؤا اور وہاں اُسے معلوم ہؤا۔ کہ پنجاب میں ایک جواں سال مصوّر موجود ہے جو پُرانی ایرانی اور مغلیہ روایات جمالیات کا مجدد۔ اور تہذیبِ اسلامی کی اصلی روح کا صحیح آئینہ بردار ہے۔ اُس کی خوش قسمتی سے حضرت چغتائی کے کے پاس خلافِ معمول چند رنگین تصاویر اور حسبِ معمول بہت سے بے رنگ انگارے موجود تھے۔ جب یہ خزینۂ جواہر مغربی نقاد کی پرکھ کے لئے پیش ہؤا۔ تو مصوری کی ہمہ گیری دیکھئے۔ کہ اس اجنبی کی نگاہوں نے الف لیلہ کے علی بابا کی نقادانہ "سم سم" سے تمام زر و نقد کو اپنا کر لیا۔ اور اس کامرانی کے نشہ سے ایسا سرشار ہؤا۔ کہ اُس نے حضرت چغتائی کی مدح میں وہ کلمات کہے۔ جو شاید مجھ ایسا چغتائی پسند بھی کہتے ہوئے جھجکے۔ یہ وی آنوی مصور ابھی ہندوستان میں ہے۔ اور اپنے ملک میں جاکر جب اپنی سیاحت کے تجربات کتابی صورت میں شائع کرے گا۔ تو اُس میں حضرتِ علاّمہ اور چغتائی کے متعلق مستقل باب ہونگے!

مخزن کی خوش قسمتی ہے۔ کہ اس میں اب کے وہ تصویر چھپ رہی ہے۔ جو اس نامور مصوّر کو سب سے زیادہ پسند آئی۔ PILGRIM یاتری۔ راہروِ ہستی۔ یا عصائے پیری۔ نام جو چاہو رکھ لو۔ کیونکہ تصویر جس کا موضوع رنگ اور خط ہیں۔ الفاظ سے بالکل بے تعلق ہوتی ہے۔ یہ ایک ایسی تصویر ہے۔ جو محض اس لئے کہ اس کے افراد ایسے نہیں جو اسافل کے شہوانی جذبات کا موضوع بن سکیں (مناظر کی تصویر کا

زن
ی یہی حال ہے) اور اس طرح "عکاسانہ" جزئیات سے آزادگی انہیں کھیا نا نہیں کرتی۔ "سکوت" کی طرح
ہے لوگوں میں بھی بہت مقبول ہوگی جو تصویر کی ہر عورت کو ژولیدہ آشفتہ سمجھ کر سیم کی پھلیوں کی سی انگلیوں
در آنکھوں کے تیروں کو "غیر فطرتی" کہہ کر معیوب قرار دیتے ہیں اور اس طرح اس چیز کو جسے وہ شاعری
ں مستحسن قرار دیتے اسی کو مصوری میں مقہور گردان کر اپنے طبعی رجحان اور اور غیر جمالیاتی معیار کی حقیقت
ا منکشف کر دیتے ہیں +

بوڑھے کا چہرہ خالص اسلامی ہے۔ جس کی رگ رگ میں ہماری روایات کا خون دوڑ رہا ہے۔ اقبال
ی شاعری ایسے نوع کے لوگ پیدا کرتی ہے۔ جو اسلام کا صحیح مجسمہ ہوں۔ عقاب کی طرح تند سیل رواں کی
طرح سبک سیر۔ کوہستان کی طرح پائندہ۔ اور پروانے کی طرح جانباز اور عشق میں گدازاا——
چغتائی ایسے چہرے تخلیق کرتا ہے جنہیں دیکھ دیکھ کر ناظرین روح اسلامی دوڑنے لگے۔ ان تصویروں میں
جزئیات نہیں۔ محض روح خیال کا اظہار کیا جاتا ہے۔ تاکہ مصور کا پیغام وضاحت کے ساتھ محسوس
ہو سکے۔ بوڑھا صحراؤں کا راہرو (چغتائی نے صحرا کو کنایتہً رنگ کی جھلکیوں اور چند صحرائی پتوں
سے ظاہر کر دیا ہے) زندگی کے اس استخوان شکن سفر سے ہمت ہار کر نہیں بیٹھا۔ (چغتائی اس سفر کی صعوبتوں
کی خوشگواری کے اظہار کے لئے راستے میں پھول بکھیر دیتا ہے۔) یہ پیر جواں ہمت جس کا بدن غیر فانی چٹانوں
سے ترشا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ جس کے حلیے سے۔ لباس سے۔ جوتوں سے۔ عقابی نگاہوں کی تندی نیزے
کی انیوں کی سی تیزی پائی جاتی ہے۔ یہ رہرو ہستی عصا تھامے ہوئے اس جاودانی سفر پر بے تکان چلا جا رہا
ہے۔ اگر موت اس سعی پیہم کا سلسلہ منقطع بھی کر دے۔ تو روح اسلامی کا وہ چراغ جس کا فانوس یہ کسوتِ
جسمانی ہے اُسی پرانی شعلہ سامانی سے فروزاں رہے گا۔ اگر یہ ایک شعلہ خاموش بھی ہو جائے۔ تو وہ بچہ
جو بوڑھے کے ساتھ سائے کی طرح لپٹا ہوا ہے۔ اس مشعل کو دوبارہ زندہ کر دے گا۔ اور اس طرح یہ
مشعل برادری کا سلسلہ دست بدست تا ابد چلتا رہیگا۔ یہ ہے وہ پیغام جو چغتائی اس تصویر میں دے رہا ہے +

تاثیر۔ ایم۔ اے

عصائے پیری

(تصویر کا دوسرا رُخ)

گیا وہ ہنگامۂ خود پرستی
اُجڑ چکی ولولوں کی بستی
خزاں کے ہاتھوں سے لُٹ چکی ہے ہوس کی شوخی ہوا کی مستی
شباب کی وادئ طرب سے گزر گیا کاروانِ ہستی
عدم کا پُرہول راستہ ہے اِدھر بلندی اُدھر ہے پستی

سفر ہے اور رات کا اندھیرا
نہ جانے کب آئے گا سویرا
ٹھہر کے چلنا ہے غیر ممکن کہ عُمر کا اُٹھ چکا ہے ڈیرا
گرہ میں زادِ سفر نہیں ہے ہے جان کی تاک میں لٹیرا
غرض پرستوں کی ہمرہی ہے نہ کوئی تیرا نہ کوئی میرا

قدم قدم پر ہزار ٹھوکر
نہ عشق ساتھی نہ عقل رہبر
سنبھل کے چلنا ہے سخت مُشکل کہ پاؤں جمتے نہیں زمیں پر
کہیں ذرا بھی جو پَیر پھسلا تو ٹکڑے ٹکڑے ہے کاسۂ سر
نزاکتِ راہ کی وہ حالت اور اُس پہ یہ تند و تیز صرصر

ہے دامنِ ہوش پارا پارا
حواس بھی کر گئے کنارا
مگر چلے جا رہے ہیں رہرو کہ اب نہیں اور کوئی چارا
فضائے اُمید کی جبیں پر چمک رہا ہے بس ایک تارا
کہ ہے تو فرزند ساتھ میں ہے عصائے پیری ہے یہ سہارا

ابوالاثر حفیظ جالندھری

وارداتِ قلب

(گمنام)

(۱)

کون تقدیر کے پردے میں عمل کرتا ہے؟
میری تدبیریں جو رد و بدل کرتا ہے
عشق سے کیوں نہیں انساں کی رہائی ممکن؟
کوئی اس عقدۂ دشوار کو حل کرتا ہے؟

(۲)

فریب خوردۂ رنگینیٔ مجاز ہوں میں
حرارتِ مئے احمر سے دلگداز ہوں میں
میں حسن و عشق کے بازار میں بھی جاتا ہوں
مگر خدا کی قسم ایک پاکباز ہوں میں

(۳)

کوئی خوابِ گراں میں سوتا ہے
کوئی ماتم میں رات کھوتا ہے
پھول بھی باغ میں ہیں شبنم بھی
کوئی ہنستا ہے کوئی روتا ہے

(۴)

کوئی مستِ شباب آتا ہے
غیرتِ ماہتاب آتا ہے
اے خدا خیر ہو کہ آپ ہی آپ
لب پہ لفظِ حباب آتا ہے

(۵)

ہفت افلاک پہ مانندِ نظر جاؤں گا
دیکھتے دیکھتے تاروں سے گزر جاؤں گا
میں پہنچ جاؤں گا جنت میں تخیل کی طرح
یعنی اب وقت وہ آتا ہے کہ مر جاؤں گا

پنجاب کے میدان

(جناب تلوک چند محرؔوم)

کس قدر ہے آہ! دامنگیرِ دل تیری زمیں   دلکشی پنجاب! کتنی تیرے میدانوں میں ہے
تیری وسعت میں ہوئی گُم رفعتِ چرخِ بریں   ایک ایوانِ فلک بھی تیرے ایوانوں میں ہے

دُور تک آتی نظر ہیں لہلہاتی کھیتیاں   سامنے جن کے خجل ہے کشتِ خضرائے فلک
اور چاندی کی چمک والی یہ تیری ندّیاں   کہکشاں ایسی اگر رکھتا ہے دکھلائے فلک

دیدۂ و دل جس سے روشن آریاؤں کے ہوئے   آج بھی تیری فضاؤں میں جھلکتا ہے وہ نُور
نغمۂ مستانۂ توحید کی تاثیر سے   آج بھی تیری ہواؤں سے ٹپکتا ہے سُرور

عاشقی پرور سماں تیری چراگاہوں میں ہے   یاد جس سے تازہ ہے رانجھے کی اور مہینوال کی
اور غبار ساجو منظر دشت کی راہوں میں ہے   خاک اُڑتی ہے یہ عشّاقِ پریشاں حال کی

دل تڑپ اُٹھتا ہے پہلو میں یکایک جب کہیں   بانسری کی کوک اُٹھتی ہے سکوتِ شام میں
مائلِ فریاد ہوتا ہے دلِ اندوہگیں   اور جگر سے ہُوک اُٹھتی ہے سکوتِ شام میں

کچھ خیاباں بہرِ گلگشتِ بُتانِ نازنیں   کچھ بیاباں دشت پیمایانِ وحشت کے لئے
بُلبُل و گُل کی ہے خلوت گاہ تیری کُل زمیں   بزمِ زیبا اختلاطِ حُسن و اُلفت کے لئے

حُسن و اُلفت ہی نہیں ہے تیری شانِ امتیاز   کونسا میداں ترا ہے جو نہیں میدانِ جنگ
جذبۂ حُبِّ وطن پر خاک کو تیری ہے ناز   سُورماؤں کے لہو سے آج تک ہے لالہ رنگ

تازہ غزلیں

محمد کبیر خاں صاحب رسا جالندھری

سمجھ کر بے خبر مجھ کو سمجھ کر بے زباں مجھ کو
کوئی آ کر سناتا ہے مری ہی داستاں مجھ کو

نہیں پاتا جو قسمت کے گلے میں ہم زباں مجھ کو
دلِ بد ظن سمجھتا ہے شریکِ آسماں مجھ کو

سنبھل کر چل یہ کیا ہلچل مچا دی تو نے لغزش سے
عدم پر بزمِ ہستی کا گزرتا ہے گماں مجھ کو

وہاں پہنچا ہوا ہوں میں جہاں لے حضرتِ ناصح
مکانِ لامکاں ہے اک نشانِ بے نشاں مجھ کو

محبت نے نئی تفریق کی بنیاد ڈالی ہے
فلک ہے اب زمیں مجھ کو زمیں ہے آسماں مجھ کو

قناعت دل کی مونس ہے تو کیا کہنا قناعت کا
بنایا ہے اسی نے بے نیازِ دو جہاں مجھ کو

بھلا ہو جذبِ دل کا کھینچ لایا تیرے کوچے میں
خدا معلوم ذوقِ سجدہ لے جاتا کہاں مجھ کو

کچھ اس انداز سے صیاد نے دیکھا مری جانب
نظر آنے قفس میں آشیاں ہی آشیاں مجھ کو

نسیمِ صبح کی اٹھکیلیاں اچھی سہی لیکن
گلوں کا کھل کے مرجھانا گزرتا ہے گراں مجھ کو

بھلا دیتا ہے جب درسِ فنا آغوشِ ہستی میں
نئے سر سے سبق دیتی ہے مرگِ ناگہاں مجھ کو

مٹے گر کوئی مٹتا ہے رسا دنیا کی دولت پر
مرا سرمایۂ غم ہے متاعِ دو جہاں مجھ کو

تلوک چند صاحب محروم

ہر نظارے میں ہیں سو پرتوِ جاناں پیدا
کیوں نہ ہو دیکھنے والے میں نئی جاں پیدا

طربِ دل سے بیاباں بھی ہے رشکِ گلشن
دل ہو ناخوش تو ہو گلشن میں بیاباں پیدا

جن کی تقدیس کی کھاتے ہیں فرشتے بھی قسم
ہم گنہ گاروں میں ہوتے ہیں وہ انساں پیدا

کر ہی ڈالے گی ہوائے چمنِ دہر ملول
صورتِ گل بھی اگر کوئی ہو خنداں پیدا

ظلمتِ یاس میں امید کی پنہاں تھی جھلک
پردۂ شب سے ہوا نیرِ تاباں پیدا

غیب سے ہمتِ مردانہ کو ملتی ہے مدد
عزم راسخ ہو تو ہو جاتے ہیں ساماں پیدا

مایۂ نازشِ دوراں یہ پریشانی ہے
روز ہوتے ہیں کہاں ہم سے پریشاں پیدا

حق نے شاعر کے تخیل کو یہ قدرت بخشی
ذرۂ خاک سے کر دے چمنستاں پیدا

مولوی عقیل الرحمٰن صاحب عقیل ندوی

ڈھونڈتی کیا ہے محبت کی نظر پہلو میں
اپنے سینے میں نہ دل ہے نہ جگر پہلو میں

خود چبھو لیتا ہوں نشتر جو سکوں پاتا ہوں
ایک سینے میں ادھر ایک اُدھر پہلو میں

دل لہو ہو کے ٹپکتا رہا قطرہ قطرہ
اک لڑی بندھ گئی پھولوں کی مگر پہلو میں

دجلۂ چشم ہے طغیانی پہ بہہ جانے دو
اپنے آپ آ کے بنا لیں گے وہ گھر پہلو میں

ہجر اور وصل کے افسانوں میں کیا رکھا ہے
چاہیئے ایک خلش آٹھ پہر پہلو میں

قصۂ زلفِ دوتا اُن کو سُنانا تھا مگر
بات میں بات نکلتی رہی ہر پہلو میں

کبھی اس دل میں ٹھکانا کبھی اُس دل میں گزر
برق کی طرح وہ کرتے ہیں سفر پہلو میں

ہوتا مسجودِ ملائک یہ بھلا ممکن تھا
سوزشِ عشق نہ رکھتا جو بشر پہلو میں

دل کے زخموں پہ نہ انگور بندھے ہیں نہ بندھیں
تازہ رہتے ہیں ہمیشہ یہ ثمر پہلو میں

دیں گے دل اَور جگر دونوں دعائیں تجھ کو
تیغ بن کر نگہِ ناز اُتر پہلو میں

تو حبابِ لبِ دریا ہے نہیں ہے دریا
اے خودی دیکھ زیادہ نہ اُبھر پہلو میں

نورِ رُخ ظلمتِ گیسو کے تصور سے عقیل
ہم بنا لیتے ہیں خود شام و سحر پہلو میں

ابو الاثر حفیظ جالندھری

سمجھا ہُوا ہوں شُومیٔ دستِ دعا کو میں
کچھ روز اَور دیکھ رہا ہوں خدا کو میں

ثابت قدم رہوں کہ تلاطم کا ساتھ دوں
ساحل کے رُخ تو لا نہ سکوں گا ہوا کو میں

کشتی خُدا پہ چھوڑ کے بیٹھا ہے مطمئن
دریا میں پھینک دوں نہ کہیں نا خدا کو میں

انسان ہوں خطائے وفا بخش دیجئے
بس کیجئے۔ پہنچ تو چکا ہوں سزا کو میں

مطلب پرست دوست نہ آئے قریب میں
بیٹھا رہا لئے ہوئے دامِ وفا کو میں

آ۔ اے جنونِ عشق۔ کہ تکمیل زیست ہو
توڑوں طلسم خانۂ ارض و سما کو میں

اُردو زبان کا اولین صحیفہ



مخزن

دورِ جدید

لاہور

ایڈیٹر

ابوالاثر حفیظ جالندھری



آئینۂ حرم ——— عمل چغتائی

رجسٹرڈ ایل نمبر ۲۰۵

دور جدید

مخزن

قیمت سالانہ للعہ — ممالک غیر سے ۹ شلنگ

بذریعہ وی پی للعہ — فی پرچہ ۶/

جلد ۱ | بابت ماہ جون سنہ ۱۹۳۰ء | نمبر ۴

تصاویر۔ (۱) آئینۂ حرم ——— ملک چغتائی۔ (۲) رُوپیٹ بزرگ۔

صفحہ ... کی ... مراسلہ نگاروں کی کتابت تحریر ...

گیلانی الیکٹرک پریس لاہور باہتمام بابو ... الدین پرنٹر و پبلشر میاں ... الدین پبلشر نے دفتر مخزن بھاٹی دروازہ لاہور سے شائع کیا

وفاتِ گرامی

(آخری ملاقات)

میں کچھ دنوں سے شملہ میں مقیم ہوں یہیں محترمہ گرامی کا خط ملا جس میں مختصر طور پر لکھا تھا۔ کہ تمہارے اُستاد کی طبیعت زیادہ علیل ہے۔ اور وہ کئی مرتبہ تمہیں یاد کر چکے ہیں۔ میں ۱۴ ۔ کی صبح کو ہوشیارپور مولانا کے دولتکدے پر جا پہنچا میرے اُستاد بھائی مولانا عظامی ہوشیارپوری مردانے میں موجود تھے۔ اُن سے معلوم ہوا۔ کہ حالت نازک ہے۔ حضرت زنانخانے میں ہیں۔ صاحب فراش ہیں۔ غرض اطلاع کرائی گئی۔ تو مولانا نے تیمارداروں سے فرمایا۔ ہمیں مردانے میں لے چلو چنانچہ دو آدمیوں کا سہارا لئے ہوئے مردانے میں آئے۔ اس قدر کمزور تھے کہ صورت پہچانی نہ جاتی تھی ضعف اتنا بڑھ گیا تھا۔ کہ یہاں تک آتے آتے نڈھال ہو کر پلنگ پر بیخود لیٹ گئے + میں نے پُرنم آنکھیں حضرت کے سر اور بے جان ہاتھوں پر ملیں۔ تھوڑی دیر بعد آپ نے میری طرف دیکھا۔ اور پہچان لیا۔ دیرینہ شفقت سفید مُرجھائے ہوئے چہرے پر مُسکرائی۔ آپ نے ہاتھ بڑھا کر اپنے فرزند معنوی کا سر سینے پر رکھ لیا۔ اور دھیمی آواز میں فرمایا۔ "حفیظ آ گیا۔ ہمیں یقین تھا حفیظ گرامی کو دیکھنے ضرور آئے گا" + میں بیماری کے متعلق کچھ تسلی آمیز الفاظ کہنا چاہتا تھا۔ مگر کچھ نہ کہہ سکا آپ نے شکوہ کے طور پر کہا۔ "ڈاکٹر علامہ اقبال نہیں آیا۔ تین تار بھیجے گئے ہیں" + میں نے عرض کیا۔ "وہ آج کل فسادات لاہور کی وجہ سے بے حد مصروف ہو رہے ہونگے" + مولانا خاموش رہے۔ پھر کہنے لگے "جالندھر گرامی کا وطن! جالندھر گرامی کا وطن!!" میں نے کہا۔ "گرامی نے اُسے زندہ جاوید کر دیا ہے" حضرت مُسکرائے۔ اور فرمایا "انشاءاللہ حفیظ گرامی کو زندہ جاوید کریگا" + اب میرے آنسو نہ تھم سکے۔ مولوی عظامی اور گرامی صاحب کے دوسرے رشتہ دار بھی رونے لگے + حضرت کچھ دیر جالندھر اور پنجاب کی تعریف میں اشعار پڑھتے رہے۔ پھر آہستہ آہستہ اپنے کلام کی طباعت کے متعلق وصیت کرتے رہے۔ آخر تھک کر آنکھیں بند کر لیں + میں ایک دن ہوشیارپور ٹھہرا شام کے وقت آپ نے مجھے گھر کے اندر بلایا اور رخصت ہونے کی تاکید کی۔ اس وقت آپ جالندھر، ڈاکٹر اقبال، حکیم اجمل خاں اور سالک کو بار بار یاد کرتے اور ان کا حال پوچھ رہے تھے۔ میں نے عرض کیا۔ اگر آپ فرمائیں تو میں ان حضرات کو بلاؤں۔ آپ نے منع کیا۔ اور کہا "میاں رہنے دو۔ اُن کے معمولات میں ہرج واقع ہوگا۔ تندرست ہو کر گرامی خود اُن سے ملنے جائے گا" +

میں روتا دھوتا رخصت ہو آیا۔ آج تار کے ذریعہ آپ کی سُنائی سُن لی۔ آہ! آفتابِ سخن جو خاکِ پاک پنجاب سے طلوع ہوا۔ اور مدتوں سرزمینِ ادب پر جلوہ بار رہا۔ آج غروب ہو گیا + اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن ط

کل تک شہر کا ماتم ہو رہا تھا۔ آج ملک گرامی کے لئے سیاہ پوش ہے۔ گرامی کا صدمہ کسے نہیں۔ مخزن بھی اس عالمگیر ماتم میں شریک ہے۔ مخزن کا آئندہ نمبر "گرامی" نمبر ہوگا۔ اُمید ہے۔ وہ احباب جو گرامی اور کلامِ گرامی سے محبت رکھتے ہیں۔ اپنے صدمے کے تاثرات کو نظم یا نثر میں قلمبند کر کے ۱۰ ر جون تک دفتر مخزن میں بھیج دینگے اور اس طرح ایک ماتمی محفل میں یکجا ہو کر ہم سب اُس شاعر کی روح کو پُرسا دینگے جو ایشیا کا فخر تھا +

غمزدہ حفیظ

مخزن

دورِ جدید

مولوی سیّد ممتاز علی

گذشتہ سے پیوستہ

چونکہ سرسید کو آپ کے خاندانی حالات وحیثیت کا کچھ علم نہ تھا۔ اس لئے سفر خرچ اور ریل کا کرایہ بھی اپنی طرف سے پیش کیا۔ سید ممتاز علی صاحب نے اس خط کے جواب میں اپنے سب حالات بتائے۔ اور کرایہ وغیرہ قبول کرنے سے شکریہ کے ساتھ انکار کیا ؛

دسمبر سنہ ۶۹ء میں آپ کلکتہ گئے۔ جس رات آپ وہاں پہنچے۔ سرسید وائسرائے کے دربار لیوی میں گئے ہوئے تھے۔ آپ کے لئے ایک کمرہ تیار تھا۔ اُس میں قیام فرمایا۔ رات کے ایک بجے کے قریب سرسیّد تشریف لائے اور اُسی وقت اُن کے کمرے میں ملنے کے لئے گئے۔ آپ کی آنکھ کھل گئی اور آپ کھڑے ہوگئے۔ سرسید نے اُنہیں سینے سے لگا لیا۔ اور بہت دیر تک نہایت محبت وشفقت سے باتیں کرتے رہے۔ اُس زمانے میں امرتسر سے ایک اخبار سفیر ہند بڑی آب وتاب سے شائع ہوتا تھا۔ اس میں سرسید کے

عقائد کے خلاف مضامین چھپا کرتے تھے۔ سید ممتاز علی صاحب اُس اخبار میں اُن اعتراضوں کا جواب دیا کرتے تھے۔ سرسید کی پہلی ملاقات میں ان ہی مضامین کا ذکر رہا۔ سرسید کے مخالفین میں سب سے بڑے نامور عالم ان دنوں مولوی ابو سعید محمد حسین بٹالوی مرحوم تھے۔ ان ایام میں بڑے معرکے کا مسئلہ حسن و قبح اشیاء تھا۔ مولانا مرحوم کا یہ عقیدہ تھا کہ حسن و قبح کوئی ذاتی یا عقلی چیز نہیں۔ بلکہ اُس کا مدار سراسر حکم شارع پر ہے۔ جس چیز کو شارع نے قبیح قرار دیا وہ چیز قبیح ہو گئی۔ اور جس چیز کو حسن قرار دیا وہ حسن ہو گئی۔ سرسید صاحب کا عقیدہ اس کے خلاف تھا۔ وہ حسن و قبح کو عقلی بتلاتے تھے۔ سید ممتاز علی صاحب سرسید کے مؤید تھے اور کہتے تھے کہ حسن و قبح اشیاء دواؤں کے خواص کی طرح ہے اور انبیا اُن خواص کو ظاہر کرنے والے ہیں جس طرح طبیب کے اختیار میں یہ بات نہیں کہ دوا کے خواص بدل دے۔ اسی طرح نبی کے اختیار سے بھی یہ بات باہر ہے کہ گناہ کی بات کو موجب ثواب یا ثواب کی بات کو موجب عذاب بنا دیں۔ سید ممتاز علی صاحب نے سرسید کو بہت تفصیل اور خوبی کے ساتھ یہ مضمون لکھا تھا۔ اور سرسید نے اُسے بہت پسند کیا تھا۔ اسی کا بہت دیر تک ذکر رہا۔ اس کے بعد آپ سو گئے ✽

صبح کے وقت سرسید کے ساتھ چاء پر بہت سے مختلف مضامین پر گفتگو رہی۔ سرسید کبھی کسی ایک مسئلہ پر مفصل بحث بہت کم کرتے تھے۔ بلکہ آپ کا یہ قاعدہ تھا کہ ملنے والوں سے وقتاً فوقتاً مختلف مسائل پر اپنے خیالات ظاہر فرمایا کرتے تھے۔ یہ صحبت بہت ہی پُرلطف ہوتی تھی۔ اور بہت سے مشکل مسائل حل ہو جاتے تھے۔ سید ممتاز علی نے اُن دنوں جو خطوط احباب لاہور کو لکھے اُن سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُن کے دل میں جو چند شبہات موجب خلجان تھے وہ چند روز میں ہی رفع ہو گئے۔ اور سید ممتاز علی صاحب کا علی گڑھ کا مختصر سیر کے بعد سرسید کے کتب خانہ کی تیاری میں مشغول کر رہے ہیں ... سرسید تفسیر القرآن لکھ رہے تھے۔ مگر ایک مسئلہ پر وہ ایسے اٹکے کہ کوئی ... کا ... پیش تھی۔ کہ سرسید توریت و انجیل وغیرہ کتب مقدسہ کی تحریف لفظی کے قائل نہ تھے۔ آپ کا یہ عقیدہ تھا۔ کہ یہود و نصاریٰ نے اپنی کتب مقدسہ کے الفاظ کو نہیں بدلا۔ بلکہ اُن کے معانی و تفسیر کرتے تھے جو حقائق اسلام کے خلاف تھی ✽

لیکن طالوت و جالوت کا قصہ قرآن مجید میں بیان کیا گیا ہے۔ توریت کے بیان سے اس قدر مختلف ہے کہ ان دونوں بیانوں کی مطابقت نہیں ہو سکتی تھی۔ اگر قرآن مجید کا بیان صحیح مانا جائے تو توریت کا بیان کردہ قصہ غلط ہے۔ اور توریت میں تحریف لفظی ہوئی۔ تو پھر ... غلط کیوں ہے۔ یہ مشکل تھی جس کی وجہ سے سرسید کی تفسیر رکی پڑی تھی۔ سید ممتاز علی صاحب نے اس مشکل کو حل کرنے کا ذمہ لیا۔ اور چند روز کی محنت کے بعد

ایک رات کو آپ نے قرآن مجید کی جملہ آیات متعلقہ کی تفسیر بطور مسودہ لکھ کر دی جس میں نہایت معتبر تاریخوں سے یہ ثابت کر دکھایا۔ کہ توریت کا وہ حصہ جس میں طالوت و جالوت کا قصہ مندرج ہے۔ ایک ایسا جزو ہے جو توریت کے قدیم نسخوں میں پایا نہیں جاتا تھا۔ یعنی وہ الحاقی حصہ ہے جو بعد میں توریت میں داخل کیا گیا ہے +

سید ممتاز علی صاحب علی الصباح مسودہ مذکور سرسید کے حوالے کر کے سیر کو نکل گئے۔ اور جب کھانے کے وقت واپس آئے اور دریافت کیا۔ کہ مسودہ پسند آیا یا نہیں۔ تو آپ نے ایسا جواب دیا۔ جس سے سید ممتاز علی بے انتہا متعجب ہوئے۔ آپ نے فرمایا۔ کہ "علی گڈھ کے چھاپے خانے کی طرف سے سخت تقاضے کا خط آیا تھا۔ کہ تفسیر کا مسودہ چھپنے کے لئے بھیجا جائے۔ میں نے جب آپ کا مسودہ پڑھا۔ تو وہ مجھ کو اس قدر پسند آیا۔ کہ مجھے اُس میں ذرا سی بھی تبدیلی ضرورت نہ معلوم ہوئی۔ میں نے اُسی وقت کہ ڈاک جانے والی تھی۔ وہ چھپنے کے لئے علی گڈھ بھیج دیا۔ یہ میری تفسیر میں ہمیشہ کے لئے آپ کی یادگار رہے گا" +

سید ممتاز علی صاحب کو سرسید کے ان الفاظ سے بے انتہا خوشی و حوصلہ افزائی ہوئی۔ اور اس کے بعد سرسید کا یہ ہمیشہ دستور رہا۔ کہ قرآن مجید کے مشکل مقامات کی تفسیر میں سید ممتاز علی صاحب سے مشورہ کر لیا کرتے تھے۔ جب سید ممتاز علی صاحب نے رسالہ محاکمہ ولادت مسیح لکھا۔ تو سرسید صاحب نے پسندیدگی کا اظہار ان الفاظ میں فرمایا۔ کہ مجھے اپنی تفسیر کی دوسری ایڈیشن نکالنے کا خدا نے موقع دیا۔ تو آپ کے رسالے کے مطالب اُس میں داخل کروں گا +

سید ممتاز علی صاحب تقریباً ڈیڑھ مہینہ سرسید کے پاس رہ کر لاہور واپس آئے۔ کلکتے میں جن بزرگوں سے ملاقات کی اُن میں مولوی عبید اللہ العبیدی اور خان بہادر نواب عبد اللطیف صاحب بھی تھے۔ ان دونوں صاحبوں میں سے ایک علمی تحقیقات اور دوسرے امور سیاسی میں شہرت خاص رکھتے تھے۔ اُس زمانے میں نواب واجد علی معزول شاہ اودھ بھی زندہ تھے۔ اُن کو کئی دفعہ دیکھنے کا اتفاق ہوا +

لاہور آجانے کے بعد آپ کی سرسید سے بہت خط و کتابت رہتی تھی۔ اور ہر سال آپ کچھ عرصے کے لئے علی گڈھ تشریف لے جاتے اور سرسید کے مہمان رہتے تھے +

۱۸۸۴ء میں سید ممتاز علی صاحب نے بی۔ اے کا امتحان دیا۔ مگر اُس میں کامیاب نہ ہوئے اور تھوڑے عرصے کے بعد ہائیکورٹ پنجاب میں مترجم ہو گئے + ۱۸۸۸ء میں آپ متاہل ہو گئے۔ تین برس کی ملازمت کے بعد آپ ایسے سخت بیمار ہوئے۔ کہ ۱۸۹۱ء کے اخیر میں ملازمت سے دست بردار ہونا پڑا۔

اور سرسید نے ان کو اپنے پاس علی گڑھ میں بلا لیا۔ آپ کا ارادہ متاہل ہونے کے بعد ابتدا سے یہ تھا کہ مستورات کو حقوق شرعی دلوانے کا عظیم الشان کام شروع کیا جائے۔ اور اُس کے لئے وہ ایک زنانہ اخبار جاری کرنے کی سخت ضرورت سمجھتے تھے +

آپ کی اہلیہ ہر چند تعلیم یافتہ تھیں۔ لیکن اس قابل نہ تھیں۔ کہ اخبار کو چلا سکیں۔ وہ اپنی قابلیت بڑھانے میں بہت کوشش کرتی تھیں۔ مگر ان کی صحت زیادہ محنت کی اجازت نہ دیتی تھی۔ آخر دق کے عارضے سے ۱۸۹۵ء کے آخر میں ان کا انتقال ہو گیا۔ اس واقعے سے مولوی صاحب کو بہت صدمہ ہوا۔ اور عرصے تک آپ نہایت غمگین رہے +

چونکہ اہلیہ مرحومہ کی علالت میں سخت مشکلات پیش آئیں۔ اور مستورات کا رسمی پردہ تازہ ہوا کے آنے میں حارج ہوا۔ اس لئے اُس زمانہ خاموشی میں آپ نے کتاب حقوقِ نسواں تصنیف کی۔ جو نہ صرف اُس زمانے میں بلکہ آج تک اپنا نظیر نہیں رکھتی +

سرسید کی یہ بات مشہور ہے۔ کہ انہوں نے تعلیم نسواں کے لئے کچھ نہیں کیا۔ اور نہ کرنا چاہتے تھے۔ صرف یہی نہیں۔ کہ کرنا نہ چاہتے تھے۔ بلکہ اگر کوئی کچھ کرنا چاہتا۔ تو مانع ہوتے۔ اس لئے مولوی صاحب کو یہ خوف تھا۔ کہ شاید سید صاحب اس کتاب کو ناپسند کریں گے۔ پھر بھی وہ اُن کی خوشی کے بغیر شائع کرنا نہیں چاہتے تھے۔ آخر آپ اس کتاب کو سرسید کی خدمت میں اس غرض سے لے گئے۔ کہ وہ اس پر دیباچہ لکھ دیں۔ مولانا شبلی نے اس کتاب کو پڑھ کر کہا۔ کہ سرسید کے پاس یہ کتاب نہ لے جایئے۔ وہ اسے ناپسند کریں گے۔ مگر سید ممتاز علی صاحب نے مولانا ممدوح کے اس مشورے کا کچھ خیال نہ کر کے سرسید کی خدمت میں وہ کتاب پیش کر دی۔ مولوی صاحب نے خود ہم سے بیان کیا۔ کہ "جس وقت میں نے یہ کتاب سرسید کو دکھلائی تو ہم دونوں کے سوا کمرے میں کوئی تیسرا نہ تھا۔ اندازاً گیارہ بجے کا وقت تھا۔ سب لوگ اپنے اپنے دفتر کو چلے گئے تھے۔ میں نے قصداً یہ وقت اس لئے پسند کیا تھا۔ کہ اگر سید صاحب ممدوح غصے ہوں۔ تو کسی دوسرے آدمی کی موجودگی میں تو نہ ہوں۔ سرسید نے اُس کتاب کو کھول کر کہیں سے پڑھا اور چیں بجبیں ہوئے۔ پھر کسی دوسری جگہ سے کھول کر پڑھا۔ تو چہرہ سُرخ ہو گیا۔ اور جب آپ نے اُس کا کوئی تیسرا مقام پڑھا۔ تو آپ کے ہاتھ کانپنے لگے۔ آخر ضبط نہ کر سکے۔ آپ نے کتاب کو بند کر کے لمبائی میں پھاڑ کر اُس کتاب کے دو ٹکڑے کر ڈالے۔ اور پھر ایک ٹکڑے کو دوسرے پر رکھ کر اس کے

پھر دو ٹکڑے کر ڈالے اور چاروں ٹکڑوں کو ردّی کی ٹوکری میں ڈال دیا۔ اور آپ نہایت غضب آلود نگاہیں دیوار پر جمائے ایک آدھ منٹ بالکل خاموش بیٹھے رہے۔ میں بھی بالکل بے حس و حرکت بیٹھا تھا۔ اور ڈر رہا تھا کہ میری کوئی حرکت اُن کی توجہ کو ادھر مائل نہ کر دے۔ خدا کا شکر کہ خانساماں آگیا۔ اور اطلاع دی۔ کہ میز پر کھانا حاضر ہے۔ سرسید تو اُٹھ کر غسل خانے کی طرف چلے گئے۔ اور میں ردّی کی ٹوکری میں سے حقوق نسواں کے پھٹے ہوئے پُرزے اُٹھا اپنے کمرے میں چلا آیا۔ اور بوجہ رنج کھانے میں بھی شریک نہ ہُوا" +

یہ ہے قصّہ حقوق نسواں کے لکھے جانے کا اور اس بات کا۔ کہ سرسید کا خیال اس کے متعلق کیا تھا۔ مگر سید ممتاز علی صاحب کے دل میں سرسید کی جو عزّت عظمت اور قدر تھی اُس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے۔ کہ آپ نے اُن کے آزردہ ہونے کے خوف سے اُس کتاب کو آپ کی زندگی تک شائع نہ کیا۔ اور ہمیشہ سید صاحب ممدوح کی خوشی کو سب سے مقدم سمجھا +

دسمبر سنہ ۱۸۹۷ء میں دو برس کی خاموشی کے بعد سید ممتاز علی صاحب نے عقدِ ثانی کیا۔ اس عقد کی غرض و غایت یہی تھی۔ کہ عورتوں میں روشن خیالی پیدا کرنے اور تعلیم کا شوق پھیلانے کے لئے ایک زنانہ اخبار جاری کیا جائے۔ اور عورتوں کو ان کے حقوق شرعی واپس دلانے کا کام شروع کیا جائے + آپ کی دوسری اہلیہ معقول قابلیّت علمی رکھتی تھیں۔ اور جو کام ان کے سپرد ہونا تھا۔ اُس کی تیاری کے لئے انہوں نے لاہور میں آکر اپنی استعداد علمی بہت زیادہ کر لی۔ اس لئے مولوی صاحب نے سنہ ۹۸ء کے شروع میں زنانہ اخبار جاری کرنے کا قصد مصمم کر لیا۔ اور نہ صرف اخبار جاری کرنا چاہا۔ بلکہ اپنے اس کام کی مدد کے لئے ایک چھاپہ خانہ جاری کیا۔ اور مفید کتابوں کے شائع کرنے کے لئے دارالاشاعت قائم کیا + آپ نے اخبار مجوزہ کے لئے دس بارہ نام تجویز کر کے سرسیّد صاحب کی خدمت میں یہ دریافت کرنے کے لئے بھیجے۔ کہ وہ ان ناموں میں سے کوئی نام پسند فرمالیں۔ سرسیّد نے سرے سے اخبار جاری کرنے کی تجویز کو ناپسند فرمایا۔ لیکن یہ لکھا۔ کہ اگر آپ اخبار جاری کرنا ہی چاہتے ہیں۔ تو اس کے لئے مجھے ان ناموں میں سے کوئی نام پسند نہیں۔ اگر اخبار جاری کرتے ہو تو میری رائے میں اس کا نام تہذیب نسواں ہونا چاہئے۔ مگر میں پھر آپ کو کہے دیتا ہوں۔ کہ اگر آپ نے یہ اخبار جاری کیا۔ تو وہ ایک دن بہت نقصان اور تکلیف اور بدنامی کے بعد تمہیں بند کرنا پڑے گا + اس کے تھوڑے دنوں بعد ہی سرسیّد کا انتقال ہو گیا +

اسی سال سیّد ممتاز علی صاحب نے لاہور میں رفاہِ عام پریس جاری کیا۔ اور سب سے پہلی کتاب

جو آپ کی دار الاشاعت نے شائع کی۔ وہ حقوق نسواں تھی۔ اور یکم جولائی ۱۸۹۸ء سے تہذیب نسواں جاری کر دیا۔ جو اب تک خدا کے فضل سے جاری ہے۔ اب تیس سال ہونے کو آئے۔ جب یہ خطرہ ظاہر کیا گیا تھا۔ کہ زنانہ اخبار جاری کرنے کا ابھی موقع نہیں آیا۔ اور اس کا چلنا ناممکن ہے۔ مہر چند ابھی کوئی دوسرا زنانہ اردو اخبار ملک میں نہیں نکلا۔ مگر کئی زنانہ رسالے اس وقت جاری ہیں +

زنانہ تعلیم کے سلسلے میں جس میں کسی زمانے میں مرأة العروس اور بنات النعش کے سوا کوئی کتاب نہ پائی جاتی تھی۔ مولوی صاحب کی اہلیہ نے اس قدر کتابیں تصنیف کر دیں۔ کہ ان کی رہنمائی سے اب سیکڑوں اور کتابیں اسی نقش قدم پر تصنیف ہو رہی ہیں۔ نہ معلوم مولوی صاحب اپنی اہلیہ کے ذریعے کیا کیا قومی کام سرانجام دیتے۔ مگر تقدیر کی بات آپ کی اہلیہ کا ۱۹۰۸ء میں انتقال ہو گیا۔ مگر مولوی صاحب موصوف ان کے چلائے ہوئے کاموں کو برابر استقلال اور ثابت قدمی سے چلا رہے ہیں۔ اور آپ کے صاحبزادے سید امتیاز علی تاج نے امتیاز بیگم کو جو ان کی والدہ نے ان ہی کے لئے کسی زمانے میں لکھی تھی۔ نمونہ بنا کر ایسی ایسی مفید کتابیں بچوں کے لئے لکھ دی ہیں۔ کہ ان کی اشاعت سے مرحومہ کی روح خوش ہوتی ہوگی +

مولوی صاحب نے طبقۂ نسواں پر جو احسان کئے ہیں ان کا شکریہ ہم سے ادا نہیں ہو سکتا۔ اللہ تعالےٰ ان کو ان نیک کاموں کی جزائے نیک عطا فرمائے ہمیشہ خوش رکھے +

ایڈیٹر

آہ گرامی

ہندوستان کا آفتاب سخن غروب ہو گیا

فخر متقدمین و متاخرین حضرت مولانا غلام قادر صاحب گرامی ۲۷ مئی ۱۹۲۷ء کو بمقام ہوشیارپور انتقال فرما گئے + اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن

درشن

(حضرتِ چغتائی کا ایک روح پرور افسانہ)

"درشن" سر سے پاؤں تک طبع زاد ہے۔ مصور نے (کیونکہ یہاں رنگوں اور خطوں کی بجائے الفاظ سے مصوری کی گئی ہے) مجازی پہلو سے مادیت کی تشنہ ساز ناکامیابی کا ایک عبرتناک انجام دکھایا ہے۔ وہ بُت جو ظاہر بین عقیدت مندوں کی روح کو ایک خود ساختہ تسلّی کا سامان مہیا کر دیتے ہیں ایک سچے متلاشی کے لئے جو مسئلہ موضوعات کو دل کی کسوٹی پر پرکھنا چاہتا ہے ایک کھوکھلے فریب سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے ✦

ہم اس افسانے کی کامیابی پر حضرتِ چغتائی کو مبارکباد دیتے ہیں۔ بالخصوص اُن کے شاعرانہ استعارات پر اور اُن دلاویز فقروں پر جو جابجا انمول موتیوں کی طرح چمک رہے ہیں!! ——
مثلاً (افسانے کا ماحول ہندی ہے۔ اس لئے لغت بھی ہندی ہے) "اندھی اُولا کے من میں آنکھیں ناچ رہی تھیں!! ——" "مندر کا نام اُولا کے کان میں ایک کرن کی طرح تڑپ کر نکل گیا ——"
"دیوتاؤں کے بازو کیوں نہیں کھُلتے .... نورانی کرنیں میرے گرد کمندیں پھینک رہی ہیں!!! ——"
"مندر بڑا من موہن! راجہ کے ہاتھی کی طرح سجا ہوا جھومتا نظر آتا ہے! ——"

ایڈیٹر

جس گاؤں میں اُولا رہتی تھی نہ ایسا خوبصورت تھا نہ بہت بڑا۔ وہاں درخت بھی بہت کم تھے اور جو تھے۔ وہ بے وجہ آنکھوں کو دُکھتے ہوئے نظر آتے تھے۔ اور اُس تپسوی کی طرح جو ریاضت کرتے کرتے سوکھ کر رہ گیا ہو۔ مختلف آسنوں میں جُھکے ہوئے عبادت کا دم بھر رہے تھے!! ——
ہاں وہ دوشیزگاں جو قدیم آریاؤں کی بچی کھچی یادگاریں تھیں غیر محسوس عُریانی کے ساتھ چہل پہل کرتی ہوئی اس مختصر گاؤں کے اردگرد ضرور نظر آتی تھیں۔ اور ان ہی کی آواز ہو سکتی تھی جو کبھی کبھی شام کے سونے منظر میں کوئل کی میٹھی میٹھی راگنیوں کا کام دیتی تھی! —— گاؤں ان ہی کے دم سے زندہ تھا جس کے

سیدھے سادھے جھونپڑے۔ وہ بھی مالا کے بکھرے ہوئے دانوں کی طرح۔ راجگی جیسی مقدس بستی سے دُور خار کی طرح کھٹک رہے تھے!! — برہم پُتر اکی آنند موجوں کا شور ان کے کانوں میں نہ آتا تھا۔ اور نہ اس پوتر جل کی بھگت ان کے لیکھوں میں قسمت کی۔ تی نے لکھ رکھی تھی۔ برکھا ہوتی تھی۔ اسی پر اُن کا جیون تھا۔ نہ وہاں کوئی تہوار ہوتا۔ اور نہ گاؤں کے سادہ دل لوگوں کو اپنے ہاں تہوار منانے کا دھیان آتا۔ وہ بُدھ مت کے کھلاڑی چھُوت چھات پر دل لگائے بیٹھے تھے۔ اُنہیں مذہب کی ذرا فکر نہ تھی۔ ہاں وہ بڑے محنتی تھے۔ اپنے مویشیوں سے کسی طرح کم محنت نہ کرتے تھے۔ اُن کی ہری بھری سُرخ و سپید ٹانگیں ہر وقت کھیتوں کو ناپتی ہوئی نظر آتی تھیں۔ باوجود اس مشقت کے بھی وہ دھیان گیان کے پکے صبح و شام پوری کے مندروں میں جاتے۔ کبھی یگ منانے کبھی مندر کی سیوا سے دماغوں کی تھکن دُور کرنے +

وہ سادہ لوگ تھے۔ اور بزرگوں سے سُنی ہوئی باتوں اور رٹے ہوئے منتروں پر جان دیتے تھے۔ جب یاترہ ہوتی۔ پوجا پاٹ کے دن آتے۔ دھن کے پیارے۔ دھن سے دھن الگ کرتے اور اس سنسار کو تیاگنے اور ویراگ کے لوبھ میں جیون کے خوش کرنے کو سب پونجی لے کر۔ یہ سوچتے سمجھے تہوار منانے کو چلے جاتے تھے۔ ستاروں کا ہیر پھیر۔ چاند سورج کا دورہ۔ جب اُنت کے پروہتوں میں طے پاجاتا تو وہ جوق جوق گاؤں سے مندروں کی سمت اُٹھ بھاگتے۔ جب گروہ کے گروہ پنچائتوں کی صورت میں گاؤں سے رخصت ہوتے تو اُنہیں یہ احساس ضرور ہوتا کہ ہمارا گاؤں دیوتاؤں کے کرم سے اسی طرح دُور پڑا دُکھ بھوگ رہا ہے جس طرح کسی راج رانی نے اپنے کنور کو تیاگ دیا ہو +

ان دنوں جب وہ گاؤں سے چلے جاتے۔ تو گاؤں میں کچھ مویشی۔ بہت سے بوڑھے۔ اندھی لڑکی اُولا سمیت اپنے کرموں کا لیکھن سوچنے میں اونگھتے ہوئے نظر آتے +

اُولا جو مادر زاد اندھی تھی۔ اپنے خواب اور اپنی آرزوئیں اپنی ہم عمر الڑھ ہم جولیوں کے سامنے بلک بلک کر بیان کرکے شکستہ ہو چکی تھی +

خدا جانے اُسے کیا ضد تھی۔ وہ کیوں اس قدر بے کل تھی۔ خدا جانے اُس کے اندر کیا تھا۔ جو اُس کے من کو مسل رہا تھا۔ مندر کی یاد۔ مندر کو جانے کا لوبھ! — کوئی کیا جانے اُس کے من میں آنکھیں ناچ رہی تھیں!! —

اُسے یہ تمنا تھی۔ اندھی کی ایک ہی تمنا تھی۔ کہ وہ پوری کے مندروں کو جائے۔ اور دیوتاؤں کے

سینوں سے چھٹ کر آنند اور پریم کے پرتو میں کھو جاتے۔ اُولا کی تمنا۔ اُولا کی آرزو۔ بڑی موہن تھی۔ وہ تاروں کی دُنیا سے۔ آکاش کے دیوتاؤں کی سی بُجھتہ۔ دھرتی کو پلٹنے آئی تھی۔ وہ سمجھتی تھی کہ میری روح مندروں میں سہمی ہوئی روشنی کی طرح دیوتاؤں کے پیروں میں چھپی بیٹھی ہے۔ وہ مندر ضرور جائے گی۔ اُسے اس امر کا یقین تھا۔ ہم عمر لڑکیاں خصوصاً اُس کی بہنیں اس کی اس من اچھیا پر برسوں سے [illegible] مٹول کر رہی تھیں ؛

یہ سلسلہ کب تک جاری رہ سکتا تھا۔ آخر وہ دن آ گیا۔ اُولا سُرخ اوڑھنی میں لپٹی ہوئی۔ گاؤں سے نکلتی ہوئی مندر کو جاتی دیکھی گئی۔ وہ شلوک پڑھتی۔ گانا گاتی۔ لڑکیوں کے جُھرمٹ میں اُس بادلے راج ہنس کی طرح گردن اُٹھائے جا رہی تھی جو کیلاش کی سی جھیل کھو گیا ہو!!——

اُولا کا ہاتھ اُترا کے ہاتھ میں تھا۔ جو اُولا کی چھوٹی بہن تھی۔ یہ دونوں ہم سفر کشاں کشاں مندر کو جا رہی تھیں۔ ساتھ والیاں بہت دُور نکل گئی تھیں۔ یہ دونوں پیچھے پیچھے اُن کا مُنہ دیکھنے کو ترس رہی تھیں۔ ساتھ والیوں کو نہ اُولا کے سفر کی حقیقت معلوم تھی۔ اور نہ اُس کی سی اُمنگ میں دلچسپی تھی۔ اُترا چھوٹی تھی۔ اور وہ بھی اُولا سے تنگ۔ اُولا اُترا کو، اور کبھی اُترا اُولا کو کھینچتی۔ یہ سلسلہ ختم ہونے میں نہ آتا تھا۔ اُولا نے جو محسوس کر سکتی تھی بہت کوشش کی ہو گی۔ کہ میں اُترا کے لئے بوجھ نہ بنوں۔ مگر مجبور اُولا نے اُترا کے کھچے ہوئے ہاتھوں کو سرد تر محسوس کرتے ہوئے بڑی احتیاط برتی کہ کسی طرح اُترا کی تکلیف برکی ہو جائے۔ مگر بے سُود۔ لیکن اب اُترا اُولا سے اس قدر ناراض نہ بیزار نہ تھی۔ [illegible] ساتھ والیوں پر غصہ آ رہا تھا۔ نہ اُنہیں اُولا کے اندھے ہونے کا خیال تھا۔ نہ اُترا کے چھوٹے ہونے کا دھیان۔ آخر کب تک دو بندھی ہوئی کشتیاں جذبات کے بہاؤ میں چل سکتی تھیں۔ درد کی ماریاں [illegible]

اُترا نے کہا [illegible] اب اگر ہم اپنے گھر مندروں سے موڑیں تو پاپ کا کارن بن جاتا ہے۔ جانے یہ منزل کب ختم ہو گی ؟

اُولا نے جھومتے ہوئے مقصد کی کھوج میں اُترا سے کہا۔ "سمجھو اُترا! یہ پُرخار راستہ اور گرم گرم دُھول پریم کی مایا ہے۔ اب ہمارے بس کی بات ہے جس قدر چاہیں لُوٹ لے جائیں۔ میں مندروں میں دھرم پالن ڈھونڈنے نہ جاؤں گی۔ میں اپنے من کا اُبھار جو بن مانے نہ رہے گا۔ مندر پہنچاؤں گی۔ اور یہ گھر جو باہر سے سیاہ اور اندر ہی اندر درشن کی اُمنگ میں درپن ہو رہا ہے۔ اُس ٹکسال پر ضرور پرکھنے جاؤں گی جو دیوتاؤں کی آگیا سے تیار کیا گیا ہے۔ یاد رکھو اُترا! تپسیا کی مالا کھ کے کارن یہ نہیں۔ وہ تو اندر ہی اندر آنکھوں کی اوٹ میں

دانہ دانہ ہوکر پریم کا نام جپتی ہے۔ اب مہا مورکھ ہی ہوں جو مُنہ موڑیں۔ میرا تو وچار ہے یہ مَنُ جیسی جنس اُس سُکھ کے جیون پر رکھ آؤں گی جہاں دیوتاؤں نے اپنے ناچنے کے لئے ایک اونچا استھان بنا رکھا ہے" +

اُن کی ساتھ والیوں نے جب اُنہیں بہت دیر تک اپنے پیچھے نہ دیکھا تو اُنہیں اُولا کی فکر ہوئی۔ اُنہوں نے اپنے اس کرم کو شرم سے دیکھتے ہوئے اِدھر اُدھر کی باتیں بنائیں۔ جیسا اکثر گاؤں میں اس کے ساتھ بے کاری کاتنے کے لئے جمع ہوکر بنایا کرتی تھیں۔ مگر اُولا کو جس کی آتما کی سی بستی میں پریم کی شکتی بیٹھی ایشور کے گائن اور دیوتاؤں کی شبیہہ تیار کر رہی تھی۔ اس راہ میں کیا سُوجھتا! ـــ نادان سر پر تک تولُٹا بیٹھی تھی۔ یہ مادر زاد اندھی پربھو کی دُنیا میں اُڑنا چاہتی تھی۔ پر مندر بہت دُور تھا۔ کسی نے پوچھا:"اُولا مندر جاؤگی تو کیا دیکھو گی"؟ کسی نے کہا۔"اولا تیرے من کی اِچھیا پھولوں کی سی ہے"۔ کوئی کہتی"اُولا پھولوں کو کیا سمجھے۔ پھول کیسے۔ اور پھولوں کے رنگ کیسے ہوتے ہیں!"ـــ

اُولا کے دل پر ایک چوٹ لگی۔ درد بھری بولی:"پھول! ہاں میں کیا جانوں۔ ہاں میں محسوس کر سکتی ہوں سنو۔ میں خوشبو سے ان کی رُوح تک پُہنچ سکتی ہوں۔ ان کے نئے نئے مَن مانے نام رکھ سکتی ہوں" +

کوئی سمجھی۔ کوئی نہ سمجھی۔ کسی نے سُنا۔ کسی نے نہ سُنا۔ مگر اُولا کو اپنی آرزوں میں کافی چمک نظر آئی۔ اور جس طرح سے بن پڑا اُس تنگ پگڈنڈی پر اپنے خیالات سے اُلجھتی ہوئی چلی گئی +

اُترا اُولا سے اب ہمدردی برت رہی تھی۔ اور وہ سارے مناظر جو مندر کی راہ میں دیکھے جا سکتے تھے اُولا کو سمجھائے جاتی۔ اور جب اُولا مندر کا پوچھتی تو وہ اپنے گُنا وہ لبوں سے جھٹ کہہ دیتی"یہ مندر اب دُور نہیں۔ تم بہت بلد مندر کی سیڑھیوں پر سے گذر کر اُس کے چھوٹے چھوٹے دروازوں میں سے ہوتی ہوئی دیوتاؤں کے درشن کو پہنچ جاؤگی" +

درشن کے لفظ نے اُولا کو اُس پھول کی طرح تھرّا دیا۔ جو کسی بے درد پرند کی منقار سے پتّی پتّی ہوکر لرزتی ہوئی ٹہنی سے جُدا ہوگیا ہو!! ـــ شاید اُولا کو آنکھوں کا خیال آیا جس سے اُس کا مُنہ اُترا کی طرف پھر گیا۔ اور قدم اُٹھنے سے رُک گئے +

اُترا نے کہا:"اُولا مندر دیکھنے کے قابل ہے۔ میں نے بھی ایک دفعہ دیکھا ہے۔ بڑا من موہن! راجہ کے ہاتھی کی طرح سجا ہوا جھومتا نظر آتا ہے۔ میں بہت چھوٹی تھی۔ مگر اُس کی یاد اب تک تازہ ہے جو کبھی بھولنے میں نہیں آتی۔ وہاں کچھ اندھیرا ہے اور اُس میں روشنیاں ناچتی پھرتی ہیں!! ـــ"

اندھیرے کا خیال اور مندر کی بناوٹ اُولا کو اُلجھن میں ڈال رہی تھی۔ کہنے لگی:"کیا وہاں اندھیرا ہوتا ہے۔ اُترا! جیسے میں تمہیں دیکھ نہیں سکتی"+

اُترا نے کہا:"اُولا اُس کے اندر اگر بتیاں جلتی ہیں۔ دُھوپ دُھکتے ہیں"+

اُولا نے کہا:"اگر بتیاں جلتی ہیں! کیا دیوتا روشنی نہیں پھینکتے"؟

اُترا جس کے لئے یہ سوال بالکل انوکھا تھا چُپ تھی!!—

ساتھ والیاں اب اُنہیں دیکھ بھی نہ سکتی تھیں مگر وہ دونوں ماں جانیاں برابر چلی جا رہی تھیں +

اُترا نے کہا:"ہم ساتھ والیوں سے اس قدر دُور ہیں۔ جس قدر وہ مندر کے قریب"+

یہ سُن کر اُولا نے دو تین قدم اس تیزی سے اُٹھائے جیسے وہ پانی کے سطح پر تیر رہی ہے۔ اُترا نے سمجھا اُولا کو پَر لگ گئے ہیں۔ کیونکہ مندر کا نام اُولا کے کانوں میں ایک کرن کی طرح تڑپ کر نکل گیا۔ جس سے اُس کے لبوں پر ایک پُرکیف تبسم نمودار ہوا۔ جسے اُترا نہ سمجھ سکی +

اُولا نے کہا:"اُترا۔ مَیں اور میرا مَن اپنی اُس تپسیا کو جو برسوں سے اس گھر میں جمع کر رکھی ہے دیوتاؤں کے چرنوں پر نا دانوں کی طرح۔ گنگوں کی زبان میں۔ بر دان چڑھا آئیں گے۔ اور وہ اسے من میں رکھ کر اپنا سُندر سُندر مُکھ مجھ پریم کی باؤلی کے ماتھے پر رکھ دینگے۔ میں لرزتی رہوں گی۔ پھر اُترا تم سمجھو نا۔ میں کیا سے کیا ہو جاؤں گی۔ اُترا۔ میری اُترا۔ تم اُس وقت میرے ساتھ۔ میرے پہلو میں مالتی کے اُس پھول کی طرح لگی جھومتی رہنا۔ جسے آکاش کی۔ رس بھری ہواؤں نے جُھلا دیا ہو!!——"

اُترا کیا سمجھتی۔ اُس نے ان درد بھرے لفظوں کے جواب میں صرف اُولا کا ہاتھ ذرا زور سے دبایا اور وہ اتنے میں بہت دُور نکل گئیں +

وہ اُولا جس کے لئے ساری دُنیا ایک شیشے کے مانند سمٹتی اور کُھلتی جا رہی تھی۔ ایسی معلوم دیتی تھی جیسے کنول کے پتے پر امرت بے کل ہو رہا ہو۔ یا وہ دولت جو ایک کلی نے راز بنا کر چُھپا رکھی تھی۔ گُل کے پہلے ہی تبسم نے پریشان کر دی ہو +

اُترا اور اُولا بہت دُور نکل گئیں۔ اُترا نے جلدی سے کہا:"اُولا۔ لو مندر آ گیا! وہ سب سیڑھیوں پر ہمارا انتظار کر رہی ہیں"+

مندر کی سیڑھیاں اُولا کے لئے بالکل نئی بات تھی۔ وہ بیٹھ گئی اور بہت دیر تک اُنہیں ٹٹولا۔ اُس نے

وہاں کی مٹی ٹیکھی۔ اُس نے پیشانی پر رکھ لی۔ پیشانی کو پتھر پہ رکھا! — صرف اپنی آرزوؤں کی تسلّی کے لئے۔ اپنی رُوح کی تسکین کے لئے اُس نے کیا کچھ کیا۔ یہ اُسی کا دل جانتا تھا۔ وہ بے آہٹ دبے پاؤں چڑھتی گئی۔ اُسے دروازوں سے آنے جانے کا دھیان تک نہ آیا۔ وہ ضرور سمجھتی تھی کہ وہ اپنی تمنّاؤں سمیت دھرتی سے اوپر ہی اوپر اُٹھتی جا رہی ہے۔ اُس کے پہلو میں ایک درد۔ ایک آس تڑپتی ہوئی۔ کروٹیں لے رہی تھی۔ اب وہ مندر کے وسط میں کھڑی تھی سنگین دیوتا اُس کے سامنے سمادھی لگائے ایک پُراسرار مخموری دائمی میں محو تھے۔ وہ دیوتا تھے۔ جن کو سنگ تراشوں نے اپنے فن کے کمالات لافانی بنا دیا تھا۔ جذبہ آرزو کی حدّت اُولا کے لبوں پر پھول کے موتیوں کی طرح لرز رہی تھی۔ اور وہ اپنی سرد مہری میں گم۔ نازاں بازوؤں کو دبائے خدا جانے کیا کچھ کر رہے تھے!! —

وہ دیوتا تھے۔ جن کے سامنے اُولا لاکر کھڑی کر دی گئی تھی۔ اُس کی خندہ پیشانی جس پر گُندھے ہوئے بال پلکوں تک اور اکثر اس سے نیچے رُخساروں تک پریشان پڑے لٹکتے اور لٹکتے رہتے تھے!! — آج وہ سنو نیر لیتے۔ گری سے تو کچھ کہتے کچھ دیکھتے ہی نہ تھے!! —

اُولا ابھی تک خاموش تھی۔ مگر اُس کے اندر پریم کی دنیا جاگ رہی تھی۔ اور وہ خود چُپ چاپ زیرلب تمنّاؤں کو لئے اُس آنسو کی طرح تھی جو پلکوں میں دھڑکنے کے اندر سما جانے کے لئے ڈھلکتا ہوا نظر آتا ہے!! — اُس نے کچھ لفظ بھی کہے [illegible] ۔ مگر سب کچھ نہ تھے۔ اُس کے لب ہلتے تھے۔ مگر انہیں کون سمجھ سکتا تھا +

اولا کا زور اُن زور آزماؤں [illegible] دیوتاؤں کی [illegible] تھا!! — اُس کا دل جھکا ہوا دیوتاؤں کی [illegible] محبت [illegible] تھا۔ اُس کا جوش آنکھوں کی راہ میں [illegible] ناگوں کی طرح لوٹ رہا تھا +

وہ اندھی تھی۔ اُس کا کوئی آنسو نہ تھا۔ اُسے یقین تھا۔ کہ دیوتا میری چُپ کے جواب میں ابھی اپنے لمبے لمبے بازو۔ ماتا کے بازوؤں سے زیادہ سبک کل۔ پریم میں گرمائے ہوئے۔ میرے اردگرد پھیلا دیں گے جو ہوا کی طرح لہراتے ہوئے مجھے اپنے جنگل میں لے کر دھڑکتے ہوئے سینے سے لگا کر اس لمس سے جیسے میں اندھی مدتوں سے محسوس کر رہی ہوں لپیٹ کر شانتی جیسی دولت سے ڈھانپ دیں گے!! — اور میں اپنی آرزوؤں میں لپٹی ہوئی آنند کی دنیا میں جہاں اُن کے سوا کوئی نہیں۔ داسیوں کی طرح رقص کرتی نظر آؤں گی +

یہ جذبات سے لبریز رقص اُن کی مُسکراہٹ اور میرے اطمینان کا پیغام بن جائے گا +

اُس نے یہ محسوس کرتے ہوئے اپنے پتلے پتلے خوشنما ہاتھوں کو دیوتاؤں کی طرح کھولا۔ اور بار دُوں کو اپنی آرزؤں کے مانند کانپتے ہوئے اُٹھایا۔ جو ایک ضرب شدید کھا کر رہ گئے +

جاتریوں اور پجاریوں نے عقیدت اور احترام کے خوف سے یک زبان ہو کر کہا۔ ”دیوتاؤں کو نہ چھونا! دیوتا خفا ہو جائیں گے“

اُولا کے ٹوٹے ہوئے دل کی لغزشوں نے ٹٹولتے ہوئے کہا ”کیا؟ ۔ یہ میرے گاؤں کے پتھروں سے بھی سخت کیا ہے؟ میں دیوتاؤں کا رس اوتاروں کا پریم برسوں سے محسوس کر رہی ہوں ۔ میری رُوح اُڑی جاتی ہے ۔ دیوتا کہاں ہیں؟“

ایک پُر حسرت خاموشی چھا گئی ۔ ایک سانس تک سنائی نہ دیتا تھا ۔ جو اُس کی بے چارگی اور مایوسی کی رہبری کر سکتا ۔ اُس نے کئی بار کہا ۔ اُس نے بار بار ٹٹولا ۔ مگر پجاری چپ تھے ۔ اور سکوت کامل تھا ۔ اور وہ قوتیں جن سے زندگی زندگی ہے ۔ سکوت کے دُھندلکے میں گم ہوتی جا رہی تھیں! ——

اُس نے دبی ہوئی آواز میں لڑکھڑاتے ہوئے کہا ”دیوتا کہاں ہیں؟ میں آنسو نہیں رکھتی ۔ میں زبان ہی زبان رکھتی ہوں ۔ دیوتاؤں کے بازو کیوں نہیں کھلتے؟ اور میں کیوں اُن کے مقدس ہاتھوں میں اُس ساز کی طرح نظر نہیں آتی جو ہزاروں نغموں کا مخزن ہے ۔ میں اپنے سوز میں دیوتاؤں کی سی آرزوئیں ۔ من کے اندر ۔ بے نوری کے پردے میں چھپائے رکھتی ہوں ۔ اُترا تم کیوں چپ ہو؟ تم تو مجھے سفید سُرخ پھولوں کے فرق بتایا کرتی ہو ۔ آؤ نا ۔ میرے ہاتھ دیوتاؤں کے ہاتھوں میں دے دو ۔ میں تو خوابوں کی دُنیا میں گم ہوتی جا رہی ہوں ۔ اُترا میں مری جاتی ہوں ۔ دیوتا کہاں ہیں؟ دیوتا کہاں گئے؟ لو دیکھو وہ روشنی تیرے پریم کی سی روشنی ۔ میری اندھیری دُنیا کی طرف بڑھتی آ رہی ہے ۔ اُترا میں محسوس کر سکتی ہوں ۔ بیان نہیں کر سکتی ۔ آہ ۔ میں جنم کی اندھی! کیا دیوتا خفا ہو گئے ہیں؟ لو اور دیکھو نورانی کرنیں میرے ارد گرد کمندیں ڈال رہی ہیں ۔ لو وہ مجھ سے لپٹ گئی ہیں ۔ اُترا دیکھو تو سہی ۔ میری آنکھوں سے دیکھو!! —— تم کیوں چپ ہو؟ میں روشنیوں میں تیر رہی ہوں ۔ میرا قلب مسرتوں کے طوفان میں ہے ۔ ہزاروں آنکھوں سے سمجھو آنکھوں کی دُنیا ہے ۔ اور وہ اُس میں رقص کر رہا ہے! اور میں بھنور کے سانسوں میں جال میں اُلجھی ہوئی مچھلی کی طرح اُس دُنیا کے کنارے پر پڑی سسک رہی ہوں ۔ آہ میں سستا رہی ہوں ——“

یہ کون سمجھے وہ کس کی گود میں پڑی سسک رہی ہے!! ——

چغتائی

رُوپرٹ بُرک

RUPERT BROOKE

(1887—1915)

(از جناب محمد دین۔ تاثیر۔ ایم۔اے)

پٹوفی کے متعلق حضرتِ علامہ تحریر کرتے ہیں: "شاعرِ جوانمرگِ ہنگری۔ کہ در معرکۂ کارزار درحمایتِ وطن کشتہ شد و نعشِ او نیافتند۔ تا یادگارِ خاکی از و بماند" +

حضرتِ اقبال نے اُس کی نعش کے نہ پائے جانے کی ایک نادر توجیہ پیش کی ہے!

بنوائے خود گم استی سخن تو مرقدِ تو ✦ بہ زمیں نہ باز رفتی کہ تُو از زمیں نبودی

پٹوفی کی طرح رُوپرٹ برک . . . عین عالمِ شباب میں (بحیرہ روم کے ایک دُور دراز جزیرے میں) جنگِ عظیم کے مصائب کا شکار ہوگیا۔ یہ جوانمرگ شاعر دنیا میں فقط اٹھائیس برس زندہ رہا۔ مگر انگریزی شاعری کی تاریخ میں اس کا نام بالدوام رہے گا +

بُرک اپنی اس غریب الوطنی کی موت کے متعلق پیشگوئی کرتا ہوا۔ ایک نظم "(فوجی)" میں لکھتا ہے:—

"میں اگر مر جاؤں تو میری نسبت بس یہی خیال کرنا۔ کہ کسی اجنبی ملک کا ایک گوشہ ہمیشہ کے لئے انگلستان ہوگیا ہے۔ اس گراں بہا زمین میں ایک گراں تر تودہ خاک مخفی ہے۔ وہ جسے انگلستان نے جنا۔ صورت دی۔ شعور بخشا .... اور یہ خیال کرنا۔ کہ یہ دل تمام برائیوں سے مبرّا۔ ذہن ابدی کی ایک نبض، ان ہی خیالات سے دھڑک رہا ہے۔ جو اسے انگلستان نے عطا کئے تھے!! ...."

رُوپرٹ برک شاعری کے اعتبار سے شیلے اور کیٹس کا ہم پلہ نہیں۔ مگر اس اعتبار سے۔ کہ اُس کے دَم سے شاعری کے مُردہ جسم میں نفوسِ حیات پھر تیز تیز چلنے لگے۔ غالباً اس کا رُتبہ وَرڈزوَرتھ سے کم نہیں +

اُنیسویں صدی میں انگریزی شاعری زیادہ تر ترنّمِ الفاظ اور قوافی کا اُلٹ پھیر بن کر رہ گئی تھی۔ جذبات اوّل تو مفقود تھے۔ اور اگر تھے تو دورِ انحطاط کی جملہ بداعتدالیوں کا نمونہ تھے۔ شعرا نیکی کو محض اس لئے مقہور گردانتے



رُوپرٹ برُک

کہ یہ فرسودہ ہوچکی ہے۔ اور بدی کو محض اس لئے مرغوب سمجھتے تھے۔ کہ یہ جادۂ عام سے الگ ہے۔ اُور تو اُور یہ جدّت پسندی بہت جلد بدی سے بھی سیر ہوگئی۔ اور جذبات کے پیاسے شعرا بلند آواز سے فریاد کرنے لگے ؎

دُردآشامی زجامِ معصیت ہم کردہ ام   جدّتے خواہم دگر بیداریِ احساس را (تاثیر)

اس دَور میں شاعر نہ فطرت کا مطالعہ کرتے تھے اور نہ دل کا۔ فطرت سے گریزاں اس لئے تھے۔ کہ وہ خوب جانتے تھے۔ کہ یہ راستہ منزلِ مقصود کی طرف نہیں جاتا۔ اور دل سے رُوگرداں اس لئے تھے کہ اُن کا دل احساسات سے عاری ہوچکا تھا۔ اگر کوئی احساس تھا تو وہ عدم احساس کا احساس تھا!! —— سُون بَرن کی شاعری جس میں جابجا "ہوس کے سُرخ پھولوں" کو "نیکی کی زرد و سپید کلیوں" پر ترجیح دی گئی ہے تمام تر اسی فقدان کی مرثیہ خواں ہے +

بُرک کی نشوونما بیسویں صدی کی ابتدا میں ہوئی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب نقاد عام طور پر یہ کہہ رہے تھے۔ کہ مادّیت کے عروج نے شاعری کا جو تمام لطافتوں کی روح ہے "گلا گھونٹ دیا ہے" مگر یہ جواں سال شاعر ماحول سے متاثر نہ ہوا اور اس نے ہمّت نہ ہاری۔ اور اپنے شاعرانہ جذبات کے اظہار کے ساتھ ساتھ یہ بھی سوچتا رہا کہ اس تاریکی اور جہالت کے دَور میں شاعری کے بجھے ہوئے چراغ کو کس طرح دوبارہ جلایا جائے۔ اس فکر میں وہ اکیلا نہ تھا۔ رفتہ رفتہ اس کے اِرد گرد بہت سے جاں باز پروانے جمع ہوگئے۔ جو شاعری کی شمع کے خاموش ہوجانے سے بہتر اس بات کو سمجھتے تھے۔ کہ ان کے بدن میں شعلۂ حیات ہمیشہ کے لئے افسردہ ہوجائے +

بُرک اوّل اوّل یہ سوچا کرتا تھا۔ کہ خود ہی بیس تیس نظمیں لکھے اور انہیں مختلف ناموں سے ایک کتاب کی صورت میں شائع کردے۔ مگر اس امر کی ضرورت نہ رہی۔ کیونکہ اب اس کے ساتھ Ambercrombie Drinkwater اور Gibson وغیرہ تھے۔ بالآخر ۱۹۱۱ء میں بُرک کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے اس گروہ نے ؎

دل اب تو عشق کے دریا میں ڈالا   تَوَکَّلْتُ عَلَے اللّٰہِ تَعَالٰے

کہہ کر ایک کتاب "جوجیئن پوئٹری" (Georgian Poetry) کے نام سے شائع کردی۔ یہ وہ عہد تھا۔ کہ کوئی تاجرِ کتب خالص شاعری تو کیا کوئی شاعری نما مجموعہ بھی شائع کرنے کی جُرأت نہ کرتا تھا۔ یہی وجہ ہے۔ کہ شاعری کی تاریخ میں ایڈورڈ مارش کا نام محض اسی لئے لیا جاتا ہے۔ کہ اُس نے اس تجویز کی سرپرستی قبول کی +

یہ کتاب گویا ایک چنگاری تھی۔ کہ جس سے تمام مخفی بارُود کے ذخیرے شعلہ زن ہوگئے۔ اور اُس

ادبی جمود کا ہوّا لوگوں کے دلوں سے بالکل اُٹھ گیا۔ جس کے خوف سے کئی پست آوازیں ہمیشہ کے لئے بند ہوگئی تھیں۔ غرض مادیّت کے خس وخاشاک کا انبار، دیکھتے دیکھتے جل بل کر تودۂ خاکستر ہوگیا +

۱۹۱۱ء اور ۱۹۱۵ء کے درمیان انگلستان میں بیسیوں "مجموعۂ اشعار" اور "کتابچے" شائع ہوئے۔ اوکسفورڈ پوئٹری۔ کیمرج پوئٹری۔ اِتنے جسٹ مجموعہ۔ وھیلز۔ سمندر کی نظمیں۔ فطرت کی نظمیں۔ بچوں کی نظمیں۔ صوفیانہ نظمیں۔ مذہبی نظمیں۔ غرض ایک طوفان شاعری تھا کہ جسکے بہاؤ میں سب کچھ بہہ گیا۔ جنگ میں تو خیر ستم ہوگیا۔ ٹائمز جیسے پرچہ میں نظمیں بڑی نمائش کے ساتھ شائع ہونے لگیں۔ حالت یہ تھی۔ کہ جو تک بند چاہتا جنگ کے متعلق کچھ اُلٹے سیدھے شعر لکھ کر نہ فقط "شائع" ہونے کا فخر حاصل کرتا۔ بلکہ اپنی جیبوں کو بھی بھر لیتا۔ مگر یہ اندھا جذبہ قومی جنگ کے بعد فوراً ہی مرگیا۔ اور شاعری پھر اپنی اصلی رَو میں بہنے لگی +

افسوس ہے۔ کہ جس شخص نے یہ تمام جرچا کیا۔ اس کی شخصیت کے متعلق کوئی تسلی بخش تجزیہ ابھی تک شائع نہیں ہوا۔ برک غیر معمولی طور پر حسین تھا۔ اور لازمی طور پر ضدی اور اپنی بات کو منوا کر رہنے والا تھا۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ وہ اس احیائے شاعری میں اس قدر جلد کامیاب ہوگیا۔ مگر قدرت نے اُسے حُسن ظاہری کے ساتھ حُسن طبع بھی ودیعت کیا تھا۔ اور اگر اس کے لبوں، ناک اور ہاتھوں کی نازک تراش کو بغور دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ اس شبنم کے قطرے کی طرح تھا جو یاسمن کی آغوش کُش وہ نازک پتی پر نسیم صبح کے جھولے میں سورج کی پہلی کرن سے لرزاں لرزاں چمک رہا ہو +

میری یہ مراد نہیں کہ اس کی تحریر میں نسوانیت کی جھلک ہے۔ مگر بقول ڈرنک واٹر وہ غیر معمولی طور پر حساس تھا۔ جس کا اظہار اس کے انتخاب الفاظ اور انتخاب مضامین سے ہوتا ہے۔ وہ اپنے ہم عصر شعرا میں ایک خاص ترنم الفاظ اور طرزِ خیال کے لئے ممتاز ہے۔ اور بالخصوص اس میں انانیت جو عہد حاضرہ کی شاعری اور جملہ اصناف ادب کا خاصہ ہے۔ بہت نمایاں ہے۔ برک محض اپنے جذبات اپنی پسند اور اپنی ناپسندیدگی کا ترجمان ہے۔ خواہ وہ عاشقی کا مضمون ہو اور خواہ فطرت کا +

"CHILTERNS" میں وہ نہایت بے باکی سے عشق کی ناپائداری اور نئی دلبستگیوں کا اعلان کرتا ہے +

"دن اور رات" برک کی شاعری کا ایک عمدہ نمونہ ہے :-

—— "میرے دل کے محل میں اَن گنت خیالات کا ہجوم رہتا ہے۔ اور اے ملکہ تو وہاں

چُپ چاپ اور بچّوں کی طرح بڑی دانشمند بن کر ایک رفیع الشان تخت پر کمال تلطف جلوہ فرما ہوتی ہے۔ بڑی بڑی اُمیدیں سُنہری زرہ پہنے۔ مسخرے وہم۔ یاتری خواہیں اور بھکارن آہیں تیرے حضور میں فیضان برکت کے لئے دو زانو رہتی ہیں۔ اور یادیں متین اور جواہرات میں لدے ہوئے درباری دن بھر تجھے پوجتے ہیں اور چاہتے ہیں اور نگراں رہتے ہیں۔
لیکن جب میں سوجاتا ہوں اور میرے تمام خیالات درہم برہم ہو جاتے ہیں اور دن کا دَوْر دَوْرہ ختم ہو جاتا ہے اور اندھیرا چھا جاتا ہے۔ اے ملکہ تو اُس گھڑی دُھندلکے میں یاسمین کنواریوں کو جلو میں لے کر اپنے تخت کی رفعت سے جھومتی ہوئی کمال تبختر رات کی مملکت میں گذر جاتی ہے۔"

بہار آتی ہے۔ فطرت نئے ساز و سامان سے آراستہ ہوتی ہے۔ مگر شاعر کو ان مظاہر سے فقط اس قدر دلچسپی ہے کہ یہ اس کے باطنی ڈرامے کا ماحول ہے۔ یہ گیت ترجمے میں محض ایک کھوکھلی آواز رہ جاتا ہے۔
"بادِ صبا دبے پاؤں آگئی اور بہار کا ہنگامہ بپا ہوگیا۔
یاسمن کی شاخ سبز شگوفوں کے پھوٹنے سے اور میرا دل درد کے شگوفوں کے پھوٹنے سے لرزہ براندام ہے۔
میرا دل تمام جاڑوں میں کیسا بے جان پڑا تھا۔ اور تمام زمین مُردہ اور بے احساس تھی۔ یہاں تک کہ مجھے گمان تک نہیں تھا۔ کہ بہار آئے گی۔ یا میرا دل پھر کبھی بیدار ہوگا۔ مگر اب سردی کا طلسم ٹوٹ چکا ہے۔ زمین جاگ اُٹھی ہے۔ اور ننھے ننھے طائر پھر پکارنے لگے ہیں۔ یاسمن کی شاخ نے غنچے نکال لئے ہیں۔ اور میرے دل میں درد اُٹھ رہا ہے!!"
"مدارات" ایک غزل ہے۔ جس میں نظیری کے اس شعر کی نفسیاتی کیفیت بیان کی گئی ہے ؎

نوازشے ز کرم می کند محبت نیست　　　تواں شناختن از دوستی مدارا را

ایک ایسی ہی انفرادی رجحانات والی غزل اور ہے:-
"اب جو سارا قصہ طے ہو چکا ہے۔ مجھے تمہیں جانچنے کی فرصت مل گئی ہے۔ لیکن میں نہیں جانتا کہ تمہاری مدح کروں یا مذمت! کیونکہ محبوبہ کی مذمت چاہنے والے کی مذمت ہے۔ لیکن ترک کردہ چیز کی مدح کون کرتا ہے؟-"

یہ اشعار ایک ایسے ذہن کا نتیجہ ہیں جو احساسات کے ہیجان میں تفکر کو کام میں لا سکتا ہے۔ اور رقیق ترین جذبات کا تجزیہ کر سکتا ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان میں بداہت اور آمد نہیں ہوتی +

DUST ایک شعلۂ جوالہ ہے جو زندگی کی اس بے تاب روح سے لبریز ہے جس پر موت بھی غالب نہیں آسکتی ـــــ:

"جب ہم دونوں میں زندگی کا شعلہ افسردہ ہو جائے گا۔ ہم ذرہ ذرہ ہو کر بھی ہوا پر سوار ہوں گے اور دُنیا میں جا بجا رقص کرتے پھریں گے ـــ"

اس کا دل محبت کی شان و شکوہ اور رسمی دبدبے سے اُکتا گیا ہے۔ اور اب وہ ملکاؤں اور شہنشاہوں کے تخیل سے آزاد ہو کر سادگی اور بے ریائی کا تمنائی ہے ـــ:

"محبت؟ ہر کوئی کہتا تھا۔ محبت شاہنشاہوں کی شاہنشاہ ہے۔ اور کامرانی اس کے سر کا تاج ہے۔ اور زمین اس کے بازؤں کے سامنے شعلہ بن کر بھسم ہو جاتی ہے۔ اور چاند اور سورج گردنیں جھکا دیتے ہیں +

لیکن میں خوب جانتا تھا کہ مجھ میں اتنا پرتا نہیں۔ بھلا میں فلک الافلاک کی بلندیوں تک کیسے پہنچ سکتا ہوں! اس لئے میں جب کبھی کسی ملکہ سے دوچار ہوتا۔ فوراً آنکھیں چرا لیتا۔

'محبت۔ محبت! ہر کوئی کہتا تھا۔ محبت کا تحفہ کانٹوں کا تاج اور زہر کا پیالہ ہے'

لیکن میں غم پسند نہیں ہوں اور مسرت ہی پر قانع رہتا ہوں۔ اس لئے جب کوئی حزین حسینہ میری نظر پڑتی۔ میں دوسری طرف کترا کر نکل جاتا +

اس لئے میں نہایت مطمئن ہو کر بے خوف و خطر چلا جا رہا تھا۔ کہ تم مجھے راہ میں یا کھیتوں میں سے ہوتے ہوئے سرسری طور پر ملے۔ مجھے یہ کسی نے بھی نہ بتایا تھا۔ اور نہ میں جانتا تھا کہ یہ جو میرے ساتھ ساتھ ہے۔ یہی میرا محبوب ہے۔ تم ہی میرے محبوب ہو"

"ملاقات" بھی اس صوفسطائی تشکیک سے پاک ہے جو ادبیاتِ جدید کی ایک خصوصیت بن رہی ہے +

بُرک انگریزی شاعری کے مرجھا جانے والے کھیت میں ایک تازہ نفس نسیمِ بہار کی طرح آیا اور ہر بُنِ خار میں زندگی کی ایک نئی رُوح دوڑنے لگی۔ اٹھائیس سال کی عمر میں اُس نے ایک مختصر سا مجموعۂ نظم تیار کیا۔ مگر یہ مختصر سی یادگار اپنے اندر جدید انگریزی شاعری کی بہترین تحریکات کا مکمل مواد رکھتی ہے +

تاثیر۔ ایم۔ اے۔

نغمہ جذبات

(از مولوی سید ابو محمد ثاقب کانپوری)

گفتگوئے عشق بھی گویا طلسم راز ہے
جس کا آغاز انتہا ہے انتہا آغاز ہے

اک صدائے کیف پرور اک نوائے سرمدی
میرے ہر تارِ نفس میں زمزمہ پرداز ہے

مختصر یہ ہے مری بربادیوں کا تذکرہ
جس صدا میں درد ہو میری وہی آواز ہے

اے مغنیِ ازل! چھیڑ کوئی نغمہ جاں گداز
پھر ہر اک ذرہ جہاں کا گوش برآواز ہے

آشیاں بھی سامنے ہے رخصت صیاد بھی
ہاں مگر ذوقِ اسیری مانع پرواز ہے

کیوں ہے بیتابی تجھے وہ کوندتی ہیں بجلیاں
ہاں ادب اے دل کہ یہ اُن کی حریم ناز ہے

شاعری ثاقب کی ہے جس طرح اک سرِ حیات
ہستی موہوم بھی اس کی طلسمِ راز ہے

گنہگارِ آرزو

(دوارکا داس آرزو)

میں گنہگار ہوں اچھا میں گنہگار سہی
تیرا بندہ ہوں یہی بات فراموش نہ کر

دل سے اُٹھی ہے صدا دل میں اُتر جائیگی
تو نہ سُن۔ تو نہ سمجھ۔ کان نہ دے۔ گوش نہ کر

ساقیا خیر ہو۔ اک جام بھی آجائے ادھر
ساغرِ چشم کی گردش ہی سے مدہوش نہ کر

غم سے لبریز ہے پیمانۂ ہستی اے خضر
زہر ہے زہر۔ اسے پھینک اسے نوش نہ کر

میری تقدیر مرے ساتھ ہے احسان نہ دھر
مجھ کو افکار سے اے دوست سبک دوش نہ کر

بچّوں کے لئے کتابیں

(از جناب سیّد امتیاز علی تاج بی۔اے)

رات کو ننھّی سعیدہ یک بخت اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ اور سہمی ہوئی آواز میں کہنے لگی۔ "امّی امّی۔ کمرے میں شیر پھر رہے ہیں"+

ماں بولی۔ "کچھ نہیں ننھی۔ کچھ نہیں۔ سو جاؤ"+ بچّی کو پاس لٹا کر تھپکنا شروع کر دیا۔ لیکن ماں کے "کچھ نہیں" کہنے سے ننھّی کی تسلّی نہ ہوئی۔ اور وہ دو گھنٹے تک نہ سو سکی+

دن کے واقعات پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوا۔ کہ ایک بی بی ملنے کے لئے آئی تھیں۔ اور جنگلی جانوروں کی تصویروں کی ایک خوبصورت سی باتصویر کتاب ننھّی کو بطور تحفہ دے گئی تھیں+ ننھی تمام دن بڑے شوق سے اس کتاب کی رنگین اور خوبصورت تصاویر کو دیکھتی رہی۔ اور ان تصاویر سے اس کے سادہ اور کمزور دماغ پر جو گہرا اثر پڑا تھا۔ وہ اس صورت میں ظاہر ہوا+

بظاہر یہ واقعہ معمولی معلوم ہوتا ہے۔ لیکن ماہرینِ نفسیات کی رائے ہے۔ کہ پختہ عمر لوگوں کی کئی عادات بچپن کے اسی قسم کے بظاہر معمولی اثرات کا نتیجہ ہوا کرتی ہیں+ ایسی متعدّد مثالیں موجود ہیں۔ کہ بعض لوگ بڑی عمر میں خاص خاص چیزوں سے متنفّر یا خائف رہتے ہیں۔ اور وجہ تحقیق کی جاتی ہے تو بچپن کا کوئی اسی قسم کا چھوٹا سا واقعہ معلوم ہوتا ہے۔ جس کا اُس وقت کسی نے خیال بھی نہ کیا تھا+

چونکہ سعیدہ کی ماں سمجھدار عورت تھی۔ اس نے بچّی کا دل بہلا لیا۔ اور مناسب باتوں سے اس کا ڈر دُور کر دیا۔ اور دو گھنٹے کے بعد ننھّی سعیدہ اپنی ننھّی سی گلابی ہتیلی پر سر رکھ کر اطمینان کی نیند سو گئی+ لیکن اس واقعے سے بخوبی ظاہر ہے۔ کہ جو کتابیں بچوں کے ہاتھ میں دی جاتی ہیں۔ وہ ان کے دل و دماغ پر کس قدر اثر کرتی ہیں+

ہم اپنے بچّوں کو پروان چڑھاتے وقت اس امر کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ کہ اپنے مقدور کے مطابق ان کی ضروریات کا بہترین سامان مہیّا کریں۔ ہم انہیں اچھّی سے اچھّی غذا اور اچھے سے اچھّا کپڑا تو دیتے ہیں۔ لیکن پڑھنے کے لئے جو کتابیں ان کو دی جاتی ہیں۔ ان میں ہم ذرا بھی احتیاط سے کام نہیں لیتے۔ حالانکہ

دل و دماغ کو متاثر کرنے میں کتابیں بہت بڑا حصہ لیتی ہیں +

ماہرین کی رائے ہے۔ کہ جو کتابیں بچوں کو پڑھنے کے لئے دی جائیں۔ اُن کا معیار ظاہری اور باطنی دونوں حیثیتوں سے بلند ہونا چاہئے۔ ظاہری محاسن میں سب سے پہلے اس امر کا خیال رکھنا چاہئے۔ کہ حروف خوب جلی اور خوشخط ہوں۔ عجیب بات یہ دریافت ہوئی ہے۔ کہ الفاظ کا جلی ہونا بچوں کے لئے اس قدر اہمیّت نہیں رکھتا۔ جس قدر سطروں کا درمیانی فاصلہ۔ یعنی قریب قریب لکھی ہوئی سطروں میں خواہ جلی قلم ہی استعمال کیا گیا ہو۔ بچہ انہیں آسانی سے نہ پڑھ سکے گا۔ اور قلم خواہ نسبتاً خفی استعمال کیا جائے۔ لیکن بین السطور زیادہ ہو۔ تو بچہ اسے آسانی سے پڑھ لے گا۔ چنانچہ بچّوں کے لئے جو کتابیں لکھی جائیں۔ ان میں سطریں باہم اس قدر دُور ہونی چاہئیں۔ کہ بچے کی آنکھ آسانی کے ساتھ ہر سطر کا علٰحدہ علٰحدہ خیال رکھ سکے، اگر سطریں قریب قریب ہوتی ہیں۔ تو بچہ ایک سطر پڑھ چکنے کے بعد پھر اُسی کو پڑھنے لگتا ہے اور پریشان ہو جاتا ہے + چھاپے کی روشنائی بہت سیاہ ہونی چاہئے۔ تاکہ سیاہ حروف کاغذ پر خوب نمایاں ہوں + اکثر کتابوں میں کاغذ اس قدر باریک لگایا جاتا ہے۔ کہ ایک طرف کا چھاپا دوسری طرف سے جھلکتا دکھائی دیتا ہے۔ اور اس طرح سپید زمین پر سیاہ حروف کا مناسب اثر کھویا جاتا ہے +

بچوں کی آنکھوں کی تربیت خاص توجہ کی محتاج ہوتی ہے۔ اور اگر ذرا ذرا سی باتوں کو نظرانداز کر دیا جائے تو ان کی بصارت پر اس کا بہت بڑا اثر پڑتا ہے + شاید عام طور پر معلوم نہ ہو۔ کہ بارہ برس کی عمر تک بچے کی آنکھیں اس قابل نہیں ہوتیں۔ کہ کسی قریب کی چیز پر بخوبی جم سکیں + آنکھ کچھ اس طرح بنی ہے۔ کہ بڑی عمر میں بھی قریب کی چیز پر نظر جمانے کے لئے خاص زور لگانے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ یہ علٰحدہ بات ہے۔ کہ بڑی عمر میں لوگ اس طرح زور لگانے کے ایسے عادی ہو جائیں۔ کہ اسے محسوس نہ کریں +

کسی سمت خاص اور مختلف فاصلوں پر نظر قائم کرنے کے لئے آنکھوں کے عضلات کے نشو و نما کی ضرورت ہے۔ اور جب تک بڑے اعصاب جو ہاتھ پاؤں کی مناسب حرکات پیدا کرتے ہیں نشو و نما نہ پا جائیں۔ ان ننھے اعصاب کی باری نہیں آتی + بعض ماہرین جن وجوہ سے چھوٹی عمر میں بچوں کو نوشت و خواند کی تعلیم دینا مناسب نہیں سمجھتے۔ ان میں سے ایک یہ بھی ہے۔ اور اسی خیال سے بعض ممالک میں یہ دستور ہے۔ کہ چھوٹی عمر میں بچّوں کے عینک لگا دی جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے ان کی آنکھیں ضرر پہنچنے سے بچی رہتی ہیں۔ اور جوان ہونے پر عینک اُتار دی جاتی ہے +

تصاویر کے متعلق بھی خاص خیال رکھنا چاہیئے ۔ پانچ ۔ چھ یا سات برس تک کی عمر کے بچے کے لئے شیروں اور سانپوں اور مہیب چیزوں یا واقعات کی تصاویر ضرر رساں ہیں ۔ اور وہ عام طور پر ان کو پسند بھی نہیں کرتے ۔ اگرچہ تصویر کا اثر بہت کچھ اس بات پر منحصر ہوتا ہے ۔ کہ اس کے ساتھ عبارت کیا ہے ۔ یا اس کے متعلق بچوں کو زبانی کیا کچھ بتایا جاتا ہے ۔ تاہم عام اصول یہ ہونا چاہیئے ۔ کہ بچوں کی کتابوں میں اس قسم کی تصاویر ہوں ۔ کہ جب وہ سونے کے لئے لیٹیں ۔ تو ان کو یاد کر کے ان کا دل خوش ہو ۔ پھولوں ۔ چڑیوں ۔ خوب صورت بچوں اور اور ایسی سادہ چیزوں کی تصاویر ہوں ۔ جن کو اپنی روزمرہ زندگی میں وہ دلچسپی کی نظر سے دیکھتے ہیں ۔ کہیں کوئی بچی گڑیا لئے بیٹھی ہو ۔ کہیں کوئی بچہ باجہ بجا رہا ہو ۔ کہیں بائیسکل کی تصویر ہو ۔ کہیں گاڑی ہو ۔

بچوں کو شوخ رنگ بہت پسند ہوتے ہیں ۔ ان کے متعلق مشہور ہے ۔ کہ جس طرح زمانہ قدیم کے انسان بہت تیز رنگوں پر جان دیتے تھے ۔ اسی طرح بچے بھی ان پر فدا ہیں ۔ ایک دفعہ ایک کمیٹی نے بہت سے بچوں کی پسند کا امتحان لے کر یہ نتیجہ نکالا تھا ۔ کہ عام طور پر بچوں کو سبز رنگ بہت بھاتا ہے ۔ اور خصوصاً اس قسم کا سبز رنگ جیسا عموماً درختوں کے پتوں کا ہوتا ہے ۔ اس سے اتر کر لال ۔ نیلے اور پیلے رنگوں کی باریاں آتی ہیں ۔ اکثر لوگوں کو معلوم ہوگا ۔ کہ سبز رنگ آنکھوں پر بہت فرحت بخش اثر ڈالتا ہے ۔ تعجب کی بات ہے ۔ کہ بچہ اس رنگ کی پسند کا مذاق قدرت کی طرف سے لے کر آیا ہے ۔

اندریں حالات بچوں کی کتابوں میں شوخ رنگ کی تصاویر ہونی چاہیئیں ۔ اور ایسی تصاویر جن میں سبز رنگ نمایاں ہو ۔ تصاویر میں بہت سے آدمی یا بہت سی چیزیں گھچ پچ نہیں ہونی چاہیئیں سیدھی سادی کسی ایک چیز کی تصویر ہو ۔ اور اس میں ایسے رنگ ہوں ۔ جو بچے کو مرغوب ہوں ۔ اس قسم کی تصاویر اگر ان کی کتابوں میں اور ان کے کمرے کی دیواروں پر بھی ہوں ۔ تو بچے بہت خوش ہونگے ۔

اب ہم کتابوں کے باطنی محاسن پر توجہ کرتے ہیں ۔ گو ان خوبیوں کی کتابیں اردو زبان میں بہت کم ہوں گی ۔ لیکن لوگوں کو ان کی ضرورت کا احساس ہوگیا ۔ تو پیدا ہونے میں دیر نہ لگے گی ۔

بچے کی دلچسپی کی چیزیں اتنی بہت ہیں ۔ کہ ان میں سے چند کو منتخب کرنا بہت دشوار ہے ۔ بچوں کی تعلیم کا تازہ ترین اصول یہ ہے ۔ کہ انہیں کام اور کھیل میں فرق نہ معلوم ہو ۔ یعنی وہ یہ نہ سمجھنے پائیں ۔ کہ اب کھیل کا وقت تمام ہوا ۔ اور کام کی مصیبت شروع ہوگئی ۔ کام کو اس قدر دلچسپ اور دلفریب بنایا جائے ۔ کہ وہ اسے دوسرا کھیل سمجھ کر اس کی طرف بھی اسی رغبت سے متوجہ ہوں ۔ چنانچہ اب سبق کی کتابوں اور محض دلچسپ کتابوں کا

فرق دن بدن کم ہو رہا ہے۔ مصنفین پہلے اس بات پر غور نہیں کرتے۔ کہ بچوں کو کیا سنانا چاہیئے۔ وہ یہ سوچتے ہیں۔ کہ بچے کیا سننا چاہتے ہیں۔ وہ اپنی رائے پر عمل کر کے بچے کی فطرت پر بوجھ نہیں ڈالنا چاہتے۔ بچے کے رجحانِ طبع کا خیال کر کے اپنے اوپر جبر کرنا زیادہ مناسب سمجھتے ہیں ؂

بچے کی تعلیم و تربیت میں اور اسے پڑھنے کے لئے کتابیں دیتے ہوئے سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہیئے کہ وہ خود کس چیز سے دلچسپی لیتا ہے۔ جس چیز کو وہ خود پسند کرے۔ اس کے متعلق اسے بچپن ہی میں معلومات دی جا سکتی ہیں۔ مثلاً ایک سات برس کی عمر کا بچہ۔ رات کے وقت بستر پر لیٹ کر ستاروں کے متعلق باتیں کرتا ہے۔ اس بچے کو بڑی آسانی سے نظامِ شمسی کے متعلق موٹی موٹی ابتدائی اور دلچسپ باتیں سکھائی جا سکتی ہیں۔ بعض بچوں کو پھولوں کا بہت شوق ہوتا ہے۔ وہ پھولوں کے نام اور ان کے رنگوں اور موسموں کے متعلق معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔ ایسے بچوں کو اس قسم کی کتابیں پڑھنے کے لئے دی جائیں۔ جن میں ان چیزوں کی بابت بہت آسان۔ دلچسپ اور بامعنی سبق کہانیوں کے پیرائے میں ہوں ؂

ایک بڑی دقّت یہ ہے۔ کہ ہندوستان میں بچوں کی تعلیم کا ایک خاص پروگرام اس حد تک ہمارے دماغ میں اس قدر جگہ پا چکا ہے۔ کہ وہ اس سے سرمو تجاوز کرنا پسند نہیں کرتے۔ ان کی رائے میں ضروری ہے۔ کہ پہلے بچہ الف بے پڑھے۔ پھر عبارت میں اخلاقی پند و نصائح کا مطالعہ کرے۔ پھر پڑھنا شروع ہو وغیرہ وغیرہ۔ اگر بچے کی طبیعت اور اس کا فطری رجحان اس سانچے میں پورا نہیں اُترتا۔ تو کوشش کی جاتی ہے۔ کہ اسے زبردستی اس سانچے میں ڈھالا جائے ؂

تحریر میں دلچسپی لینے سے پہلے تقریر میں دلچسپی لینے کو مقدم سمجھنا اور ضرورت ہوتی ہے۔ کہ ان کو سیدھی چیزوں پر زبانی انہیں کچھ نہ کچھ معلومات دی جائیں۔ کھڑکی معمولی سادہ چیزوں کا انہیں بچہ ہر وقت دیکھتا ہے مطالعہ کرنا سکھایا جائے۔ اور بتدریج نوشت و خواند کی طرف متوجہ کیا جائے ؂

تجربوں سے معلوم ہوا ہے۔ کہ سات برس سے کم عمر کے بچے کا دماغ نہایت ابتدائی حالت میں ہوتا ہے۔ اور دُنیا اسے ایک پیچیدہ گورکھ دھندا معلوم ہوتی ہے۔ لیکن چونکہ وہ کچھ کچھ چیزوں کے سمجھنے کے قابل ہو جاتا ہے اس لئے بالطبع چاہتا ہے۔ کہ اردگرد کی تمام چیزوں کو فوراً سمجھ لے۔ ایسے موقعوں پر ضرورت اس احتیاط کی ہوتی ہے۔ کہ زیادہ چیزوں سے اس کا دماغ پریشان نہ کیا جائے۔ اگر اسے بہت سی چیزوں سے روشناس کیا گیا۔ تو وہ سب کچھ سمجھ لینے کے شوق اور جلدی میں ایک چیز کو بھی پوری طرح نہ سمجھے گا۔ اس لئے اس کی دُنیا کو

زیادہ وسیع کرنے کی بجائے اَوْر مختصر کر دینا چاہیئے۔ کہ وہ باری باری ایک ایک چیز کو خوب اچھی طرح دیکھے اور سمجھے۔ اور جب ان چیزوں سے پورے طور پر واقف ہو جائے۔ اور پیٹ بھر کر ان سے لُطف اُٹھا چکے۔ پھر اس کے مطالعے کی دُنیا بتدریج زیادہ وسیع کرتے جائیں۔ مثال کے طور پر گھروں میں مُرغیاں بلیاں۔ چڑیاں۔ وغیرہ جانور ہوتے ہیں۔ بچہ ان ہی کو دیکھے اور ان ہی سے کھیلے۔ اسے چڑیا گھر ہرگز نہ لے جائیں۔ ہاں جب بچّہ اپنے گھر کی سیر سے تھک جائے۔ اور وہاں کی چیزوں میں دلچسپی لینا چھوڑ دے تو پھر اسے چڑیا گھر دکھانا مناسب ہے۔

ان ذرا ذرا سی باتوں کا شروع ہی میں خیال رکھنے سے بعد میں حیرت انگیز نتائج نکلتے ہیں۔ اور اسی قسم کی بے پروائی کا نتیجہ ہے۔ کہ آج کل کے نوّے فی صدی بڑی عمر کے لوگ محض سطحی مطالعے کے عادی ہیں۔ اور بہت کم چیزوں سے کما حقّہ واقف ہوتے ہیں۔ انہیں بچپن ہی سے یہ عادت ہوتی ہے۔ کہ ایک چیز کا مطالعہ پوری طرح ختم نہیں ہونے پاتا۔ کہ دوسری چیز پر ہاتھ ڈال دیتے ہیں۔ اگر احتیاط سے کام لیا جاتا۔ تو انہیں بڑی آسانی اور بڑے مزے میں چیزوں کے مکمل مطالعہ کی عادت پڑ جاتی۔

عام اشیا کے بعد تصاویر کے مطالعہ کی باری آتی ہے۔ اگر بچے نے ایک چیز کو اچھی طرح دیکھا بھالا اور سمجھ لیا ہے۔ تو وہ کاغذ پر اس کی تصاویر دیکھتے ہی اسے پہچان جائے گا۔ اس کے دماغ کو زیادہ تکلیف نہ ہوگی۔ اور اپنی اس کامیابی سے اس کو بہت خوشی ہوگی۔ کچھ عرصے تک تصاویر کا مطالعہ کرنے کے بعد بچے کو معلوم ہو جائے گا۔ کہ چیزیں کاغذ پر نشانات کے ذریعے کس طرح ظاہر کی جاسکتی ہیں۔

جب یہ بات اچھی طرح ذہن میں بیٹھ گئی۔ تو بچہ حروف والفاظ کو بھی بہت دلچسپی کے ساتھ سیکھ لے گا۔ کیونکہ حروف بھی آخر آوازوں ہی کی تصاویر ہیں۔ اور یوں مادّی اشیا سے ہٹ کر وہ بآسانی خیالی اشیا کے مطالعے کی طرف راغب ہو سکے گا۔ اس اصول کو مدِّنظر رکھ کر اوّل گھر کی معمولی چیزوں سے۔ پھر تصویروں سے اور اس کے بعد الفاظ کے ذریعے اگر بچے کو بتدریج معلومات دی جائیں۔ تو یہ طریقۂ تعلیم بے انتہا مفید ثابت ہو۔

بعض عالموں کا خیال ہے۔ کہ دُنیا میں جس طرح انسان نے وحشیانہ زندگی سے بتدریج تہذیب و تمدّن کی طرف ترقی کی ہے۔ اسی طرح ہر بچہ اپنے وجود میں دُنیا کی یہ تمام تاریخ دُہراتا ہے۔ زمانۂ قدیم کے انسانوں نے رہنے کو ٹھکانے بنائے۔ دُنیا کی موٹی موٹی چیزوں کے نام مقرر کئے۔ آگ اور ہتھیار ایجاد کئے۔

جانور پالے۔ ا، دگر کی چیزوں کو سمجھا۔ سفر کئے۔ اس کے بعد خیالی چیزوں کی طرف رُخ کیا۔ اور ان میں مصروف ہوئے۔ یہی حالت بچّے کی ہے۔ وہ ترقی کے ان تمام مراحل میں سے چند سالوں میں گزرتا ہے۔ اس کے لئے بھی سمجھنے اور ایجاد کرنے اور سفر کرنے اور غور و فکر کے زمانے یکے بعد دیگرے اسی طرح آتے ہیں۔ جب اس کے سمجھنے کا زمانہ ہو۔ تو اسے سادہ سادہ چیزیں سمجھنے کی کتابیں دینی چاہئیں۔ جب ایجاد کا زمانہ ہو۔ تو ایسی کتابیں پڑھائیں۔ جن میں چیزوں کے بنانے کا بیان ہو۔ اور پھر سیر و سیاحت اور سفر کی دلچسپیوں کے حالات وغیرہ۔ جیسی ضرورت ہو۔

ہندوستان میں عام طور پر یہ خیال ہے۔ کہ ننھے بچّوں کے لئے کہانیوں سے زیادہ دلچسپ چیز اور کوئی نہیں۔ مگر بعض ماہرینِ تعلیم اس سے اختلاف رکھتے ہیں۔ اہلِ تجربہ نے معلوم کیا ہے۔ کہ کہانیوں سے پہلے ان میں ایجاد کا شوق پیدا ہوتا ہے۔ نیز ننھے بچّے کے لئے اپنی زندگی ہی اتنی واقعات سے پُر اور منہمک رکھنے والی ہوتی ہے۔ کہ اسے اَوروں کی زندگیوں یعنی کہانیوں پر غور کرنے کی فرصت ہی نہیں ہوتی۔ اگر بجائے کہانیاں سُنانے یا کتابوں میں سے پڑھانے کے انہیں ان کی سمجھ کے مطابق ننھی ننھی چیزیں بنانا بتایا جائے۔ تو وہ ان میں زیادہ دلچسپی لیں۔

اس کے متعلّق کوئی قطعی فیصلہ کرنا درست نہیں معلوم ہوتا۔ انسان کے دماغ میں مختلف خواہشیں اعصاب کے ذریعے پیدا ہوتی ہیں۔ یہ اعصاب تار کے جال کی طرح تمام جسم میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اور دماغ کے خاص خاص حصّوں میں ایک مرکزی مقام کسی خاص خواہش کا مرکز ہوتا ہے۔ جوں جوں یہ مختلف خواہشوں کے مرکز نشو و نما پا کر اُبھرتے ہیں۔ ان کے ساتھ وہ خواہشیں بھی ہوتی ہیں۔ جن کی جڑ ان مرکزوں میں ہوتی ہے۔ لیکن ان اعصابی مرکزوں کا نشو و نما ہر بچے میں یکساں وقت پر نہیں ہوتا۔ اس لئے ان کی خواہشیں اور شوق بھی آگے پیچھے اور کم و بیش ہوتے ہیں۔ چنانچہ جس عمر کے بچّوں کے لئے کتاب لکھی جائے۔ ضروری ہے۔ کہ پہلے تجربے سے اس عمر کے بچّوں کا رجحان طبع معلوم کیا جائے۔

یہ تمام باتیں اس لئے بیان کی گئی ہیں۔ کہ عام طور پر معلوم ہو۔ بچّوں کے لئے کتابیں لکھنا کتنے غور و خوض محنت اور تجربے کا محتاج ہے۔ اور جو لوگ صحیح اصولوں پر اپنے بچوں کو تربیت دینا چاہتے ہیں۔ وہ سمجھ سکیں۔ کہ انہیں بچّوں کے لئے کتابیں منتخب کرتے وقت ان میں کیا باتیں دیکھنی چاہئیں۔

عام طور پر بچّوں کے لئے جو کتابیں لکھی جاتی ہیں۔ ان میں سلاست سے کام لیا جاتا ہے۔ لیکن سلاست کے

یہ معنی نہیں۔ کہ کتاب میں عربی اور فارسی کے بڑے بڑے الفاظ نہ ہوں۔ ضرورت اس بات کی ہوتی ہے۔ کہ الفاظ خیالی چیزوں کے نہیں بلکہ مادی چیزوں کے ترجمان ہوں۔ ورنہ بچے تحریر سے لطف اندوز نہ ہو سکیں گے مثلاً بچوں کے لئے اس قسم کے فقرے بے معنی ہیں۔ کہ برائی کا نتیجہ برائی ہے۔ انہوں نے نہ کبھی برائی کو دیکھا ہے نہ نتیجے کو۔ چنانچہ وہ واضح طور پر اس بات کا مطلب نہیں سمجھ سکتے۔ لیکن اگر اس کی بجائے لکھا جائے "اگر تم نے کسی کے پتھر مارا۔ تو وہ بھی سامنے سے پتھر مارے گا" تو اس کا مطلب آسانی سے ان کے ذہن نشین ہو سکتا ہے +

ایک یہ خیال بھی بہت عام ہے۔ کہ بچوں کے لئے کتابیں مکالمے میں ہونی چاہئیں۔ چنانچہ مصنفین معلومات کے مضامین کے دو حصے دو لوگوں کی زبانی بیان کر کے اس فرض سے سبکدوش ہو جاتے ہیں + مکالمہ بیان سے زیادہ ثقیل اور بیان مکالمے سے زیادہ پُرلطف ہو سکتا ہے۔ اگر مناسب طریق پر محنت سے اور سوچ سمجھ کر تیار کیا جائے +

ایک اور نہایت اہم بات بچوں کی تعلیم میں یہ ہے۔ کہ خوف و شرم سے انہیں ایک حصہ جسم کی غرض و غایت سے بالکل تاریکی میں رکھا جاتا ہے۔ جس کے نتائج بعض اوقات بعد میں بہت برے نکلتے ہیں۔ یورپ کو بہت تلخ تجربوں کے بعد اس کو بھی روشنی میں لانے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اور اس قسم کے مضامین بچوں کے نصاب میں داخل کئے جا رہے ہیں۔ ہندوستانی ماں باپوں کو بھی چاہئے۔ کہ وہ اپنے بچوں کو مناسب الفاظ اور مناسب ڈھنگ سے ایسی نصیحتیں کرتے رہیں۔ کہ وہ کسی غلطی میں نہ پڑیں۔ یا انہیں اس قسم کی کوئی مناسب تصانیف پڑھائیں +

اس مضمون میں بچوں کی تعلیم کے متعلق بہت مختصر طور پر بعض مغربی ماہرین تعلیم کے خیالات ظاہر کئے گئے ہیں۔ گو مضمون تشنہ ہے۔ تاہم اس سے اتنا تو معلوم ہو جاتا ہے۔ کہ بچوں کی تعلیم و تربیت مغرب میں کتنا اہم مسئلہ ہے اور اس پر کس قدر غور و فکر کیا جا رہا ہے۔ مگر ہمارے ہاں آئندہ نسل بھیڑوں بکریوں کی طرح پرورش پاتی ہے والدین اتنا پوچھنے تک کی زحمت گوارا نہیں کرتے۔ کہ ہم بچوں کو کیا پڑھا رہے ہیں۔ وہ اپنے بچوں کی تعلیم کے اصول سے بے خبر مدرسین کے سپرد کر کے اپنے خیال میں ایک بڑے فرض سے سبکدوش ہو جاتے ہیں۔ اور ان کے جسمانی قوائے کو نہایت اطمینان سے برباد ہونے دیتے ہیں۔ نہ کسی کو بہتر تعلیم دینے کا خیال آتا ہے۔ اور نہ بچوں کے لئے اعلیٰ اصولوں پر کتابیں لکھی یا لکھوائی جاتی ہیں + اس مضمون میں ہندوستانی ماں باپ کو صرف آگاہ کیا گیا ہے۔ کہ ان کے بچوں کے آسان۔ دلچسپ اور اعلیٰ تعلیم کے لئے ان کی نصابی کتابوں کا سلسلہ کس روش پر ہونا چاہئے اگر انہوں نے اپنے بچوں پر ترس کھا کر اس ضرورت کو محسوس کیا تو ان کی توجہ یا اصرار مناسب کتابیں اردو میں پیدا کر سکتا ہے +

حضرت مولانا گرامی مرحوم ومغفور

ڈاکٹر سر محمد اقبال مدظلہ العالی کے خیالات

حضرت مولانا گرامی مرحوم ومغفور کے انتقال کی وحشت انگیز خبر سنتے ہی پنڈت ہری چند صاحب اختر بی۔ اے نمائندہ "مخزن" نے ڈاکٹر سر محمد اقبال مدظلہ العالی کی خدمت میں حاضر ہو کر آپ سے چند سوالات کئے۔ جن کے جواب میں ڈاکٹر صاحب ممدوح نے جو کچھ ارشاد فرمایا اس کا مفاد ذیل میں درج کیا جاتا ہے:۔

آج سے تقریباً بیس پچیس سال پیشتر میرے اور مولانا گرامی کے تعلقات کا آغاز ہوا۔ آپ اُس وقت مستقل طور پر حیدرآباد میں رہتے تھے۔ اور کبھی کبھی پنجاب میں آیا کرتے تھے۔ اس زمانے میں آپ زیادہ تر غزل ہی لکھا کرتے تھے۔ لیکن میرا یہ خیال ہے کہ انہیں غزل اور مثنوی دونوں پر قدرت حاصل تھی۔ رباعی زیادہ تر انہوں نے آخر عمر میں لکھی۔ ایک مثنوی مولانا روم کی طرز پر لکھنی شروع کی تھی جس کا کچھ حصہ شائع ہو چکا ہے۔ دوسری مثنوی ملا غنیمت کنجاہی کی مثنوی کے انداز پر تھی۔ لیکن دونوں غالباً ختم نہیں ہوئیں۔ آپ کا بیشتر کلام غزل پر مشتمل ہے۔ کئی سال ہوئے مولانا گرامی نے اپنے کلام کا ایک مجموعہ جو انہیں کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا۔ دکھایا تھا۔ اس مجموعے کا حجم قریباً تین سو صفحے کے ہوگا۔ یہ مجموعہ بیاض کی صورت میں تھا۔ اور اس میں قریباً سب کی سب غزلیں موجود تھیں۔ مجھ کو معلوم نہیں کہ یہ مجموعہ اب کہاں ہے۔ غالباً محفوظ ہوگا۔ میرے نزدیک اصناف سخن میں ان کو غزل کے ساتھ خاص شغف تھا۔ فارسی لٹریچر میں جو "تازہ گوئی" کا دور اکبر کے عہد سے شروع ہوا تھا۔ مولانا گرامی کو اس دور کا آخری شاعر سمجھنا چاہئے۔ ان کا کلام بحیثیت مجموعی بالخصوص غزل میں نظیری کے کلام سے ایک خاص نسبت رکھتا ہے شعر سے ان کی طبیعت کو فطری مناسبت تھی۔ اس فطری مناسبت کے ساتھ زندگی کے عام حالات نے ان کو فنا فی الشعر کر دیا تھا۔ گفتگو اور عام روش میں وہ نہایت سیدھے سادے آدمی تھے لیکن حقیقت میں نہایت ذہین آدمی تھے! اور شعر کے علاوہ زندگی کے دیگر امور کو بھی خوب سمجھتے تھے۔ گو اُن امور میں عام طور پر دلچسپی نہیں لیتے تھے۔ جدید فارسی زبان کا اثر ان کے کلام پر مطلق نہ تھا۔ وہ کلاسیکل فارسی ہی میں لکھتے تھے۔ فارسی زبان کے ساتھ ان کو ایک طبعی مناسبت تھی۔ اور تراکیب وضع کرنے میں ان کا انداز مجتہدانہ تھا۔ جدید فارسی تراکیب اور الفاظ سے اجتناب بھی ان کے صحیح ذوقِ شعر کی ایک دلیل ہے۔ ان کے جذبات گہرے اور افکار بلند ہوتے تھے۔ وہ تقریباً ہر وقت فکر سخن میں مصروف رہتے تھے۔ بالخصوص رات کے وقت بہت کم کھاتے اور بہت کم سوتے تھے۔ ان کی ایک اور بڑی خصوصیت یہ تھی۔ کہ حافظہ نہایت قوی تھا۔ فارسی کے ہزاروں اشعار ان کو ازبر تھے۔

اور اپنا کلام بھی سارا کا سارا یاد تھا۔ میرا یہ عقیدہ ہے۔ کہ وہ ہر پہلو سے اپنے زمانے کے ایک بے نظیر آدمی تھے۔ سادگی بے پروائی اور بلند پروازی کے ایسے مجموعے کی مثال اس زمانے میں مشکل سے ملے گی۔ منجملہ دیگر خصوصیات کے ان کی ایک خصوصیت یہ تھی۔ کہ اپنے کلام کو خود نہایت گہری ناقدانہ نظر سے دیکھتے تھے۔ آخر عمر میں ان کی طبیعت طول نویسی کا بار برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ غالباً یہی وجہ ہے۔ کہ اپنی عمر کے آخری دو تین سالوں میں انہوں نے سوائے رُباعی کے غالباً اور کچھ نہیں لکھا +

جہاں تک مجھے معلوم ہے فارسی نثر میں انہوں نے کچھ نہیں لکھا لیکن عام حالات سے اندازہ کر کے میں یہ کہہ سکتا ہوں۔ کہ اگر وہ فارسی نثر لکھتے تو نہایت شگفتہ لکھتے۔ ان کے اردو خطوط بھی جدّتِ بیان سے خالی نہ ہوتے تھے۔ وہ نہایت صلح کُل تھے۔ ان کے اخلاق وسیع تھے۔ اور ایسا بہت کم ہوتا تھا۔ کہ وہ کسی کے کلام پر اُس کے سامنے نکتہ چینی کریں۔ اعلےٰ درجے کا شاعر ہونے کے علاوہ وہ اعلےٰ پایہ کے نقادِ شعر بھی تھے۔ جب انہیں کوئی اچھا شعر سُنایا جاتا تو ان کو معاً یاد ہو جاتا اور پھر کئی کئی دن تک اُسے پڑھتے رہتے + گرامی کو خانخاناں کے زمانے میں پیدا ہونا چاہیئے تھا۔ قدرت کی ستم ظریفی نے انہیں اس زمانے میں پیدا کر دیا۔ مگر یہ بات باعثِ اطمینان ہے۔ کہ میر محبوب علی خاں عرش آشیانی نے ایک ایسے زمانے میں ان کی قدر افزائی کی جبکہ فارسی شعر کا چراغ ہندوستان میں گُل ہو چکا تھا۔ پنجاب کی ادبی روایات جن کا سلسلہ مسعود سعد سلمان سے شروع ہوتا ہے اصل میں فارسی ہی سے وابستہ تھیں۔ مولانا گرامی ان روایات کے بہترین حامل تھے ع حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا + گرامی کی بہترین یادگار ان کا کلام ہے۔ ان کے احباب اور مداحین کو چاہیئے۔ کہ وہ اس کلام کو ان کے ورثاء سے حاصل کر کے شائع کریں۔ مجھے اندیشہ ہے کہ اپنے کلام کا ایک حصہ وہ ضرور اپنے ساتھ ہی لے گئے ہیں +

حضرت مولانا گرامی رحمۃ اللہ علیہ

(از مولانا عبد المجید خاں صاحب سالک بی۔ اے مدیر روزنامہ "انقلاب" لاہور)

یوں تو حضرت مولانا گرامی مرحوم کی وسعتِ اخلاق کا سایہ دوست دُشمن سب پر حاوی تھا لیکن حضرت علامہ اقبال سے جو خصوصی تعلقات تھے۔ وہ کسی کے ساتھ بھی نہ تھے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ جب کبھی آپ لاہور تشریف لاتے حضرت علامہ ہی کے ہاں قیام فرماتے۔ اور سچ یہ ہے۔ کہ مولانا گرامی جیسے لااُبالیانہ طبیعت کے آدمی کی میزبانی بھی حضرتِ علامہ ہی کا کام تھا۔ کسی دوسرے کے بس کا روگ نہ تھا۔ حضرتِ علامہ اور آپ کے ملازم مولانا مرحوم کے اس قدر طبیعت شناس تھے۔ کہ مولانا کو جس وقت بھی جس چیز کی ضرورت ہوتی تھی۔ بلا تکلف مہیا ہو جاتی تھی۔ اکثر اوقات ایسا ہوا ہے۔ کہ رات کے تین بجے آپ نے چاء اور میوے کی فرمائش کر دی۔ یا دسترخوان پر بیٹھنے کے بعد کوئی خاص سالن طلب فرما لیا۔ مزاج شناسی کی انتہا یہ ہے۔ کہ اُس وقت فرمائش کی چیز کے لئے کوئی دقت نہ پڑتی تھی۔ اور وہ چیز پہلے ہی سے

موجود ہوتی تھی۔ مولانا کی عادات عام انسانوں سے بہت مختلف واقع ہوئی تھیں۔ آپ کو کھانے کی چیزوں سے چنداں دلچسپی نہ تھی البتہ چائے کا شوق بے انتہا تھا۔ ہفتے بھر میں غالباً ایک دو دن ہی ایسے ہوتے ہونگے کہ مولانا رات کا کھانا سیر ہو کر کھاتے ہوں۔ ورنہ کبھی کبھی تھوڑے چاول تناول فرماتے تھے۔ اور کبھی بالکل کچھ نہ کھاتے تھے۔ گیارہ بارہ بجے ذرا سی دیر کے لئے لیٹتے تھے۔ اور دو بجے بیدار ہو جاتے تھے۔ رات دن میں کوئی لمحہ ایسا نہ گزرتا تھا کہ آپ فکر سخن یا شعر و ادب کے چرچے میں مصروف نہ ہوتے ہوں۔ طبیعت میں بلا کی روانی تھی۔ لیکن جو کچھ کہتے۔ نہایت دقت نظر سے اُس پر تنقید فرماتے۔ اور جب تک اُسے ہر پہلو سے مکمل اور بے عیب نہ بنا لیتے۔ برابر اُسی اُدھیڑ بُن میں مستغرق رہتے۔ شاعری کے اعتبار سے آپ کی دو عادتیں اپنی نظیر نہ رکھتی تھیں۔ اوّل۔ ہر وقت فکر شعر میں انہماک۔ دوم بلا فرمائش اپنا کلام سُنانا۔ غرض ایک بہتے دریا تھے جس سے سیراب ہونے کے لئے کسی تردد کی ضرورت نہ تھی۔ بلکہ محض اس کے کنارے پر پہنچ جانا ہی کافی تھا +

مولانا کی یہ خصوصیت بھی بے نظیر تھی۔ کہ چھوٹوں پر بے انتہا شفقت فرماتے تھے۔ اور اپنے جس نیازمند میں شعر و ادب کی قابلیت و استعداد کا ایک شمہ بھی دیکھ پاتے اس کی حوصلہ افزائی میں کمال اہتمام فرماتے۔ مجھے مولانا کی خدمت میں شرف نیازمندی حاصل ہونے کے علاوہ آپ سے ہم قومی کا فخر بھی حاصل تھا۔ اور مولانا مرحوم حاضر و غائب مجھے انتہائی محبت و شفقت سے یاد فرماتے تھے۔ جتنی مدت تک میرا تعلق "زمیندار" سے رہا۔ مولانا کے تمام گرامی نامے میرے ہی نام موصول ہوتے رہے۔ اور مجھی کو وہ اپنا کلام بغرضِ اشاعت بھیجتے رہے۔ اس کے بعد جب میں نے "انقلاب" جاری کیا۔ تو آپ نے اس پر بے انتہا مسرت کا اظہار فرمایا۔ اور "سالک و مہر" اور "انقلاب" کی تعریف میں بہت حوصلہ افزا الفاظ لکھے +

ایک حقیقی شاعر اپنے گرد و پیش کے حالات سے غیر متاثر نہیں رہ سکتا چنانچہ مولانا گرامی بھی ملک کی ہر صحیح تحریک سے متاثر ہو کر اس کے متعلق اشعار فرماتے تھے۔ اور تحریک ترک موالات کے زمانے میں تو آپ نے تحریک کے رہنماؤں اور کارکنوں کے لئے نہایت حوصلہ افزا نظمیں اور رباعیاں لکھیں لیکن اس قسم کا کلام صرف محفل احباب ہی تک محدود رہتا تھا۔ اور مولانا اس کی اشاعت کی کبھی اجازت نہ دیتے تھے۔ اس کی وجہ وہ حد سے بڑھی ہوئی حزم و احتیاط تھی جو قدیم وضع کے بزرگوں کا طغرائے امتیاز ہے۔ یہ سارے کا سارا کلام مولانا کو حفظ تھا۔ اور غالباً وہ ان کے ساتھ ہی پیوندِ خاک ہو گیا۔ کیونکہ جہاں تک مجھے معلوم ہے وہ اپنے اس قسم کے اشعار کو ضبط تحریر میں بھی نہ لاتے تھے +

میری اُن کی آخری ملاقات پچھلے سال ہوئی جب لاہور میں انجمن حمایت الاسلام کا سالانہ جلسہ منعقد ہو رہا تھا۔ ڈپٹی عبدالرب صاحب امرتسر میں متعین تھے۔ ان کے بزرگ نواب سراج الدین احمد خاں سائل دہلوی اُن کے ہاں آ کر مقیم ہوئے۔ تو اُنہوں نے کہا۔ کہ مولانا گرامی سے ملنا چاہیئے۔ نواب صاحب بوجوہ ہوشیارپور جا نہ سکتے تھے۔ اس لئے ڈپٹی عبدالرب صاحب موٹر لے کر خود ہوشیارپور پہنچے۔ اور کسی حیلہ بہانے سے مولانا مرحوم کو موٹر میں بٹھا کر امرتسر لے آئے۔ مولانا سفر سے بہت گھبراتے تھے۔ علی الخصوص سردی کے موسم میں تو کبھی نقل مکان نہ فرماتے تھے۔ ڈپٹی صاحب کی زبردستی پر بہت جز بز ہوئے۔ لیکن جب امرتسر میں آ کر نواب سائل صاحب سے ملے۔

تو چند روز تک شعر و سخن کی محفل خوب گرم رہی۔ انجمن حمایت الاسلام کے جلسے میں نواب صاحب کو ایک نظم پڑھنی تھی۔ آپ جب لاہور تشریف لائے۔ تو اپنے ساتھ موٹر میں مولانا کو بھی لے آئے۔ نظم پڑھنے کے بعد آپ کا یہ ارادہ ہوا۔ کہ اسی وقت امرتسر واپس چلے جائیں۔ لیکن ہیں۔ بھائی حفیظ اور پنڈت ہری چند اختر تاک میں تھے۔ ہم نے فوراً جلسے سے نکل کر مولانا کو موٹر ہی میں جا لیا۔ اور باصرار یہ گزارش کی۔ کہ ایک دو دن کے لئے ٹھہر جائیے۔ تمام احباب کو ملاقات کا اشتیاق ہے۔ اور علی الخصوص علامہ اقبال بہت بہت یاد فرماتے ہیں۔ آخر مولانا نے اپنے مخصوص بے ساختہ پن سے یہ کہہ کر نواب سائل صاحب کو رخصت کر دیا۔ کہ "جاؤ۔ میاں۔ اب اکیلے ہی امرتسر جاؤ۔ اب ہم سالک صاحب کا کہنا رد نہیں کر سکتے"۔ ہم مولانا کو ساتھ لے کر حضرت علامہ اقبال کے ہاں پہنچے۔ تو بے تکلف دوستوں کی ملاقات کا نظارہ قابل دید تھا۔ رات کو بہت دیر تک ہم لوگ مولانا کا کلام سنتے رہے۔ دوسرے دن اسلامیہ کالج کے طلبا کی "جالندھر ایسوسی ایشن" نے خاص مولانا کا کلام سننے کے لئے حبیبیہ ہال میں ایک جلسہ منعقد کیا جس میں مولانا نے تقریباً ایک گھنٹے تک ارباب ذوق سلیم کے مجمعے کو مسحور بنائے رکھا۔ یہ آخری مجمع عام تھا۔ جس میں مولانا نے اپنے کلام اور اپنی زیارت سے اپنے عقیدت مندوں کو شاد کام فرمایا ÷ انتقال سے چند روز پیشتر ہوشیارپور سے ایک تار موصول ہوا۔ جس میں مولانا کی علالت کی اطلاع دی گئی تھی۔ دو دن بعد ایک صاحب ہوشیارپور سے آئے۔ جنہوں نے مولانا کا یہ پیغام پہنچایا۔ کہ "اقبال اور سالک سے کہو۔ اگر ہمیا گرامی سے مل جائیں۔ گرامی کوئی دن کا مہمان ہے"۔ آہ! ہمیں کیا معلوم تھا۔ کہ یہ علالت مرض الموت ثابت ہوگی۔ اور شعر و سخن کا یہ مسلم الثبوت استاد محبت و شفقت کا یہ پیکر اتنی جلدی خاک کی چادر تان کر سو جائے گا۔ مکروہات و موانع دنیوی کا برا ہو۔ جنہوں نے ہمیں آخری وقت مولانا کی زیارت سے محروم رکھا ÷

اے شعر پارسی! خون کے آنسو بہا۔ کہ تیری اقلیم کا تاجدار عشق و تصوف کی محفل کو ویران کر گیا! اے ذوق سلیم کے سرمایہ دارو! اپنے ہاتھوں کو وقف ماتم کر دو۔ گرامی مر گیا۔ اور اس کی جگہ خالی ہے! آہ! اب کون ہمیں محبت سے اپنا کلام سنائے گا۔ اور عرفی و نظیری کی یاد کو کون تازہ کرے گا! زبان فارسی ماتم کر رہی ہے۔ قدیم شاعری رو رہی ہے۔ استادانہ انداز سخن سر پیٹ رہا ہے۔ کہ ایشیا میں فارسی کے تغزل کا چراغ گل ہو گیا ؎

داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

خدا سے دعا مانگو۔ کہ وہ اپنی رحمت کاملہ سے اس حقیقی "تلمیذ الرحمٰن" کو فردوس بریں میں جگہ دے۔ اور اس کے متعلقین اس کے احباب۔ اس کے نیازمندوں کو اس کے انتقال کے صدمے کی برداشت عطا فرمائے۔ آمین!

حیات بعد الممات

(از ایم اسلم صاحب)

حیات بعد الممات۔ "بقائے روح"۔ "زندگی ثانی"۔ "حشر نشر" یہ سب ایک ہی موضوع کے چند عنوان ہیں۔ اہلِ مذہب میں یہ عقیدہ ہر جگہ موجود رہا ہے۔ اور کسی نہ کسی رنگ میں۔ مگر دہریت پرستانِ یورپ۔ جو کسی بات پر ایمان لانے سے پہلے اُسے اپنی محدود عقل کے معیار پر پرکھنا ضروری سمجھتے تھے۔ اور جو حیات بعد الممات سے منکر تھے۔ اب مسئلے کی تحقیقات میں ہمہ تن مصروف ہیں۔ امریکہ اور یورپ میں اس مسئلے کی چھان بین کے لئے متعدد انجمنیں ہیں۔ اور بڑے بڑے سائنس داں اور فیلسوف اس مسئلے سے دلچسپی لے رہے ہیں۔ اُردو میں اس وقت تک اس موضوع پر بہت ہی کم خامہ فرسائی کی گئی ہے۔ اور ہم جناب میاں ایم اسلم صاحب کے بے حد شکر گزار ہیں۔ جنہوں نے سب سے پہلے اس پر قلم اُٹھایا۔ اور اس کی اشاعت کے لئے مخزن کو پسند فرمایا۔

ایڈیٹر

قائم کیا ہے میں نے عدم کے وجود کو
دُنیا سمجھ رہی ہے فنا ہو گیا ہوں میں

جب ہم کسی عزیز کی لاش کو گور میں اُتار کر مٹی اور پتھر سے ڈھانپ دیتے ہیں۔ تو اُس وقت قدرتی طور پر ہم کو یہ خیال ہونے لگتا ہے۔ کہ آج مرنے والے کا دُنیا اور دُنیا کے بکھیڑوں سے کوئی واسطہ نہیں رہا۔ وہ کُنجِ لحد میں پڑ کر دُنیا اور اس دُنیا کی تگا پوسے نابلد ہو گیا ہے۔ جس زندگی کے دوران میں وہ اپنے مخصوص انداز کے ساتھ حیات کی تگ و دَو میں مصروف رہتا تھا۔ آج وہ تگ و دو ختم ہو چکی ہے۔ اور مٹی کے ساتھ مل کر مرنے والا مٹی ہو جائے گا۔ لیکن درحقیقت یہ ایک غلط خیال ہے۔ جسم تو مٹی میں مل کر ضرور مٹی ہو جائے گا۔ لیکن انسان کی "روح" جو ایک غیر مادی چیز ہے مٹی میں دب کر مٹی نہیں ہو سکتی +

"روح" دیکھتی بھی ہے۔ سُنتی بھی ہے۔ اور سوچتی بھی ہے۔ لیکن "روح" کے دیکھنے۔ سُننے اور سوچنے کے لیئے وہ چیزیں ہرگز درکار نہیں جو ہم لوگوں کے لیئے ضروری ہیں۔ دُنیا میں شاید ہی کوئی متنفس ایسا ہوگا جسے کسی مرنے والے کا رنج نہ ہوگا۔ جب کسی کا کوئی عزیز قیدِ حیات سے آزاد ہو جاتا ہے۔ تو پس ماندگاں کو رہ رہ کر یہ خیال آتا ہے "کاش اس وقت مرنے والا ہماری بیکلی اور بیقراری کو دیکھتا ہو" ان لوگوں کی تسلی کے لیئے صرف ایک ہی جواب ہے۔ اور یہ جواب اس قدر مفصل اور مدلل ہے۔ کہ اس کی تشریح کی ضرورت نہیں۔ اور وہ یہ ہے:-

"انسان مرنے کے بعد فنا نہیں ہوتا۔ ایسے دو انسان جنہیں مادّی زندگی میں ایک دوسرے سے بے حد محبت اور اُلفت ہو۔ اگر ان دونوں میں سے ایک فوت ہو جانے تو اس کا دوسرے سے ساتھ نہیں چھوٹتا۔ وہ جو مر کر نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ وہ کسی حالت میں ہم سے دُور نہیں ہو جاتا۔ بقول علامہ اقبال ؎

مرنے والے مرتے ہیں لیکن فنا ہوتے نہیں
یہ حقیقت میں کبھی ہم سے جُدا ہوتے نہیں

بعض لوگ یہ اعتراض کریں گے۔ کہ اس نظریہ کو ثابت کیوں نہیں کیا جاتا۔ اور بعض اس قسم کے تسلی آمیز الفاظ کو اسلیئے بیہودہ تصور کریں گے۔ کہ اس قسم کی باتوں پر یقین کر لینے سے غمزدہ کے دل میں ایک عجیب اُلجھن پیدا ہو کر اس کے اضطراب اور رنج کو اور بھی افزوں کر دیتی ہے۔ اس لیئے وہ "چیز" جسے ہم ثابت نہیں کر سکتے۔ اس کا ذکر کرنا کچھ فائدہ مند ثابت نہیں ہو سکتا +

بے شک یہ اعتراض اور استدلال سب درست ہیں۔ لیکن ایسے معترض کی خدمت میں صرف اتنا عرض کرنا ضروری ہے۔ کہ ہماری دُنیا ہی نرالی ہے۔ جس نظام کے ماتحت ہم زندگی کی تگ و دَو میں لگے ہوئے ہیں۔ ہم کو سرے سے اسی کا کچھ علم نہیں۔ تو ہم غیب کی بات کو کس طرح وثوق کے ساتھ ثابت کر دیں۔ لیکن مشہور قول ہے۔

"دل را بہ دل رہیست"

ہم مانتے ہیں کہ انسان کے اندر "ٹیلی پیتھی" (دَور خیالی) موجود ہے۔ یعنی جس طرح بعض حالتوں میں

ہمیں کسی آنے والے واقعے کی جو ہماری ذات سے تعلق رکھتا ہو یا اُس کا تعلق کسی ہمارے عزیز سے ہو ایک نامعلوم طور پر آگاہی حاصل ہو جاتی ہے۔ (" ندائے غیب" مطبوعہ مخزن ملاحظہ فرمایئں) گو اس کو ثابت نہیں کیا جا سکا۔ کہ یہ کس طرح وجود میں آتا ہے۔ لیکن جب ہم اس پر یقین رکھتے ہیں تو پھر کسی اور چیز کو جس کا "حل" ہم کو نظر نہ آتا ہو "غلط" کہہ دینا کہاں کی دانشمندی ہے +

وہ لوگ جو "بقاء روح" کے قائل ہیں۔ دُنیا کو ایک "مادّی چیز" تصوّر کرتے ہیں اور اسے ایک "کل" سے تشبیہ دیتے ہیں۔ ان لوگوں کے خیال کے مطابق یہ "کل" انسان کے دماغ کے ذریعے چلتی ہے اور ایک خاص وقت تک چلنے کے بعد بیکار ہو جاتی ہے۔ لیکن سائنس نے جو حال میں ترقی کی ہے۔ اس سے جو انکشافات ہوتے ہیں۔ اُن سے یہ "نظریہ" صحیح ثابت نہیں ہوتا +

بے تار کا "ٹیلیفون" جو زمانۂ حال کی ایجاد ہے۔ اس سے لوگوں نے سمندر یا ریتیں ہزار میل کے فاصلے پر سے ایک دوسرے سے گفتگو کی ہے۔ صرف اس ایک تجربے کی بنا پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اگر ہماری آواز سمندروں کو عبور کر کے تین ہزار میل پر سُنی جا سکتی ہے۔ تو کیا وجہ ہے کہ ہم یہ تسلیم نہ کریں۔ کہ ہماری دعایئں اور التجایئں آسمانوں تک نہیں پہنچ سکتیں۔ اور وہ "قدرت" جس کے زبردست ہاتھوں میں نظامِ عالم کی باگ ڈور ہے ان کو نہیں سُنتی۔ اس نئی ایجاد نے ایک بہت بڑی حد تک مذہب اور سائنس کو ایک دوسرے کے بہت نزدیک پہنچا دیا ہے +

جب کوئی جہاز گرداب بلا میں گرفتار ہوتا ہے۔ اور "بے تار" کے اپنی مصیبت کی داستان سے نزدیک و دُور کے جہازوں کو آگاہ کر سکتا ہے۔ اور ان کی یہ چیخ و پکار شورش امواج اور برق و باد کے طوفانوں کو عبور کر کے دوسرے لوگوں تک پہنچ سکتی ہے۔ تو تعجب ہے کہ ہم اس "نظریہ" کو تسلیم کرنے میں پس و پیش کریں۔ کہ ہماری صدایئں اس مملکت میں نہ پہنچتی ہونگی۔ جس کے وجود کا ہم کو خال خال علم ہونے لگا ہے +

ابھی ہم خود اپنے "دماغ" اور "خیال" کی قوّتوں سے واقف نہیں ہوئے۔ جب ہم ان سے پورے طور پر واقف ہو جایئں گے۔ اور ان سے کچھ کام لینے لگیں گے۔ تو کون کہہ سکتا ہے کہ اس قدرت کے اسراروں سے جس کے ہم اس دُنیا میں نائب ہیں کہاں تک آگاہ ہو جایئں +

افسوس تو یہ ہے۔ کہ اس قدر ترقی کے زمانے میں ابھی بہت سے لوگ اس خیال کے بھی موجود ہیں۔ جو "روحانیات" کا مطالعہ کرنے والوں کو پاگل سمجھتے ہیں۔ یہ بات کسی سے پوشیدہ نہیں۔ کہ جب ماہرین

"برقی رو" کے ذریعے بے تار کے سلسلۂ خبر رسانی جاری کرنا چاہتے تھے۔ تو عوام الناس ان لوگوں کو بھی خارج از عقل اور دیوانہ سمجھتے تھے۔ لیکن آخر لوگوں کو اس بلند ہمت جماعت کی محنت اور دماغ کی داد دینی ہی پڑی +

"ڈکٹر ہیوگو" کا قول ہے۔

"قبر اور قبر کی تاریکی اور تنہائی کو دیکھ کر میں کبھی پریشان نہیں ہوتا۔ کیوں؟ صرف اس لئے کہ گور انسان کے ناکارہ جسم کے لیئے تو ایک زندان ضرور ہے۔ لیکن "روح" اس سے آزاد ہے" +

یہ ایک مسلمہ بات ہے۔ کہ اگر کسی انسان کو بے قیاس دولت ہاتھ لگ جائے۔ تو اس سے اسے "خوشی" حاصل نہیں ہوسکتی۔ ہم دولت سے زندگی بسر کرنے کے لیئے آسودگی حاصل کر سکتے ہیں۔ لیکن "خوشی" نہیں خرید سکتے۔ لیکن پھر بھی جسے دیکھو اس دُھن میں لگا ہوا ہے۔ کہ جس طرح بھی ہو دولت جمع کر کے دولت مند بن جائے:

یہی حال "ماہرینِ روحانیات" کا ہے۔ ان لوگوں کو یہ تو یقین ہے۔ کہ "ارواح" کے ساتھ تبادلۂ خیالات سے قلب کو اطمینان اور راحت حاصل نہیں ہوسکتی۔ لیکن پھر بھی یہ لوگ اسی خیال میں لگے ہوئے ہیں۔ کہ "نظریہ بقاءِ روح" کو کسی نہ کسی طرح ثابت کر دیں۔ اور "مکالمۂ ارواح" کے ذریعے "دوامِ حیات" کا پتہ لگائیں +

کچھ عرصے سے عوام الناس بھی اس مسئلے سے اظہارِ دلچسپی کر رہے ہیں۔ اور علماء روحانیات کے تجربات کے نتائج کا نہایت غور سے مطالعہ ہو رہا ہے۔ حالانکہ ایک وہ وقت بھی تھا۔ کہ یہی عوام الناس اس شخص کی جان کے لاگو ہو جاتے تھے۔ جس کے متعلق وہ یہ سُن پاتے کہ "وہ "ارواح" سے بات چیت کر سکتا ہے +

اس زمانے میں سائنس نے جو ترقی کی ہے اور جس قدر نئے اور حیرت انگیز انکشافات دُنیا کے سامنے رُونما ہو رہے ہیں۔ آج سے ایک مدت پہلے لوگ ان کو الف لیلا کی کہانیاں تصور کرتے تھے +

انگلستان میں جب "بقاءِ روح" کا خیال لوگوں میں ترقی پکڑنے لگا۔ تو کیمرج کے چند ایک اُستادوں نے ۱۸۸۲ء میں ایک انجمن کی بنیاد رکھی۔ اور اس انجمن کا نام "سوسائٹی فار سائیکل ریسرچ" قرار پایا۔ اس انجمن کے اراکین کا مقصد یہ تھا۔ کہ "بقاءِ رُوح" کے متعلق جو لوگوں کے دلوں میں ایک خیال جاگزیں ہو رہا ہے۔ اس کی باقاعدہ تحقیق کی جائے اور اس مسئلے پر مختلف طور پر بحث کرنے کے بعد اور ان واقعات کی جو مختلف لوگ "ارواح" کے متعلق بیان کرتے ہوں پوری تحقیق اور جستجو کرنے کے بعد کوئی نظریہ قائم کیا جائے +

اس وقت صرف انگلستان میں کم و بیش ۳۷۰ ایسی انجمنیں موجود ہیں۔ جو "روح کی تحقیق" میں مصروف ہیں

ان انجمنوں کے اراکین کی تعداد تیس ہزار شمار ہوتی ہے۔ ان لوگوں میں بڑے بڑے نامور عالم۔ ادیب خطاب یافتہ۔ تجار۔ طالب علم اور ہر مذہب و ملت کے لوگ شامل ہیں۔ یہ سب انجمنیں ایک دوسرے کے ساتھ مل کر کام کرتی ہیں۔ لیکن ان کے علاوہ ایسی انجمنیں بھی معقول تعداد میں موجود ہیں جو اپنے اپنے طور پر اس مسئلے کی تحقیق اور جستجو میں مصروف ہیں +

انگلستان کے علاوہ یورپ کے تمام بڑے بڑے شہروں میں "ماہرین علم الارواح" کی انجمنیں موجود ہیں اور اسی طرح آسٹریلیا۔ کنیڈا۔ نیوزیلینڈ اور جنوبی افریقہ میں بھی یہ انجمنیں قائم ہو چکی ہیں۔ اور سب اپنے اپنے طریق پر "حیات بعد الممات" کے مسئلے پر غور کر رہی ہیں +

ان تمام مجلسوں کے اراکین اس بات پر متفق ہیں۔ کہ انسان مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہوتا ہے۔ اور خاص خاص حالتوں کے سوا "روح" کو بقا حاصل ہو جاتی ہے۔ ان لوگوں کا اس "نظریہ" سے پورا پورا اتفاق ہے۔ کہ مادی کائنات (انسان کی زندگی) کو خود ابھی تک یہ علم بھی نہیں۔ کہ نظامِ عالم کس طور پر چل رہا ہے۔ "مادی کائنات" ایک "مشین" یا "کل" کی مانند ہے۔ جو اپنے قائم شدہ اصولوں پر چل رہی ہے۔ اس میں فہم و ادراک کا دخل نہیں۔ یہ وہ اصول ہیں جن میں کبھی کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔ اور نہ ہی کسی قسم کی رکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔ ہر انسان کے لئے ایک راستہ قائم کر دیا گیا ہے۔ اور سب اُسی راستے پر چلتے ہیں۔ لیکن اس راہ کی ابتدا اور انتہا کی کسی کو کچھ خبر نہیں۔ اس قائم شدہ راستہ پر سب "مادی وجود" کی ایک خاص وقت تک آمد و رفت جاری رہتی ہے۔ لیکن یہ نہیں بتلایا جا سکتا۔ کہ دورِ زندگی میں کونسا راز مضمر ہے +

ہم یہ تو جانتے ہیں۔ کہ انڈے سے مرغ پیدا ہوتا ہے۔ ہم کو یہ بھی علم ہے۔ کہ بیج سے درخت بنتا ہے اور اُس میں پھول اور پھل نکلتے ہیں۔ "علم الحیات" کے ذریعے ہم کو یہ بھی معلوم ہے۔ کہ ہماری رگوں کے اندر خون کس طرح گردش کرتا ہے۔ سانس کس طرح پھیپھڑوں میں سے گزرتا ہے۔ دل کی حرکت کس طرح ہوتی ہے لیکن یہی "علم الحیات" ہم کو یہ بتلانے سے قاصر ہے۔ کہ ہماری ہستی ایک گزرتے ہوئے سائے کی طرح ہے یا ایک حقیقت ہے جس کو فنا نہیں +

"سر آلور لاج" روح کے متعلق بحث کرتے ہوئے کہتے ہیں:۔

"انسان کی روح موت کے بعد فنا نہیں ہوتی۔ بلکہ وہ اپنی تگ و دو برابر جاری رکھتی ہے۔ اور بعض

حالتوں میں یہی "روح" اپنے عزیز واقارب کو جن سے وہ جُدا ہو جاتی ہے۔ ملتی بھی ہے۔ لیکن اس قسم کی ملاقات یا "روح" کی موجودگی کے احساس کا دارومدار صرف اسی حالت میں ہوتا ہے۔ جب کہ مرنے والے کو اپنے کُنبے میں سے یا جان پہچان کے لوگوں میں سے کسی ایک سے خاص اُلفت ہوتی ہے۔ اور جس سے وہ ملتا ہے یا جس پر وہ اپنی موجودگی ظاہر کرتا ہے۔ وہ بھی اس کی یاد میں مضطرب وبیقرار رہتا ہو۔ ملاقاتوں کا یہ سلسلہ اُس وقت تک جاری رہتا ہے۔ جبکہ دوسرا بھی اس دُنیا سے کوچ کر کے بقاء دوام کی لذت سے آشنا ہو جاتا ہے+

"ہماری دُنیا وہی ہے۔ جو ہم میں سے ہر ایک شخص سمجھ رہا ہے۔ لیکن درحقیقت اس کارخانہ کا پورا پورا علم تو کسی فردِ بشر کو نہیں۔ اور ناظمِ عالم کی قدرتوں اور اعجاز نمائیوں کے اسرار سے واقف ہونا فہم وادراک کی تگ و دو سے بالاتر ہے"+

زمانۂ قدیم کی مذہبی کتب میں مذکور ہے۔ کہ "اسرارِ قدرت" ہم سے اتنا ہی دُور ہو جاتا ہے۔ جس قدر کہ ہمارا علم ترقی کرتا جاتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی ایک امر واقع ہے۔ کہ جوں جوں ہمارا علم ترقی کرتا جاتا ہے ویسے ہی ناظمِ عالم کی اعجاز نمائیوں کے عُقدے کی گرہ کُشائی ہوتی جاتی ہے+

انسان جس چیز کو اپنی فطرت سے مجبور ہو کر ایک "راز" یا "اسرار" تصوّر کرتا ہے۔ اگر ہم چشمِ حقیقت بیں سے کام لیں تو وہی "راز" یا "اسرار" ہم پر کھُلنے لگتا ہے+

اگر ہم یہ مانتے ہیں۔ کہ انسان اس دُنیا پر اپنے پیدا کرنے والے کا نائب ہے۔ تو پھر کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ حاکم اپنے بندے کو "رازِ کائنات" سے بالکل ناآشنا رکھے+

انسان کی پیدائش خود ایک "اسرارِ قدرت" ہے۔ اور ان لوگوں کے استدلال سے برعکس جو "بقاءِ رُوح" کے قائل ہیں وہ اس "رازِ قدرت" سے مقابلتاً زیادہ واقف ہیں۔ جسے اس جیسے ہی لوگوں کا گروہ ایک غیر ممکن چیز تصور کرتے ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے۔ تو انسان اس راز سے بلامنت اور بلاواسطہ آشنا ہے۔ کیونکہ وہ خود اسی "اسرارِ قدرت" کا ایک حصّہ یا ایک جزو ہے+

انسان کی بالکل وہی حالت ہے جو ایک شخص کی کسی ریگستان میں جا کر ہو جاتی ہے۔ جہاں اسے "سراب" پر "چشمہ" کا دھوکا ہوتا ہے۔ اور وہ اس دھوکے سے بچنے کے لئے بار بار اپنی آنکھیں بند کر لیتا ہے۔ حالانکہ "سراب" اور "چشمہ" دونوں اسی ریگستان میں موجود ہیں۔ لیکن ان دونوں میں تمیز کرنا

ہمارا اپنا کام ہے۔ اگر ہم اپنی نگاہ سے ٹھیک کام لیں گے۔ تو "سراب" پر "چشمہ" کا دھوکا نہ کھائینگے+

جب کوئی آدمی ایک طویل بحری سفر کے بعد کسی دوسری سرزمین میں پہنچتا ہے۔ تو اوّل اوّل اس کو اس نئے مُلک کی کسی چیز میں کوئی نمایاں فرق معلوم نہیں ہوتا۔ وہ ہر جگہ اپنے ایسے ہی انسان چلتے پھرتے دیکھتا ہے۔ اشجار۔ پھل۔ پھول سب ایک ہی طرح کے نظر آتے ہیں۔ (ہاں اگر کچھ فرق نظر آتا ہے۔ تو وہ لوگوں کے لباس اور زبان میں ہوتا ہے) اسی طرح جب ہم اس ہستیٔ ناپائدار کی حدود سے نکل کر ایک دوسرے عالم میں جسے ہم "عالمِ جاودانی" کہتے ہیں پہنچتے ہیں۔ تو وہاں ہم کو یکساں حالات نظر آتے ہیں۔ اور ایسی چیزیں مشاہدے میں آتی ہیں۔ جن کے دیکھنے کے ہم خوگر ہوتے ہیں۔ لیکن کچھ عرصے بعد یہ طلسم شکست ہوتا نظر آتا ہے اور ہم ہر ایک چیز میں کچھ نہ کچھ فرق محسوس کرنے لگتے ہیں۔ اس عالم میں پہنچ کر ہر ایک طاقت ترقی کرتی معلوم ہوتی ہے۔ یا بالفاظ دیگر مرنے کے کچھ عرصے بعد "روح" کے سامنے سے حجابِ ہستی اُٹھنے لگتا ہے۔ اور نگاہ کی وُسعت اس قدر بلند ہو جاتی ہے کہ ہم اس عالمِ جاودانی کے عجائبات کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں +

اس میں کچھ کلام نہیں۔ کہ یہ دُنیا جس کے نظام کے ماتحت ہم رہتے سہتے ہیں اور بعید وقت ہر ایک کام ختم کرتے ہیں۔ بجائے خود ایک نہایت دل فریب اور دلچسپ چیز ہے۔ لیکن انسان کی دلچسپیوں اور دلفریبیوں کی حد یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ بلکہ اس سے آگے بھی بہت کچھ ہے۔ اور یہ کہنا کہ آگے اَور کیا کچھ ہے۔ ہماری سمجھ اور فہم سے بالاتر ہے۔ ہماری فانی نگاہیں جہاں تک کام کرتی ہیں دُنیا کی وُسعت کا یہی کنارا ہے۔ بلکہ ہماری نگاہوں کی حد اور خیال کی پرواز سے اور بھی آگے ایک اَور دُنیا بھی ہے۔ اور یہ وہی دُنیا ہے جسے ہم "عالمِ بالا" یا بقاءِ دوام کے نام سے موسوم کرتے ہیں ؎

سلسلہ ہستی کا ہے اک بحرِ ناپیدا کنار
اَور اس دریائے بے پایاں کی موجیں ہیں ہزار

انسان کی موت اس کیلئے ایک عظیم حادثہ ہے۔ اس حادثہ کے صدمہ سے انسان کی "روح" اپنے فانی جسم سے نکل کر آزاد ہو جاتی ہے۔ اور پھر جو حادثات "روح" کو پیش آتے ہیں۔ اُن کا تعلق ہماری دُنیا سے

نہیں بلکہ اس دُنیا سے ہوتا ہے جہاں زندگی کو "ابدی زندگی" کہا جاتا ہے۔ جہاں "روح" کو بقا حاصل ہوتی ہے۔ اور اس جگہ پہنچ کر وہ ایک "ایثری وجود" اختیار کر لیتا ہے۔ اور "ایثری وجود" وہ چیز ہے جو انسان کی نظر سے اوجھل رہتا ہے +

"وجودِ ایثری" گو اپنے حلقہٗ گردش میں زندہ ہوں اور بقاء دوام حاصل کر لینے کے بعد اپنے خاص نظامِ عمل میں مشغول ہو جائیں لیکن وہ ہم سے کسی قسم کا تعلق یا راہ ورسم اُس وقت تک پیدا نہیں کر سکتے جب تک کہ وہ خاص خاص حالتوں کے ماتحت عارضی طور پر ایک "طبعی صورت" اختیار نہ کر لیں۔ اس جگہ "طبعی صورت" سے یہ مفہوم لیا جا سکتا ہے کہ ہم فانیوں کی طرح گوشت پوست حاصل کر کے اسی شکل وصورت میں ظاہر ہوں۔ جس شکل وصورت میں وہ اس فانی دُنیا میں ہمارے ساتھ رہتے سہتے تھے +

اس جگہ یہ تبلانا بھی بے محل نہ ہوگا۔ کہ جو لوگ بھُوت کے وجود کے قائل ہیں۔ ان کو کسی خاص آدمی کا بھوت اپنی قیود کے ماتحت نظر آتا ہوگا۔ مشہور فلاسفر "سسرو" آج سے کئی ہزار سال پیشتر اس موضوع پر بحث کرتے ہوئے کہتا ہے :-

"یہ ایک ایسا فلسفیانہ نکتہ ہے جسے ہم مختلف قسم کے بیہودہ اعتراضات سے غلط ثابت نہیں کر سکتے بعض اوقات یہ نکتہ یا نظریہ ایک ایسی نازک صورت اختیار کر لیتا ہے۔ کہ نہ تو ہم اسے مستقل طور پر شبہ کی نگاہ سے دیکھ سکتے ہیں۔ اور نہ ہی اس پر یقین کر سکتے ہیں۔ یہی کیفیت ان کہانیوں کی ہے جن کا تعلق "رُوح" کے ساتھ ہو فلسفہ میں وہم کا دخل نہیں۔ ہم لوگ "روحوں" کے نظر آنے کی کہانیاں گھروں میں بیٹھ کر تو بہت شوق سے سُنتے ہیں۔ لیکن عموماً ان پر اعتبار نہیں کرتے۔ کچھ لوگ اس قسم کے بھی واقع ہوئے ہیں جو دل سے تو ان کہانیوں کو ٹھیک سمجھتے ہیں۔ لیکن لوگوں کے سامنے ان کا مضحکہ اُڑاتے ہیں۔ رہا یہ سوال۔ کہ میرا اپنا عقیدہ کیا ہے۔ تو میں صرف اتنا کہہ سکتا ہوں۔ کہ چونکہ مجھے خود سرے سے یہ بھی معلوم نہیں۔ کہ انسان کی "روح" دُنیا میں آتی کیسے ہے۔ اور دُنیا کو چھوڑتی کس طرح ہے۔ اس لئے میں اس قسم کی اکثر کہانیوں کو "غلط" اور "لغو" نہیں کہہ سکتا" +

باقی آئندہ

اطلاع - خط وکتابت کرتے وقت اپنی خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیا کریں + مینیجر

مجلسِ اقوام

یہ مضمون اُس وقت لکھا گیا تھا۔ جب مجلسِ اقوام خواب و خیال سے زیادہ حقیقت نہ رکھتی تھی۔ اب مجلسِ اقوام بن چکی ہے۔ اس کے مقاصد کمزور قوموں کے لئے ضرر رساں ہیں یا فائدہ مند یہاں اس پر بحث کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس مضمون میں صرف یہ بتایا گیا ہے۔ کہ مجلسِ اقوام قائم کرنے کی تجویز سب سے پہلے کس کے دماغ میں آئی +

اڈیٹر

اگر ہم لڑائی کے خواہشمند ہیں۔ تو لڑنے کے لئے کوئی نہ کوئی بہانہ ضرور مل جاتا ہے۔ قرونِ وسطےٰ میں شاہانِ یورپ جنگ وجدال اور خونریزی کے بے حد مشتاق تھے۔ جنگ اُن کے دلچسپ مشاغل میں داخل تھا۔ وہ لڑائی کے لئے بہانے کی تلاش میں رہتے تھے۔ ادنےٰ سے ادنےٰ اور معمولی سے معمولی واقعہ بھی اُن کے سمندِ شوق پر تازیانے کا کام دیتا تھا۔ اتفاقی حادثے پر بھی وہ اپنی اپنی فوجیں لے کر چڑھ دوڑتے اور گھٹاؤں کی طرح میدانِ جنگ میں جا گرجتے + انگلستان ہی کو لیجیے۔ صرف اس خیال سے۔ کہ فرانس کے تختِ سلطنت پر انگریز حکمراں جلوہ افروز نظر آئے۔ برابر سو برس تک لڑتا رہا +

یورپ کی وہ لڑائیاں تو نہایت ہی خطرناک اور نقصان رساں تھیں جو عموماً پراٹسٹنٹ اور کیتھولک کے مابین مذہبی عقائد کے اختلاف کی بنا پر ہوا کرتی تھیں۔ یہ لوگ جو اپنے آپ کو انسان کہتے تھے۔ صرف مذہبی عقائد کے سبب خونریزیاں کرتے تھے۔ ان کو یقین تھا۔ کہ دوسرے شخص کو ہم خیال بنانے کے لئے اس سے بہتر اور کوئی طریقہ نہیں +

ان دنوں بوہیمیا جو جنگِ عظیم میں آزادی حاصل کر کے ایک مستقل اور علیحدہ حکومت بن گئی تھی۔ اس ناگوار لڑائی میں سب سے پہلے شامل ہوئی۔ جان ہس John Huss پراٹسٹنٹ مصلح پبلک Prague کے مقام پر زندہ نذرِ آتش کر دیا گیا + جس وقت شعلے آسمان سے باتیں کر رہے تھے۔ لوگوں نے اُس کی

زبان سے دعائیہ کلمات سُننے۔ جن لوگوں پر اُس کے وعظ و نصائح کا اثر ہو چکا تھا۔ جو اُس کی تعلیم کو درست سمجھتے تھے اُنہوں نے اپنے بال بچوں کو یہی تعلیم دی ؛

اُن بچوں میں سے جنہیں یہ تعلیم دی گئی تھی۔ جارج پوڈی برینڈ بھی تھا۔ جو بوہیمیا کے شاہ لیڈس لاس کا محافظ تھا۔ جب لیڈس لاس اپنے بستر مرگ پر زندگی کے آخری سانس لے رہا تھا۔ اُس نے جارج پوڈی برینڈ کو بُلایا۔ اور اُس کے کان میں کہا:۔

"میری رعایا میں امن وچین رکھنا، امیر و غریب کو ایک نظر سے دیکھنا"؛

ملک کے امرا اور مرحوم بادشاہ کے مصاحب نئے حکمران کا انتخاب کرنے کے لئے جمع ہو گئے ان میں سے بعض لوگ ایک غیر ملکی شاہزادے کو بادشاہ بنانا چاہتے تھے۔ بعض کسی اَور کو۔ اور بعض نے جارج پوڈی برینڈ کا نام تجویز کیا۔ اس پر ایک کیتھولک سردار بول اُٹھا:۔

"جارج پوڈی برینڈ شاہی نسل سے نہیں ہے اُس نے پادری کی فرماں برداری نہیں کی۔ اور اُس پر پادری کی لعنت وارد ہو چکی ہے"؛

دوسروں نے جواب دیا "وہ ہمارے ملک کا رہنے والا ہے۔ ہمارا ہم وطن ہے۔ دوسرے غیر ملکی ہیں"؛

یہ دلیل کافی سمجھی گئی۔ اور جارج پوڈی برینڈ جس کی رگوں میں شاہی خون کا ایک قطرہ بھی موجود نہ تھا بادشاہ منتخب کر لیا گیا۔ اور پریگ (Prague) کے پُرانے شاہی دارالحکومت میں اُس کی تاج پوشی کی رسوم نہایت شان و شوکت سے ادا ہوئیں ؛

اُسے شاہ لیڈس لاس کی آخری وصیت "امن و امان قائم رکھنا" یاد تھی۔ بادشاہ بنتے ہی اُس نے مصمم ارادہ کر لیا تھا۔ کہ میں اس آرزو کو ضرور پورا کروں گا ؛ اُس نے اپنے ارادے کو عملی جامہ پہنانے کے لئے سب سے پہلے یہ حکم صادر کیا۔ کہ کیتھولک عقائد کے لوگوں کو مذہبی فروعات کے سبب سے کوئی ضرر نہ پہنچایا جائے ؛ ایک دن اپنے ملک کے مصائب اور نقصانات کے وجوہ پر غور کرتے ہوئے اُس نے اپنے دل سے پوچھا:۔

"قومیں جنگ کیوں کرتی ہیں؟ لڑائیوں میں بادشاہ اور سردار فتح حاصل کر لیتے ہیں۔ مگر لوگوں کی

گردنیں ناحق کٹ جاتی ہیں۔ بچے یتیم ہوجاتے ہیں۔ اور بسا اوقات اُن کی مائیں بھی جاں بر نہیں ہوتیں۔ بے چاری عورتیں دن رات کام کرتی ہیں۔ مگر اپنا گزارہ اچھی طرح نہیں چلا سکتیں۔ مُلک کا بہت سا حصّہ۔ گھنی فصلیں۔ سرسبز چراگاہیں۔ باغات۔ عالی شان عمارتیں برباد و ویران ہوجاتی ہیں۔ کیا بادشاہ اپنے مقاصد لڑنے کی بجائے گفت و شنید کے ذریعے طے نہیں کرسکتے ؟ ——— کچھ بھی ہو میں ضرور کوشش کروں گا۔ کہ وہ اس امر پر رضامند ہوجائیں۔ میں اپنے بہترین معتمد قاصد اُن کے پاس بھیجوں گا۔ اور وہ میرا پیغام اُن تک پہنچا دیں گے +

اب اُس نے اس ارادے کو پورا کرنے کی ٹھان لی۔ لوگ چہ میگوئیاں کر رہے تھے۔ اُن کا خیال تھا۔ کہ ہمارا بادشاہ شاہی نسل سے نہیں ہے۔ دوسرے حکمراں اُس کی بات بھی سُننا گوارا نہ کریں گے۔ بعض لوگ کہتے تھے۔ اُسے اس کام کے لئے پادری نے اجازت نہیں دی۔ مگر بادشاہ نے کسی کی پروا نہ کی۔ کیونکہ جو شخص کام کرنا چاہتا ہے۔ لوگوں کی باتوں پر غور نہیں کیا کرتا +

پریگ کا قدیم شاندار شہر جو موجودہ لڑائیوں کے سبب شکستہ ہو چکا تھا۔ آج اُس کے باشندے مئی کی خوشگوار دھوپ میں سینٹ صوفیا (St. Sophia) کی یادگار کا دن منا رہے ہیں۔ لوگ زرق برق لباس پہنے گرجا کے اندر باہر جا آ رہے تھے۔ گلیوں اور بازاروں میں سے ایک جلوس آہستہ آہستہ گزر رہا تھا۔ شہر کے ایک دروازے پر لوگوں کا ایک انبوہ جمع تھا۔ ان سب میں تذکرہ ہو رہا تھا۔ کہ شاہ جارج پوڈی بریڈ کے قاصد شاہِ فرانس سے ملنے کے لئے جا رہے ہیں +

اُن میں ایک شخص نے چلّا کر کہا "خدا اُنہیں کامیاب کرے" +

قاصد شہر سے نکل اپنے سفر پر روانہ ہوگئے۔ اور بوہیمیا کے مغرور سردار متکبرانہ انداز سے شہر کے اندر داخل ہوگئے۔ اُن کے خیال میں ان قاصدوں کا پیغام دُنیا بھر سے نرالا تھا۔ آج تک دُنیا میں اس قسم کا پیغام کسی کو نہیں دیا گیا تھا۔ قاصد سفر کرتے رہے۔ وہ اپنے سفر اور مقاصدِ سفر سے کچھ خوش نہیں نظر آتے تھے۔ جہاں جہاں سے وہ گزرتے تھے۔ لوگ اُنہیں عجیب الخلقت خیال کرتے۔ لوگوں کو یہ توقع ہوئی تھی۔ کہ یہ عجیب و غریب حرکات کرینگے +

جس وقت وہ کسی سرائے میں پہنچتے۔ تو دوسرے مسافر اُن کے گرد جمع ہو جاتے۔ یہ دیکھنے کے لئے۔ کہ یہ لوگ کھانا کس طرح کھاتے ہیں + سرزمین فرانس میں پہنچ کر انہوں نے دریافت کیا۔ کہ بادشاہ سلامت ان دنوں کہاں تشریف رکھتے ہیں ؟

جواب ملا " وہ اپنے مُلک کا دورہ فرما رہے ہیں " +

قاصد بادشاہ کے تعاقب میں چلے۔ ہر منزل پر پہنچ کر وہ خیال کرتے۔ کہ اب بادشاہ کی ملاقات ہو جائے گی۔ مگر شاہِ فرانس آگے نکل جاتا۔ قاصدوں کی دلی خواہش بہت جلد بادشاہ کی خدمت میں باریاب ہونے کی تھی۔ تاکہ جس قدر جلد ممکن ہو۔ شاہِ بوہیمیا کا پیغام گوش گزار کر دیں ۔ آخر اُس جگہ جا پہنچے۔ جہاں شاہِ فرانس نہایت شان و شوکت کے ساتھ خیمہ زن تھا +

فرانس کے سرداروں نے بادشاہ کو اس ملاقات سے باز رکھنا چاہا۔ مگر بادشاہ آزاد اور خود مختار تھا۔ اُس نے کسی کی بات کی پروا نہ کی اور قاصدوں سے کہلا بھیجا۔ کہ ہم کل تم سے ملاقات کریں گے +

دوسرے دن بادشاہ نے اُن کو سرِ دربار بُلایا۔ اور نہایت نرمی اور خندہ پیشانی سے پوچھا " میرے بھائی شاہِ بوہیمیا نے تمہیں میرے پاس کس لئے بھیجا ہے " ؟

قاصدوں کا سردار آداب بجا لا کر گویا ہوا :۔

" شاہِ بوہیمیا آپ سے اور دوسرے عیسائی بادشاہوں سے نہایت مؤدبانہ التماس کرتے ہیں۔ کہ جنگ و جدل اور لڑائی کے خاردار درخت کو جڑ سے کاٹ دیا جائے۔ آپس میں تعلقات پیدا کرنے کے لئے ایک باہمی مجلس بنائی جائے۔ اس مجلس میں اُن تمام امور کا تصفیہ کر لیا جایا کرے جن کے سبب خونریزیاں ہوتی ہیں " اور لڑائی جھگڑے کے بغیر فیصلے اور تصفیے کس طرح ہو سکتے ہیں۔ قاصدوں نے اس کے متعلق شاہِ بوہیمیا کی تجاویز بالتفصیل بیان کر دیں + شاہِ فرانس اس پیغام اور ان تجاویز سے بے حد مسرور ہوا۔ اور بول اُٹھا۔ " ان تجاویز کو اَور کوئی پسند کرے یا نہ کرے میں شاہِ بوہیمیا کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم کر لیتا ہوں " + قاصد اپنی توقع کے خلاف نہایت فرحاں و شاداں واپس لوٹے۔ بوہیمیا میں اُن کا پُرجوش استقبال کیا گیا۔ کیونکہ وہ کامیاب واپس آ رہے تھے +

اگرچہ اس وقت اس کوشش کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ کوئی مجلس اقوام نہیں بنائی گئی۔ مگر یہ خیال جو شاہِ بوہیمیا کے دل میں ۴۶۰ سال پیشتر پیدا ہوا تھا۔ عالمگیر ہو جائے گا۔ اور ضرور رنگ لائے گا +

(ترجمہ) مفتی محمد انور اقبال

بادۂ کہن

(ازجناب شیر علی خاں صاحب سرخوش)

بازگو از نجد و از یارانِ نجد

مخزنِ مرحوم کی اہم خصوصیات میں سے ایک یہ بھی تھی۔ کہ زندہ دلانِ پنجاب کی تمام سرزمین میں اُردو علم ادب کو کچھ اس طرح فروغ دلایا گیا تھا۔ کہ یہاں ایک درجہ کی "لٹرری جماعت" پیدا ہو گئی +

یہ "لٹرری جماعت" جس کے "سر دھرے" شیخ عبدالقادر صاحب بالقابہ بیرسٹرایٹ لا تھے۔ شمالی ہندوستان میں نہ صرف قدیم ادبی روایات کے احیا کا باعث ہوئی۔ بلکہ وہ "لطفِ سخن" "شوقِ زبان" اور ذوق نظم و نثر جو ہمارے دہلی و لکھنؤ کے قدیم بزرگوں اور ادیبوں کے دلوں کو گرمایا کرتا تھا۔ بعینہ ایک ویسی کیفیت، یہاں بھی رونما ہوئی جس میں مضمون نگاری اور جدت خیال کے لحاظ سے بعض نوجوانانِ پنجاب یادگارِ زمانہ ثابت ہوئے مثلاً ڈاکٹر سر اقبال ——چودھری خوشی محمد صاحب ناظر۔ غلام بھیک صاحب نیرنگ۔ شیخ محمد اکرم۔ اور مرزا سلطان احمد صاحب وغیرہم + ادبِ اُردو کے ذوق و شوق میں اہلِ پنجاب کی یہ خاص سرگرمیاں۔ اور ان کا یہ وجدان گو ایک نئی چیز نہ تھی۔ کیونکہ رسالہ مخزن سے بہت پیشتر بھی لاہور اور قصور میں پنجابیوں ہی کے ہاتھوں کئی رسالے ایک عرصے تک شائع ہو کر بند ہو گئے تھے۔ اور ان ہر دو مقامات میں متعدد انجمنیں ایسی قائم ہو کر رہ گئیں تھیں۔ کہ جنہوں نے دہلی و لکھنؤ کے مشاعروں کی یاد تازہ کر دی تھی۔ لیکن **مخزن** کا رنگ اس وقت بالکل جُداگانہ تھا۔ کیونکہ وہ نہ تو لکھنؤ کا پیامِ یار تھا نہ دلی کا غزلوں یا مذہبی مباحثوں کا رسالہ +

اگرچہ دلی یا لکھنؤ والوں کا ادبِ اُردو میں مقابلہ کرنا اہلِ پنجاب کے لئے کچھ آسان کام نہیں تھا۔ کیونکہ یہ ایک حد درجے کی معرکہ آرا اور دشوار طلب بات تھی۔ تاہم "مضمون نگاری" اور "نیچرل نظم" کی جدت نے اہلِ زبان کو بھی قائل کر دیا تھا۔ اور وہ **مخزن** کا لوہا ماننے لگے تھے۔ یہاں تک کہ اسکی جلدیں۔ مولوی الطاف حسین صاحب حالی۔ ڈاکٹر نذیر احمد خان صاحب شمس العلما مولانا شبلی وغیرہ کے بھی پیشِ نظر رہا کرتی تھیں۔ بلکہ زبانِ اُردو کے ایک اعلےٰ درجہ کے محقق۔ مورخ اور نیچرل شاعر علامہ شبلی نے تو اپنی ذاتی خط و کتابت میں بھی **مخزن** کے بعض پرانے مضامین کو

بہت بیش قیمت سمجھ کر اپنے دوستوں سے طلب کیا ہے +

دراصل **مخزن** کا اٹھان اور شیخ عبدالقادر صاحب کا عالم شباب قریب قریب توام تھے۔ اس رسالے کے لئے جو حد درجہ کا شغف۔ محنت۔ کوشش اور ذاتی رسوخ ضروری تھا۔ وہ اس وقت اس کو کام میں لانے کی ہمت رکھتے تھے۔ چنانچہ ان کی دلی آرزو برآئی۔ اور ایسی کچھ کہ **مخزن** جب ایک مرتبہ سسک سسک کر اس شہر لاہور میں بند ہوگیا۔ تو پھر دلی و دکن تک اور کوئی ادبی صحیفہ اس کی نظیر بہ مشکل پیدا کر سکا +

یوں تو ہندوستان میں سیکڑوں کیا ہزاروں ادبی مجموعے اور ماہوار رسالے سبزۂ خودرو کی طرح نمودار ہوئے اور اب بھی باستثنائے چند اچھے اچھے رسالے انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ لیکن جو کام **مخزن** مرحوم کی وساطت سے انجام کو پہنچا۔ وہ عظیم الشان تھا۔ یعنی اس کی بدولت شمالی حصۂ ملک میں بعض عدیم المثال نیچرل شعرا اور بیسیوں عمدہ عمدہ نثر نگار معرض وجود میں آگئے۔ چنانچہ اس رسالہ کی پرانی جلدیں وہ تمام ادبی مرقعے اب تک ہمارے پیش نظر کرتی ہیں یہ ایک ایسا ہی واقعہ ہے۔ جیسا کہ سر سید مرحوم کے تہذیب الاخلاق نے (جس کو مخالفین محض حسد سے تخریب الاخلاق کہا کرتے تھے) مولوی چراغ علی۔ نواب محسن الملک۔ علامہ شبلی۔ حالی۔ اور ذکاءاللہ وغیرہ ایسے قابل ترین ادبا کو میدان میں لاکھڑا کر دیا تھا۔ اُن کے وہ مضامین جو صحیفۂ موصوف میں شائع ہوتے تھے بعض محققین ادب و مذہب اب تک ان کی ٹوہ میں لگے رہتے ہیں +

اسی نظر سے اگرچہ **مخزن قدیم** کے پرانے مضامین میں سے بھی کچھ انتخابات کتابی صورت میں طبع ہو چکے ہیں۔ لیکن افسوس ہے۔ کہ یہ "مجموعے" تاہنوز تشنہ ہیں۔ کیونکہ ان میں بعض چوٹی کے محققانہ وادیبانہ مضامین درج ہونے سے رہ گئے ہیں۔ اور **مخزن** مرحوم کی قدیم جلدیں سنہ ۱۹۱۰ء یا سنہ ۱۹۱۲ء سے پہلے کی اس قدر کمیاب ہیں۔ کہ خاص خاص کتب خانوں میں بھی ان کا فقدان ہے +

ایک اچھا رسالہ یا روزنامہ ہمیشہ ایک لٹریری جماعت ہی کے ہاتھوں سے بنتا اور پروان چڑھتا ہے۔ خواہ وہ لٹریری جماعت اسی پرچے یا رسالے کی تجویز کردہ ہو۔ یا تہذیب الاخلاق کی طرح کسی خاص جماعت نے اپنا کوئی موقت الشیوع صحیفہ اپنے ایک خاص "آرگن" کے طور پر جاری کر دیا ہو۔ جناب شیخ صاحب (شیخ عبدالقادر مدیر اول) کے زمانے میں تو یہ دونوں باتیں **مخزن** کو حاصل ہوگئی تھیں۔ اب دیکھنا چاہیئے۔ کہ "شیخ دویم"

یعنی مولوی محمد حفیظ صاحب حفیظ جالندھری کے اوقاتِ ادارت میں ہمارا یہ ملکی رسالہ آئندہ کس کینڈے بیٹھتا ہے جناب حفیظ صاحب بالقابہ کی ادبی قابلیتوں کا میں خاص طور سے اعتراف کرتا ہوں۔ کہ آپ جس طرح "نظم" میں ایک "جدت" پیدا کر چکے ہیں۔ اب نثر میں بھی ضرور کوئی خاص رنگ اختیار کریں گے۔ اور یہ رسالہ دن دونی رات چوگنی ترقی کرے گا +

اُس وقت اس رسالے کے شیخ اول "نظم" کے کچھ دشمنی نہیں تھے۔ البتہ "نثر" میں کوس لمن الملک بجا چکے تھے۔ اور اب ہماری خوش قسمتی ہے کہ مخزن کے یہ شیخ دوئم۔ ایک مدت سے نظم اُردو میں کوس لمن الملک بجا چکے ہیں۔ اس لئے اگر رسالۂ ہذا کی سابق روایات کو تازہ کیا جائے۔ اور "زندہ دلانِ پنجاب" پھر اس بادۂ کہن کے متوالے ہوں تو کچھ تعجب نہیں ہے۔ کہ پھر ویسی ہی کیفیت پیدا ہو جائے +

اعتذار

ایک مرتبہ کا ذکر ہے۔ کہ مندرجہ ذیل خطوط بمبئی کے دو معززین نے ایک دوسرے کو ارسال کئے :-

(۱)

حامد زقندی مشہور (ظریفانہ مضامین لکھنے والے) ادیب کی طرف سے اسحٰق ولی بجاج نقادِ فن کی طرف :-

محترمی۔ بجاج !

میں عام طور پر سُنی سُنائی باتوں پر کان نہیں دھرا کرتا۔ لیکن ہر کلیے کی استثنا ہوتی ہے۔ ہم دونوں کے ایک باہمی دوست نے مجھے بتایا ہے۔ کہ کل کلب روم میں بہت سے ممبروں کی موجودگی میں آپ نے مجھ میں نقص نکالتے ہوئے میرے متعلق فرمایا۔ کہ "میں ظرافت سے عاری ہوں" میری اُس شہرت کے لحاظ سے جو مجھے ظریفانہ مضامین لکھنے کے متعلق حاصل ہے۔ اور بالخصوص اس مقبولیت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے جس نے اُردو کے سب بے مایہ رسائل کو مجھے معاوضہ دینے پر مجبور کر رکھا ہے۔ میرا خیال ہے۔ کہ آپ جیسے نامی نقاد کی یہ رائے میرے لئے ضرر رساں ثابت ہوگی رسائل کے مدیر جو پہلے ہی بُخل و حرص کا نمونہ ہوتے ہیں اپنے ہاتھوں کو بالکل سکیڑ لیں گے اور مٹھیاں باندھ کر جیبوں میں ڈال لینگے +

اس لئے میں عرض گزار ہوں۔ کہ آپ اپنی رائے کھلے مجمع میں واپس لیں۔ تاکہ وہ نقصان جو مجھے پہنچا ہے۔ اُس کی تلافی ہو جائے۔ میں سخت حیران ہوں۔ کہ آپ نے اس رائے کا اظہار ہی کیوں کیا جب کہ میں نے بارہا آپ کے مُنہ سے اپنے مضامین کی تعریف سُنی ہے اور آپ کو ان مضامین کی ظرافت پر ہنسی کے مارے لوٹتے ہوئے بھی دیکھا ہے۔ اور مزید براں بسا اوقات ہم نے مل کر چاء بھی پی ہے +

آپ کا مخلص

حامد زقندی

(۲)

اسحٰق ولی بجاج نقّادِ فن کی طرف سے۔ حامد زقندی مشہور ادیب کی طرف !

محبّی زقندی !

آپ کو غلط خبر ملی ہے۔ میں نے یہ نہیں کہا تھا۔ کہ آپ "ظرافت" سے عاری ہیں۔ میں نے کہا تھا کہ آپ "شرافت" سے عاری ہیں +

خادم

بجّاج

(۳)

حامد زقندی مشہور ادیب کی طرف سے۔ اسحٰق ولی بجاج نقّادِ فن کی طرف :-

مہربانِ من

آپ اندازہ نہیں کر سکتے۔ کہ آپ کی تردید نے مجھے کس قدر مسرّت پہنچائی ہے۔ اُس پرانی دوستی کو مدِّنظر رکھتے ہوئے۔ جو مجھے آپ سے حاصل ہے میں پہلا خط لکھنے ہی سے محترز تھا۔ لیکن آپ خود سمجھ سکتے ہیں۔ کہ میں نے یہ سب کچھ حالات سے مجبور ہو کر کیا تھا۔ میری شہرت کے آدمی کے لئے اس سے زیادہ تکلیف دہ اور کیا بات ہو سکتی ہے۔ کہ آپ جیسا نقّاد میرے متعلق مجمع عام میں کہے۔ کہ میں ظرافت سے عاری ہوں +

لیکن آپ کے اعتذار نے میری تمام شکایات رفع کر دی ہیں۔ بقول غالب۔ ع کام اچھّا ہے وہی جس کا مآل اچھّا ہے +

مخلص — زقندی

(ترجمہ) تاثیر۔ ایم۔اے

چنگیز خاں اور اُس کے پوتے کی کہانی

افسانہ

(از جناب نذیر احمد صاحب۔ بی۔ ایس۔ سی از کلکتہ)

"صدیاں گزر گئیں ترکستان میں ایک بادشاہ چنگیز خان نامی حکومت کرتا تھا اُس کا ایک پوتا تھا جس کا نام تھا ہلاکو خاں"

اندھا تاتاری قصہ خواں بلوط کے تنے سے کمر کو سہارا دیئے بیٹھا تھا۔ انہی لفظوں کے ساتھ اس نے اپنی اُن کہانیوں میں سے ایک کا آغاز کیا۔ جو اس سرزمین کی پارینہ ترکتازیوں کو ایک مرتبہ پھر نگاہوں کے روبرو لے آتی تھیں +

اندھے تاتاری قصہ خواں کے اِرد گِرد اُن تاریخی پتھروں کے اوپر جن کو زمانے کی بے پناہ گردش نے کسی گذشتہ حکمراں کے عالی شان محل سے ہٹا کر اُس جگہ لا پھینکا تھا + پٹھانوں اور ترکمانوں کا ایک گروہ شوخ رنگ کے جُبّے پہنے طلائی و کارچوبی اونچے کلاہ اوڑھے ہمہ تن گوش بیٹھا تھا +

شام ہو رہی تھی۔ آفتاب آہستہ آہستہ جیحوں میں ڈوبنے کے لئے جا رہا تھا۔ اُس کی سُرخ کرنیں درختوں کے گہرے سبز پتّوں میں سے گذرتی ہوئی شکستہ کھنڈروں کے بکھرے ہوئے اور کائی میں لپٹے ہوئے پتھروں پر روشن اور چمکیلے پھول کھلا رہی تھیں۔ ہوا بلوط کے عمر رسیدہ درختوں کی ٹہنیوں میں زمانۂ شجاعت کے گیت گا رہی تھی۔ اور پتّوں کی سرسراہٹ سے ایسی آوازیں آتی تھیں گویا ہوا میں جیحوں سے بھی زیادہ تیز رَو مگر غیر محسوس ندیاں بہہ رہی ہوں +

اندھے قصہ خواں کی آواز کمزور اور لرزتی ہوئی تھی۔ اُس کے جُھرّیوں بھرے چہرے سے اطمینان کے سوا اور کچھ مترشح نہ ہوتا تھا۔ کہانی کا لفظ لفظ اُسے زبانی یاد تھا۔ اور اُس کے مُنہ سے نکل کر سُننے والوں کے سامنے

گذرے ہوئے دَور کا نقشہ کچھ اس طرح کھینچ رہا تھا۔ کہ وہ اپنے ارد گرد وہی سماں محسوس کرتے تھے +

قصہ خواں نے بیان کرنا شروع کیا:۔

"ہاں تو چنگیز خاں اب بوڑھا ہو چکا تھا۔ لیکن اُس کے حرم میں بہت سی کنیزیں تھیں۔ وہ سب کی سب اُسے چاہتی تھیں۔ کیونکہ ابھی تک اُس کے گراں ڈیل جسم میں جذبات کی آگ فروزاں تھی۔ عورتیں ہمیشہ بہادر اور شجاع سے محبّت کرتی ہیں۔ خواہ اُس کے چہرے پر جُھرّیاں ہی کیوں نہ پڑی ہوں۔ مردوں کا حُسن اُن کی فیّاضی اور بہادری میں پوشیدہ ہے۔ اور اُسے نرم کھال اور گلابی رُخساروں کے نیچے تلاش کرنا بے سود ہے +

وہ سب کی سب اُسے چاہتی تھیں۔ لیکن خان کا دل حرم کی تمام کنیزوں کی نسبت (اور اُس کے حرم میں مختلف مُلکوں کی تین سو عورتیں تھیں) ایک کاسک کافرہ کی طرف بہت زیادہ مائل تھا۔ اُن کنیزوں میں سے ہر ایک بہار کے پھول سے زیادہ خوب صورت اور شہزادیوں کی سی زندگی بسر کرتی تھی۔ خان کے حکم سے اُن کے لئے ہر وقت لذیذ، مفرّح شربت لائے جاتے تھے۔ اور اُنہیں ہر جگہ اٹھکھیلیاں کرنے کی اجازت تھی +

لیکن خان اپنے دل کی پوری حدّت کے ساتھ صرف اُس کاسک حسینہ کو چاہتا تھا۔ وہ اپنی محبوبہ کو اُس برج میں بلواتا جہاں سے جیحوں کا نظارہ ہو سکتا تھا۔ اس بُرج میں ہر وہ نعمت جمع کر دی گئی تھی۔ جن سے عورتیں اپنی زندگی کو خوشگوار سمجھ سکتی ہیں۔ انگور کے پُرکیف رس۔ لذیذ مٹھائیاں۔ زربفت اور کمخواب کے حُلّے۔ سونے چاندی کے کھلونے۔ انواع واقسام کے قیمتی پتھر۔ قسم قسم کے ساز۔ ممالکِ دُور و دراز کے خوب صورت گانے والے پرندے۔ اور سب سے بڑھ کر عمر رسیدہ خان کی گرم اور جوان محبت +

وہ کئی کئی دن اُس بُرج میں بیٹھا ہُوا اُس کی باتیں سُنتا اور اُس کے مُنہ کو تکتا رہتا۔ اب وہ اپنی ہنگامہ انگیز زندگی کی تھکن سے چُور ہو کر سُستا رہا تھا۔ اگر اُس کے دل کو تسلّی تھی تو اس بات سے۔ کہ اس کے بعد اُس کے بیٹے "تولی خاں" کا جواں سال فرزند ہلاکو خاں اس آہوں سے پٹی ہوئی وسیع سلطنت کے اقتدار کو قائم رکھ سکے گا + کیا اُس نے ایک گرسنہ بھیڑیے کی سی تندی کے ساتھ رُوس پر حملہ نہیں کر دیا تھا! جہاں سے وہ بے اندازہ مالِ غنیمت۔ کنیزیں اور غلام سمیٹ لایا تھا۔ اور کیا وہ اُن سرزمینوں پر تاتاری حکومت کا خوف جلے ہوئے شہروں کی راکھ۔ بے جان جسم۔ اور بہتا ہُوا خون نہیں چھوڑ آیا! یقیناً وہ ایک قابل حکمران ثابت ہوگا +

ایک مرتبہ جب "ہلاکو خاں" روس کی ایک ایسی ہی مہم سے واپس لوٹا۔ تو اس کے اعزاز میں بہت بڑا جشن منایا گیا۔ سلطنت کے دور دراز گوشوں سے تمام باج گزار خان اور بیگ اس جشن میں شامل ہونے کے لئے آئے۔ دعوتیں اڑیں۔ اور طرح طرح کے کھیل کھیلے گئے۔ تاتاری سرداروں نے اسیرانِ جنگ کی سہمی ہوئی آنکھوں پر تیر چلا چلا کر اپنی قادر اندازی کا ثبوت دیا۔ اپنے بازوؤں کی طاقت اور تلوار کی دھار کا امتحان نہتوں کی گردنوں پر کیا۔ پھر انہوں نے ہلاکو خاں کی بہادری۔ اُس کے دشمنوں کی ہراسانی۔ اور خوفناک تاتاری جھنڈے کی سلامتی اور بقاءِ دوام کے لئے پے در پے جام لنڈھائے +

عمر رسیدہ چنگیز خاں اپنے بچے کی کامیابیوں پر بہت مسرور تھا۔ اور یہ اُس کے لئے اچھا تھا۔ اس اجل رسیدہ بوڑھے کے لئے واقعی یہ خیال خوش کن تھا۔ کہ اُس کے بعد سلطنت کی باگ ہلاکو خاں جیسے سعادت مند بیٹے کے مضبوط ہاتھوں میں ہوگی" +

بوڑھے قصہ خواں نے اپنے لفظوں پر زور دیتے ہوئے کہا :-

"میں پھر کہتا ہوں۔ کہ اُس کا ایسا خیال کرنا بہت ہی درست تھا۔ اُس نے تمام بیگ اور مرزا اکٹھے کئے تاکہ اُن کے سامنے اپنے ہونہار پوتے کو جتلا دے۔ کہ آدھی دُنیا کا فاتح اُسے کس قدر عزیز رکھتا ہے +

اُس نے افشردۂ انگور کا ایک بڑا جام اپنے ہاتھ میں بلند کرتے ہوئے کہا :-

"جانِ پدر ہلاکو ! میری آنکھوں کی ٹھنڈک۔ غیر فانی دیوتاؤں کی برکتیں تجھ پر نازل ہوں۔ بزرگوں کی پاک روحیں تجھ پر مہربان رہیں" +

سب نے اپنی بھاری آوازوں کو ہم آہنگ کرکے آسمان کے غیر فانی دیوتاؤں اور ہلاکو کی حمد گائی اس کے بعد چنگیز خاں بولا " زندگی دینے والا دیوتا عظیم الشان ہے۔ دیکھو اُس نے میرے دلیر اور جری بیٹے کے جسم میں میری زندگی کو از سرِ نو جوان کر دیا ہے۔ میں اپنی کمزور نظر سے اُس وقت کا نظارہ کر رہا ہوں جب آفتاب اپنی کرنوں کو میری آنکھوں تک نہیں پہنچا سکے گا۔ اور کیڑے میرے دل کے گوشت میں رخنے ڈال دیں گے لیکن میں اپنے بیٹے کے خاکی بدن میں پھر بھی زندہ موجود رہوں گا۔ ہاں اتنا ہی زندہ جتنا اس وقت ہوں۔ غیر فانی دیوتا ہر بات پر قادر ہیں۔ اُن کی برکتیں ہم پر نازل ہوں۔ میرے بیٹے کے بازو مضبوط ہیں۔ اس کے دل میں خوف کی جگہ نہیں۔ اس کا دماغ الجھنوں سے پاک ہے۔ میرا بیٹا کس قدر سعادت مند ہے۔ ہلاکو میرے بیٹے مانگ! تو اپنے باپ سے کیا مانگتا ہے !! کہہ دے ——— اور تیری آرزو

پوری کردی جائے گی ⁂

بوڑھے خان کی آواز ابھی گونج ہی رہی تھی۔ کہ ہلاکو خاں اپنی جگہ سے اُٹھا۔ اُس کی آنکھیں سیاہ اورچمک دار تھیں۔ اُس سمندر کی طرح جس پر رات چھا گئی ہو۔ ان میں اک آگ تھی۔ جیسی کوہستان کے کسی عقاب کی آنکھوں میں ہو۔ اُس نے کہا:۔ "دُنیا کے تاج داروں کے شہنشاہ! مَیں تجھ سے وہ کاسک کنیز مانگتا ہوں ——— !!!"

چنگیز خاں چُپ رہ گیا۔ مگر صرف اتنی دیر کے لیئے جس میں اُس نے اپنے دل کی کپکپی کو رفع کر لیا ——
"لے لے۔ تو اُسے جنگ کے خاتمے پر لے سکتا ہے ......"

بہادر ہلاکو کا چہرہ خوشی سے سُرخ ہوگیا۔ اُس کی عقابی آنکھیں مسرّت سے اور بھی چمک اُٹھیں۔ وہ تن کر کھڑا ہوگیا۔ اُس نے خان سے مخاطب ہو کر کہا:۔

فاتح اعظم۔ شہنشاہ۔ میرے بابا! میں جانتا ہوں تو مجھے کیا دے رہا ہے۔ ہاں میں جانتا ہوں تیرا بیٹا تیرا غلام ہے۔ میرے خون کا ایک ایک قطرہ تیرے لیئے وقف ہے۔ اگر میری سو جانیں بھی ہوں تو سب تجھ پر نچھاور ⁂

خاں نے کہا۔ "مجھے کوئی چیز درکار نہیں" اور وہ سپید سر۔ جس میں دُنیا کو اُس سرے تک تہ وبالا کر دینے کا سودا ابھرا ہوا تھا۔ اور جس پر کامیابی کے سہرے بندھتے رہے تھے۔ اُس کے سینے پر جُھک گیا +

دعوت بہت جلد ختم ہو گئی۔ دونوں محل سے نکل کر حرم سرائے کی طرف چلے۔ وہ ساتھ ساتھ جا رہے تھے۔ لیکن چُپ تھے۔ رات اندھیری تھی۔ نہ چاند نظر آتا تھا۔ نہ تارے۔ بادلوں نے آسمان کا پردہ ڈھک لیا تھا۔ وہ دیر تک خاموش چلتے رہے۔ آخر چنگیز خاں نے کہا:۔

"میری زندگی کا پیمانہ روز بروز بھرتا جاتا ہے۔ میرے دل کی دھڑکن ہر روز مدھم ہوتی جا رہی ہے۔ کل کی نسبت میرے سینے کی گرمی آج کم ہے ——— سُن۔ میری زندگی کی روشنی اور ٹھنڈک اُس کاسک کنیز کی محبت ہے ——— مجھے بتا۔ ہلاکو مجھے بتا۔ کیا واقعی تو اُس کے بغیر نہیں رہ سکے گا۔ تو میری سو کنیزیں لے لے۔ بس میں کہتا ہوں سب کی سب لے لے۔ مگر اس کو میرے لیئے چھوڑ دے ———"

ہلاکو نے ایک آہ بھری۔ اور کچھ نہ کہا۔

زندگی کی کتنی راتیں میرے لئے باقی ہونگی - میں کتنے دن اور جی لوں گا - اس دُنیا میں میرا بسیرا اور چند روز سے زیادہ نہیں رہ سکتا - اور یہ روسی لڑکی میری حیات کی آخری خوشی ہے - وہ مجھے سمجھتی ہے - اور مجھ سے محبت کرتی ہے - جب وہ نہ ہوگی - تو پھر مجھ سے کون محبت کرے گا - ہاں مجھے ــــ ایک بوڑھے کو ــــ کون محبت کرے گا - ہلاکو! اُن سب میں سے کوئی بھی نہیں - ایک بھی نہیں ــــــــــ"

ہلاکو نے کچھ جواب نہ دیا +

"مجھے بتا میں کس طرح زندہ رہ سکوں گا - جب مجھے یہ خیال آئے گا - کہ تو نے اُسے اپنے بازوؤں میں لپیٹ رکھا ہے - ہلاکو! ہم عورت کے معاملے ہرگز باپ بیٹے نہیں رہ سکتے - عورت کے لئے ہم سب مرد ہیں - ایک دوسرے کے رقیب اور بس - کاش میرے بدن کے تمام پُرانے زخم - وہ زخم جو میں نے مسلمانوں کے مقابلے میں کھائے ہیں - ایک دم کُھل پڑیں - اور میرا سارا خون بہ جائے - ہلاکو میرے بیٹے! کیا ہی اچھا ہو - کہ میری زندگی کی شمع اس رات کے ختم ہونے سے پہلے پہلے بُجھ جائے"!

لیکن اُس کا جواں سال پوتا خاموش ہی رہا - حرم کے دروازے پر پہنچ کر دونوں رُک گئے - اُن کے سَر اُن کے سینوں پر جُھک گئے - اور وہ دیر تک یوں ہی کھڑے رہے - اُن کے گردو پیش تاریکی ہی تاریکی - اندھیرا ہی اندھیرا تھا - اور آسمان پر بادل ایک دوسرے کے تعاقب میں دوڑ رہے تھے - لرزتی ہوئی ہَوا درختوں میں کوئی پُراسرار گیت گاتی ہوئی معلوم ہوتی تھی - ہلاکو نے دھیمی آواز سے کہا:" میں ایک مُدّت سے اُس کے لئے اپنا دل کھو چکا ہوں"+

خان نے جواب دیا:" میں جانتا ہوں - اور یہ بھی جانتا ہوں کہ وہ تجھے نہیں چاہتی"+

"جب مجھے اُس کی یاد آتی ہے - تو میرا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا ہے"+

"کیا فاتح ایشیا کے سینے میں دل نہیں"؟

وہ پھر چپ ہو گئے - ہلاکو نے ایک آہ بھری +

"اب میں سمجھا - اس پختہ کار راہب نے کیا ہی سچ کہا تھا - کہ عورت مرد کے لئے ہمیشہ تکلیف دہ ہوتی ہے - وہ اگر حسین ہے - تو دوسرے اُس پر دستِ طمع دراز کرنا اپنا حق سمجھتے ہیں - اور اُس کا مالک رقابتوں کی جلن میں مبتلا ہو جاتا ہے - اور اگر وہ بدصورت ہے - تو اُس کا شوہر دوسروں کی خوش نصیبی پر رشک کرنے لگتا ہے - اور اگر اُس کی صورت معمولی ہو - یعنی نہ حسین اور نہ کریہہ تو مرد پہلے اُسے خوب صورت تصور کر لیتا ہے - پھر جب

اُسے اپنی غلطی کا احساس ہوتا ہے۔ تو اُس کا دُکھ دوسروں سے کئی درجہ بڑھ جاتا ہے۔ سچ ہے مرد کو عورت سے رنج کے سوا اور کچھ حاصل نہیں "۔

بوڑھے خان نے کہا:۔ "دُکھے ہوئے دل کے لئے عقل کوئی دارو نہیں "۔

ہلاکو بولا:۔ "بابا ہم دونوں کی حالت رحم کے قابل ہے "۔

خان نے اپنا سر اُٹھایا۔ اور غور سے پوتے کی طرف دیکھا۔ اُس کی آنکھوں سے تاسف ظاہر ہوتا تھا۔

ہلاکو نے کہا:۔ "آؤ ہم اُسے ہلاک کر ڈالیں "۔

خان ایک لمحہ بھر سوچتا رہا۔ پھر اُس نے آہستگی سے کہا:۔ "تو اپنے نفس کو اُس سے اور مجھ سے زیادہ عزیز رکھتا ہے "؟

"ہاں۔ اور کیا تو بھی ایسا ہی نہیں۔ میرے عالی شان بابا "؟

وہ پھر خاموش ہو گئے۔

خان درد سے نڈھال آواز میں بولا:۔ "تو سچ کہتا ہے۔ اندوہ نے بوڑھے کو بچہ بنا دیا تھا "۔

"خوب۔ تو ہمیں اُس کو ہلاک کر دینا چاہیئے "؟

خان نے جواب دیا:۔ "میں اُس کو تجھے نہیں دے سکتا۔ او دیوانو! یہ میں کیسے کر سکتا ہوں "!

"میں اَور زیادہ صبر نہیں کر سکتا۔ اُس کو مجھے دے ڈال۔ یا میرا دل میرے سینے سے نکال پھینک "!

خان چُپ تھا ــــ

"یا چلو ہم چل کر اُس کو چٹانوں پر سے دریا میں پھینک دیں "۔

"ہم چل کر اُس کو چٹانوں پر سے دریا میں پھینک دیں "!

بوڑھے خان نے اِن لفظوں کو دہرایا۔ اُس کی آواز اُس کے پوتے کی صدا ئے بازگشت معلوم ہوتی تھی۔ دونوں حرم کے اندر داخل ہو گئے۔ جہاں وہ ایک قالین پر ابھی سے سو رہی تھی۔ دونوں اُس کے پاس آ کھڑے ہوئے۔ اور دیر تک اُس کی طرف تکتے رہے۔ بوڑھے خان کی آنکھوں سے آنسو بہ نکلے اُس چنگیز خان کی آنکھوں سے جس کی آنکھیں قوموں کی گریہ و زاری پر استہزا کیا کرتی تھیں۔ اس کے گرم آنسو سپید داڑھی پر آبدار موتیوں کی طرح دمک رہے تھے۔ اس کے پوتے کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ اور جب وہ کاسک کنیز کو جگانے لگا۔ تو اپنے تُند جذبے کو چھپانے کے لئے اُس نے دانتوں کو زور سے پیسا۔ وہ جاگ اُٹھی

صبح ایسے گلابی اور نازک چہرے پر اُس کی آنکھیں حیا کے پھول کی طرح کھلتی ہوئی معلوم ہوئیں۔ اس کی نگاہ ہلاکو پر نہ پڑی۔ اور اُس نے اپنے سُرخ لبوں کو بوڑھے خان کی طرف کھول دیا +

"میرے عقاب" یہ کہہ کر وہ ایک بوسۂ رقصندہ کی طرح آگے بڑھی +

خان نے نرمی سے کہا۔ "اُٹھ! تو ہمارے ساتھ جیئے گی" +

تب اُس نے ہلاکو۔ اور اُن آنسوؤں کو دیکھا۔ جو اُس کے بوڑھے اور عظیم الشان "خان" کی آنکھوں سے بہ رہے تھے۔ وہ معاملہ شناس تھی۔ اک آن میں بات کی تہ کو پہنچ گئی +

اس نے کہا۔ "چلو۔ میں تیار ہوں میں نہ ایک کے لئے ہوں نہ دوسرے کے لئے! یہی نا! ہاں — مضبوط دل اسی طرح فیصلہ کیا کرتے ہیں۔ چلو — ابھی چلو —"

تینوں خاموشی کے ساتھ جیحوں کی طرف چل کھڑے ہوئے۔ ہوا فرّاٹے بھر رہی تھی + لڑکی نازک تھی۔ اور جلد ہی تھک گئی۔ اس کا نسوانی غرور اُسے کسی قسم کی درخواست کرنے سے مانع تھا۔ ہلاکو خاں نے یہ دیکھ کر کہ وہ پیچھے رہی جاتی ہے۔ کہا۔ "کیا تو موت سے ڈرتی ہے"!

اُس نے جوان پر غصہ بھری نگاہ ڈالی۔ پھر اپنے پیروں کی طرف اشارا کیا۔ جن سے خون بہ رہا تھا +

ہلاکو خاں نے اپنے کُشادہ بازو اُس کی طرف بڑھائے اور کہا۔ "آ میں تجھے اُٹھا لوں"!

لیکن لڑکی نے باہیں اپنے بوڑھے عقاب کی گردن میں حمائل کر دیں۔ اور اُس نے اُسے گود میں اُٹھا لیا۔ چنگیز خاں کے لئے اس کا بوجھ ایک پھول سے بھی کم تھا۔ وہ اس کی گود میں لپٹی ہوئی۔ اپنے ہاتھوں سے اُن ٹہنیوں کو ہٹا دیتی تھی۔ جو خان کے رستے میں حائل ہوتی تھیں +

وہ دیر تک چلتے رہے۔ آخر کار جیحوں کی موجوں کا ابتدائی شور انہیں سُنائی دیا۔ ہلاکو جو اپنے بابا کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ یکایک بولا "مجھے آگے آگے چلنے دے بابا! طبیعت مجھے اُکسا رہی ہے۔ کہ میں اپنا خنجر تیری گردن میں پیوست کر دوں"؟

"تو پھر آگے بڑھ چل۔ دیوتا تیری خواہش پوری کریں یا تجھے معاف کر دیں۔ سب کچھ اُن کی مرضی کے مطابق ہو! لیکن تیرا باپ تجھے معاف کرتا ہے —— وہ جانتا ہے۔ کہ عشق کیا بلا ہے"!

آخر طوفانی جیحوں ان کے سامنے آ گیا۔ اور اب وہ چٹانوں کے اوپر جھکے ہوئے تھے۔ اُن کے نیچے

بہت دُور تک فضا تاریک تھی اور لامحدود ۔ چٹانوں کے قدموں میں ۔ اندھیرے ۔ ٹھنڈ اور خوف میں گھری ہوئی پانی کی موجیں اپنے اپنے راگ گانے جا رہی تھیں +

"الوداع" خان نے حسینہ کو چومتے ہوئے کہا +

ہلاکو نے جُھک کر کہا: "الوداع"+

لڑکی نے نیچے دیکھا ۔ جیحوں نے خوفناک شور مچا رکھا تھا ۔ وہ ڈری اور پیچھے ہٹ گئی ۔ اور اپنے سینے کو باہوں میں زور سے دبالیا +

"مجھ سے اپنے آپ گرا نہیں جاتا ۔ تم مجھے پکڑ کر نیچے پھینک دو ــــــ"

ہلاکو نے پھر اپنے ہاتھ اُس کی طرف بڑھائے ۔ مگر وہ خان کے بازوؤں میں چلی گئی ۔ خان نے اُسے بہت سا پیار کیا ۔ اُس کی پیشانی چومی ۔ پھر اُسے پکڑ کر ہوا میں بلند کیا ۔ اور چٹانوں سے نیچے پھینک دیا +

اُن کے نیچے موجوں کا ناچ اور گانا اس قدر بلند آہنگ تھا ۔ کہ کسی نے اُس کے گرنے کی آواز نہ سُنی ۔ نہ کوئی صدا اُبھری نہ کوئی چیخ بلند ہوئی + خان چٹان پر لیٹ گیا ۔ اور اس ظلمت کی طوفانی فضا میں خاموش نگاہیں گاڑ دیں ۔ جہاں جیحوں سیاہ بادلوں سے ملا ہوا تھا ۔ جہاں موجیں اپنے بھیانک گیت الاپ رہی تھیں اور جہاں سے تند ہوا آ آ کر اُس کی داڑھی کے سپید بالوں کو پریشان کر رہی تھی ۔ ہلاکو اُس کے قریب دونوں ہاتھوں سے مُنہ کو چھپائے ایک پتھر کے مجسّمے کی طرح ساکت اور خاموش کھڑا تھا +

وقت گزر رہا تھا ۔ ہوا بادلوں کو ایک دوسرے کے پیچھے بھگائے لئے جا رہی تھی ۔ بادل تاریک اور اُداس تھے اُس بوڑھے خان کی طرح تاریک اور اُداس جو اس وقت بلند چٹانوں کے اوپر لیٹا ہوا تھا +

ہلاکو نے پکارا: "بابا ۔ چلو محل میں چلیں"+

"ٹھہر!" خان نے اس طرح کہا ۔ گویا وہ کچھ سُن رہا ہو ۔ وقت گزرتا گیا ۔ موجیں بدستور شور کر رہی تھیں ۔ ہوا پہلے کی طرح اب بھی چٹانوں سے ٹکراتی ہوئی گزرتی اور درختوں میں پہنچ کر چیختی چلاتی تھی +

"بابا اُٹھ گھر چلیں"+

"تھوڑی دیر اور ٹھہر!"

ہلاکو نے کئی مرتبہ اُسے لوٹ چلنے کے لئے کہا ۔ مگر خان نے اُس جگہ سے جنبش نہ کی جہاں وہ

اپنی بقیہ زندگی کی اُمیدوں کو برباد کر چکا تھا +

لیکن تابکے۔ آخر وہ اُٹھ بیٹھا۔ اور ضبط و غرور کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ اس کی تیوری چڑھی ہوئی تھی اُس نے ایک کھوکھلی آواز میں کہا "ہاں۔ چل !"

وہ تھوڑی ہی دُور چلے تھے۔ کہ خان رُک گیا +

"لیکن ہلاکو ! میں کہاں جا رہا ہوں۔ کیوں جا رہا ہوں ؟ جب وہ۔ جو میری جان تھی جاتی رہی۔ پھر کیا وجہ ہے۔ کہ میں زندہ رہنے کی خواہش کروں۔ میں بوڑھا ہو چکا ہوں۔ اب مجھ سے کوئی محبت نہیں کریگا۔ اور جب تو کسی انسان کا دامن محبت سے خالی دیکھے تو سمجھ لے کہ اس کا جینا بے فائدہ ہے" +

"لیکن فاتح بابا تیرے پاس دولت ہے۔ طاقت ہے۔ شہرت ہے" +

"مجھے صرف اُس کی ایک مُسکراہٹ لا دے۔ اور تو یہ سب کچھ اپنے لئے لے لے۔ یہ سب بے جان ہیں۔ صرف عورت کی محبت ایک شے ہے جو زندہ رہتی ہے۔ انسان کی جھولی عشق ہی سے خالی ہے۔ تو اُس کے بدن میں زندگی کی تلاش بے سود + وہ ایک کنگال ہے۔ اُس کی حالت پر ترس کھانا روا ہے۔ میرے بیٹے الوداع۔ غیر فانی دیوتاؤں کی برکتیں تیری زندگی کے ہر دن اور رات پر نازل ہوں" +

خان نے پھر اپنا رُخ جیحوں کی طرف پھیر لیا +

"بابا۔ بابا" ! ہلاکو چلایا۔ "بابا ! مگر وہ کچھ اور نہ کہہ سکا۔ اور وہ جس پر موت مُسکرا رہی ہو اُسے کوئی بھی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ روح کی محبت زندگی سے ٹوٹ جائے تو اُسے پھر کون جوڑ سکتا ہے !

"چھوڑ دے ــ مجھے جانے دے ......"

"او لافانی دیوتاؤ ...... !"

ایشیا کا فاتح۔ چنگیز خاں تیزی کے ساتھ چٹان کے کنارے کی طرف جھپٹا۔ اور ایک ہی دفعہ اپنے آپ کو نیچے گرا دیا + اُس کے پوتے نے اُسے نہیں روکا۔ اتنا وقت ہی نہ تھا۔ کہ وہ اُسے پکڑ سکتا۔ جیحوں سے پھر بھی کوئی آواز نہ اُٹھی۔ نہ کوئی چیخ۔ نہ اتنے بڑے خان کے گرنے کی صدا + صرف بھاری موجیں اپنا دف بجا رہی تھیں۔ اور تُند ہوا میں بھوت اپنے بھیانک راگ گائے چلے جا رہے تھے +

ہلاکو خاں دیر تک چٹان سے نیچے دیکھتا رہا۔ آخر کار اُس نے بلند آواز میں کہا "غیر فانی دیوتاؤ مجھے بھی ایسا قوی دل دیجیو !

پھر وہ رات کی تاریکی میں واپس لوٹ پڑا ...."

اندھے تاتاری قصہ خواں نے کہا: اور اس طرح فاتح ایشیا چنگیز خاں کا عہدِ سلطنت ختم ہو گیا۔
اُس کے بعد اُس کا پوتا ہلاکو خاں دیر تک وسط ایشیا اور اُس کے مغلوب ملکوں پر خونخوارانہ حکومت کرتا رہا +

دوست ــــ اور ــــ دشمن

ایک قیدی جسے حبس دوام کی سزا ملی ہوئی تھی۔ کسی طرح قید خانے سے بھاگ نکلا۔ محافظ اُس کے تعاقب میں بھاگے چلے آرہے تھے +

قیدی اپنی پُوری قوت سے بھاگ رہا تھا۔ محافظ ایک ایک کر کے پیچھے رہنے شروع ہو گئے +

مگر افسوس راستے میں ایک تنگ مگر بہت گہری ندی حائل ہوتی تھی۔ جس کے کنارے بہت اونچے تھے۔ قیدی تیرنا نہیں جانتا تھا +

ایک پتلا بوسیدہ تختہ دریا کے آر پار رکھا تھا قیدی دریا کو عبور کرنے کے لئے اُس تختے کی طرف بڑھا۔ مگر سوءِ اتفاق سے اُس وقت پاس ہی دریا کے کنارے پر دو شخص کھڑے تھے۔ جن میں سے ایک اُس کا بہترین اور دیرینہ دوست اور دوسرا اُس کے خون کا پیاسا دشمن تھا +

دشمن یہ حالت دیکھ کر خپکا ہو رہا۔ اُس نے صرف اپنی مٹھیوں کو بھینچا اور بس۔ مگر دوست نے پورے زور سے چلّا کر کہا: "ارے! خدا کے لئے یہ کیا کرنے لگے ہو؟ کہیں پاگل تو نہیں ہو گئے؟ سوچو تو سہی۔ دیکھتے نہیں۔ یہ تختہ بالکل بوسیدہ ہے؟ یہ تمہارے بوجھ سے فوراً ٹوٹ جائے گا۔ اور تم غرق ہو جاؤ گے"!

قیدی نے گھبراہٹ کی حالت میں کہا: "مگر پار جانے کے لئے اور کوئی راستہ نہیں .... دیکھتے نہیں ہو ...... وہ تعاقب میں آرہے ہیں" یہ کہہ کر وہ پھر بھاگ اٹھا اور تختہ پر پہنچ گیا +

مگر اس کا قلبی دوست فوراً پکار اٹھا: "میں یہ ہرگز نہیں ہونے دوں گا! .... نہیں میں نہیں

موت کے مُنہ میں نہیں جانے دوں گا"! اور یہ کہتے ہوئے اُس نے بھاگ کر قیدی کو پیچھے سے پکڑ لیا۔ اور اپنی طرف کھینچنے لگا۔ اس کشمکش میں تختہ ٹوٹ گیا اور قیدی ندی میں جا پڑا اور آنِ واحد میں غرق ہو گیا +

دُشمن نے اطمینان کا سانس لیا۔ اور مُسکرا کر وہاں سے چل دیا۔ مگر دوست نے دریا کے کنارے پر بیٹھ کر غریق کے غم میں آہ و زاری شروع کر دی +

اُسے دوست کی موت کے لئے اپنے آپ کو الزام دینے کا خیال ہرگز نہیں آیا۔........ ایک لمحہ بھر کے لئے بھی نہیں +

وہ آزردہ ہو کر کہنے لگا۔ "آہ اُس نے میری ایک نہ سُنی ...... ایک نہ سُنی"!

تھوڑی دیر کے بعد اُس نے پھر کہا۔ "لیکن اگر ایسا نہ ہوتا۔ تو اُسے اپنی تمام عمر جیل خانے کی مصیبتوں میں بسر کرنی پڑتی۔ کچھ ہی ہو اب اُسے تمام تکلیفوں سے رہائی مل گئی ہے! اور پہلے سے بدرجہا بہتر ہو گیا ہے + میرا خیال ہے۔ کہ اُس کی قسمت میں یہی لکھا تھا۔ —— اور اس کے باوجود میں اپنی نرم دلی کی وجہ سے غمگیں ہوں"!

اور وہ سادہ لوح۔ نیک دل انسان۔ عمر بھر اپنے گمراہ دوست کی بد انجامی پر ماتم کرتا رہا!

بدرالدین - بدرؔ

رسید

ہمارے پاس ایک کتاب "آلو" تبصرہ کے لئے موصول ہوئی ہے۔ اس میں فاضل مؤلف (پروفیسر جی۔ ایم۔ ملک۔ ایم۔ ایس۔ سی۔ (ایگریکلچر) امریکہ) نے آلو کی کاشت اور ذخیرہ کرنے کے متعلق ہدایات اور ذاتی تجربات کے علاوہ یورپ و امریکہ کے مفید مطلب طریقے اور بیش قیمت معلومات بھی شامل کر دی ہیں اُردو زبان میں یہ اپنی قسم کی پہلی کتاب ہے۔ ہم آئندہ اشاعت میں اس کتاب پر مفصّل تبصرہ کریں گے +

قیمت صرف ایک روپیہ۔ ملنے کا پتہ:۔ دی امریکن سیڈ اینڈ نرسری کمپنی ۲۵ میکلوڈ روڈ لاہور

اسسٹنٹ ایڈیٹر

آئینۂ حرم

—— حضرتِ چغتائی کا شاہکار

مغل ہندوستان میں صدیوں حکومت کرتے رہے۔ زندگی کے ہر شعبے میں ان کے اثرات باقی ہیں (ابھی تک ۱۸۵۷ء کے جنگِ انقلاب کو دیکھنے والے موجود ہیں) لیکن ان کی عظمت کی یاد اگر باقی ہے۔ تو تاج محل، سکندرہ، سیکری، عرفی اور نظیری کی بدولت ہے۔ یہ اس لئے۔ کہ کسی قوم کی ترقی اس کے تمدن اور تہذیب سے جانچی جاتی ہے۔ اور ان کا آئینہ اُس عہد کے فنونِ لطیفہ ہوتے ہیں +

وقت کا سمندر واقعات کے گرد و غبار سے اٹ جاتا ہے۔ اور دیکھنے والے کی آنکھوں پر پردہ چھا جاتا ہے۔ مگر جمالیات سے تہ نشین جواہر نظر آتے ہیں۔ اور آنکھیں اس سُرمۂ مُفت نظر سے دُور کی گہرائیوں تک جا پہنچتی ہیں + تاج محل مغلوں کے ذوقِ نظر، وسعتِ ہمّت اور پاکیزہ خیالی کا ایسا زندہ شاہد ہے۔ کہ اسے متعصب ترین تاریخ نویس بھی جھٹلا نہیں سکتے۔ اسے ایطالوی انجنیر کا کارنامہ اس لئے بتایا جاتا ہے۔ کہ مغلوں کی عظمت میں کمی واقع ہو۔ خیر تاج محل تو ابھی تک نئی نویلی دُلہن کی طرح آراستہ و پیراستہ ہے۔ مگر بقول عرفی ؎

از نقش و نگار در و دیوارِ شکستہ　　آثار پدید است صنادیدِ عجم را

جملہ فنونِ لطیفہ کی طرح مصوری بھی تہذیب و تمدن کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ بالخصوص چغتائی کہ اس کی تصاویر میں مصوری کی رُوح کھنچ کر آئی ہوئی ہے۔ اسلامی Culture کا نہایت صحیح نمائندہ ہے۔ وہ نتائج جو تاریخ کے بے جان اوراق گردانںے سے پُوری قوت کے ساتھ دل نشین نہیں ہوتے۔ اس کی تصاویر کو ایک نظر دیکھنے سے حاصل ہو جاتے ہیں +

افراد کے لباس آرائش، چہرے اور دیگر اعضا کی ساخت اور اُن کے باہمی جوڑ سے تمام قوم کی طبعی نفاست اور تہذیب کی حقیقت واضح ہوتی ہے" آئینۂ حرم" اسلامی نسائیت کا جوہرِ اصلی ہے۔ مصوّر کی وہ کاوش جس سے اس نے تصویر کے بال بال کو الگ الگ ایک مستقل زندگی بخشی ہے۔ اس کاوش کا پتہ دیتی ہے جس کا صحیح استعمال صدیوں کے تجربے بعد سیکھا گیا ہے۔ اور جو تہذیب کا بہترین معیار ہے۔ لباس، زیورات

بالوں کی طرف دیکھو مواد وہی ہے۔ جو۔ ہر حوا کی بیٹی کا ورثہ ہے۔ مگر ہر چیز کو اس انفرادی طریقے سے برتا گیا ہے۔ کہ جب دیکھو نیا عالم نکلتا ہے۔ سر کی پوشش۔ بالوں کی بندش، آویزوں کی لٹک۔ اس ذوقِ صحیح کے شواہد ہیں۔ جو اصلِ نسائیت ہے۔ وہ نسائیت جو اپنی زندگی کا حُسن خاوند کی نظروں میں دیکھتی ہے۔ اور اپنی جملہ لطافتوں کو بچوں کی تربیت پر صرف کرتی ہے۔ اور اس طرح ایک سچے صنّاع کی طرح ان مظاہر کے ذریعے اپنی حکمرانی کے ذوق کو صورت پذیر کرتی ہے!! ـــــ ان آنکھوں کی تہوں میں امکانات کی وہ دُنیا آباد ہے۔ جسے عورت کے قوتِ خلاقیت سے مرتعش ہاتھ صدیوں سے استوار کر رہے ہیں۔ اور کبھی اسے کامل انسانوں کی بستی بنا کر رہیں گے۔ جہاں آرزوئیں حقیقت کا لباس پہن کر چلتی ہیں۔ اور خوابیں تعبیروں سے دوش بدوش ہیں ـــــ

اس تصویر میں چغتائی نے کمال جرأت سے ایک پیش پاُافتادہ اور سہل موضوع لیا ہے! اور وہ فطرت کا نقال بنے بغیر اپنی کیفیات کی ترجمانی میں کامیاب ہو گیا ہے۔ شاعر اور مصور عام طور پر پیش پاُافتادہ مضامین سے گریزاں رہتے ہیں۔ کیونکہ جدت خواہ وہ کس قدر بھی کمزور کیوں نہ ہو۔ محض جذبات ہونے کی وجہ سے داد حاصل کر لیتی ہے۔ لیکن جب اسے قوتِ اظہار پر پورا اعتماد ہوتا ہے۔ وہ پاؤں کی گرد کو بھی اس طرح گوندھتا ہے کہ ایک زندہ مجسمہ روحِ حیات سے گرم و بے تاب ہو کر چلنے پھرنے لگتا ہے! ـــــ

ہر چند کارپردازانِ مخزن نے اسے دو رنگ دے کر شائع کیا ہے۔ مگر جن نظروں کے سامنے اصل تصویر ہے ان کے لئے رنگوں کی ترجمانی کے اعتبار سے یہ ایک سعی ناکام ہے +

اصل تصویر کا خلفی رنگ سُرخ تھا۔ اور میں نے اس کا نام لالۂ احمر تجویز کیا تھا۔ لیکن تصویروں کے نام رکھنا باعتبارِ فنِ مصوری غیر ضروری شے ہے اور زیادہ سے زیادہ نام رکھنے والے کی ذہنیت کا آئینہ ہوتا ہے میں نے مصور کے حقیقی موضوعِ خیال کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اس مطبوعہ تصویر کا نام "آئینۂ حرم" رکھ دیا ہے۔ حرم تمام اسلامی تہذیب کا آئینہ ہے اور حرم کا آئینہ یہ روحِ نسائیت ہے!! ـــــ

تاثیر۔ ایم۔ اے

اخبار علمیّہ

(از مولوی محمد عبد اللہ صاحب)

امپیریل گیلری آف آرٹ لندن نے اس مرتبہ فیصلہ کیا ہے۔ کہ تمام برٹش امپائر کے چیدہ چیدہ مصوّروں کی دو سو تصویریں ایک نمائش کے ذریعے دکھائی جائیں۔ اور ہندوستان کے حصّے میں کل ۱۲ تصویریں آئی تھیں۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے ایک سرکاری کمیٹی دہلی میں منعقد ہوئی تھی۔ جس نے تمام ہندوستان میں سے صرف ۹ تصاویر انتخاب کیں اور ہم نہایت فخر سے اس امر کا اظہار کرتے ہیں۔ کہ ان میں سے پنجاب کے مائیہ ناز مصوّر عبد الرحمٰن صاحب چغتائی کی دو تصویریں ہیں۔ اور باقی سات ہندوستان بھر کے دیگر مصورین کی ہیں۔ یہ نمائش آج کل لندن میں ہو رہی ہے +

مشہور و معروف مستشرق ڈاکٹر سر ڈینیسن راس نے رائل سوسائٹی آف آرٹس کے شعبۂ ہندیہ میں برڈ وڈ میموریل کے موقع پر بیان کیا۔ کہ گجرات کی عربی تاریخ جس کی پہلی جلد ۱۹۱۰ء میں اور دوسری ۱۹۲۱ء میں شائع ہوئی تھی۔ اب اس کی تیسری جلد ۱۹۲۶ء میں شائع ہو جائے گی +

کرنل لارنس نے اپنی عمر کا بیشتر حصّہ حجاز میں برطانیہ کی خدمات میں گزارا ہے۔ حال ہی میں موصوف نے ایک کتاب کیصد کی محدود تعداد میں سبع عماد عقل (SEVEN PILLARS OF WISDOM) کے نام سے شائع کی ہے۔ جس میں کرنل لارنس نے اپنی سرگزشت بیان کی ہے۔ اور کتاب کو مشاہیر عرب کی تصاویر سے بھی مزیّن کیا ہے۔ ان تصاویر کی ایک نمائش لیسٹر گیلری میں ہو چکی ہے۔ کتاب کا مقدمہ برنارڈ شا نے رقم کیا ہے۔ اور کتاب کی قیمت قریباً ۴۰ پونڈ ہے +

آج کل یورپ اور امریکہ میں عام طور پر مذہبی جد و جہد کا طوفان اُٹھ رہا ہے۔ کیونکہ جب ہی فہرست کتب پر نظر ڈالو بے شمار کتابیں مذہبی موضوعات پر ملیں گی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ یورپ اور امریکہ کسی خاص مذہب کی تلاش میں ہے۔ چنانچہ اسی جستجو کا نتیجہ ہے۔ کہ حال میں ایک مذہبی مجلس نے کتاب مناجات (PRAYER BOOK)

ترمیم کی ہے۔ اور اس امر نے مغربی ممالک میں ایک سنسنی پیدا کر دی ہے۔ یہاں تک اثر ہوا ہے۔ کہ اس کے خلاف تین لاکھ نفوس نے ایک محضر نامے کی صورت میں صدائے احتجاج بلند کی ہے۔ یہ محضر نامہ پارلیمنٹ میں پیش ہوگا +

آج مہذب دُنیا میں بعض علوم و واقعات کی تفہیم کا ذریعہ عام طور پر افسانہ نویسی سمجھی گئی ہے۔ چنانچہ زمانہ حال کی چینی جمہوریت کو سمجھنے کے لئے لیڈی الفریڈ ونگیٹ نے ایک کتاب (SERVANTS OF THE MIGHTIEST) کے نام سے تصنیف کی ہے۔ قابل مصنفہ نے اس کتاب میں چنگیز خاں کی زندگی کے تمام حالات نہایت معتبر ذرائع سے جمع کرکے اُن کو آج کل کے واقعات سے مطابقت دیدی ہے۔ کیونکہ مصنفہ کے نزدیک آج بھی تقریباً وہی نقشہ ہے +

محکمہ حضریات ہند (آرکیولوجیکل ڈیپارٹمنٹ آف انڈیا) نے مشرق بنگال کے شہر بہارپور میں ایک نیا انکشاف کیا ہے۔ یہاں بہت سے کھنڈرات برآمد ہوئے ہیں۔ جو حکومت اسلام سے قبل کے بنگالی فن کا پتہ دیتے ہیں۔ یہیں سے ایک عمود پر ایک کتبہ برآمد ہوا ہے۔ جس سے پتہ چلتا ہے۔ کہ یہ مہندپال اول حکمرانِ قنوج سے معنون کیا گیا تھا۔ جس نے سنہ ۹۰۸ء میں حکومت کی +

ترکوں نے جہاں اور ملکی اصلاحات کی ہیں۔ وہاں علوم و فنون کی طرف بھی خاص توجہ دی ہے۔ ترکی کے سلاطین کی بہت سی یادگاریں محفوظ چلی آتی ہیں۔ جن سے دُنیا بالکل ناواقف ہے۔ ترکوں نے حال ہی میں ان قدیم یادگاروں کی نمائش کرکے مُلک کو ان سے بہرہ اندوز کیا۔ اور پھر عوام الناس کے لئے ایک عجائب خانہ میں مرتب کر دیا۔ تاکہ لوگ ان سے تاریخی فائدہ اٹھا سکیں۔ ان نادر یادگاروں میں شاہ اسمٰعیل صفوی کا تخت خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ جو سلطان سلیم کے قبضے میں آیا تھا۔ اور غالباً ہندی کاریگری کا بہترین نمونہ ہے +

مونالیزا کی تصویر اٹلی کے مشہور مصور لیونارڈو ڈاونسی کے موقلم کا نتیجہ ہے۔ یہ تصویر اس وقت فرانس کی مشہور عجائب گاہ میں موجود ہے۔ یہ سنہ ۱۹۱۲ء میں چرائی بھی گئی تھی۔ مگر شیدایانِ فن نے

آخرکار اسے تلاش کرلیا۔ مبصرین کا خیال ہے۔ کہ فن کے اس بیش بہا مخزن کی قدر وقیمت سلطنت سے بھی زیادہ ہے۔ مصوروں نے اس کے بے شمار چربے تیار کئے۔ اور بعض کسی حد تک کامیاب بھی ہوئے مگر حال ہی میں فرانس کے کسی مکان میں سے مونا لزا کی ایک اور تصویر برآمد ہوئی ہے۔ جس نے لوروالی تصویر کے اصلی ہونے میں شبہ پیدا کر دیا ہے۔ عجائب خانہ کی تصویر کے اصل ہونے میں پہلے بھی شک تھا۔ اور اب یہ شک بہت قوی ہوگیا ہے +

حکیم عمر خیام کو مشرق و مغرب میں جو مقبولیت حاصل ہے محتاجِ بیان نہیں۔ اس مقبولیت کی حد یہ ہے۔ کہ اب اس کا ردِ عمل شروع ہوگیا ہے۔ یعنی ایسے لوگ بھی پیدا ہو رہے ہیں۔ جو رباعیات کے اختلاف کے سبب سرے سے خیام کی ہستی ہی سے انکار کرنے لگے ہیں۔ چنانچہ حال ہی میں ڈاکٹر ٹمّر نے مارننگ پوسٹ کے ایک مقالہ میں ظاہر کیا ہے۔ کہ عمر خیام محض قصہ ہے +

اس کا جواب کسی مشرقی کو دینا چاہیئے تھا۔ مگر مشرق و مغرب کی طرف سے ڈاکٹر سر ڈینسن راس نے نیابت کا فرض ادا کر دیا ہے۔ اور عمر خیام کی ہستی کا ثبوت اُس کے ہم عصر شوا ہد سے مارننگ پوسٹ ہی میں دیدیا ہے +

اسلامیہ کالج لاہور کی انجمن ترقی اُردو کے زیرِ اہتمام مشہور محقق پروفیسر حافظ محمود خاں صاحب شیرانی ایک کتاب بعنوان "پنجاب میں اُردو" مرتب فرما رہے ہیں۔ یہ کتاب عنقریب شائع ہو جائیگی۔ اس میں ممدوح نے اصل ماخذ سے ثابت کیا ہے۔ کہ اُردو کا اصلی وطن پنجاب ہے۔ اس کتاب کے شائع ہونے سے تاریخ ارتقاءِ اُردو اور تذکرہ شعرا میں بہت بڑا اضافہ ہوگا +

کاہل کا گیت

امریکن شاعرہ ایلا وہیلر ولکاکس کی ایک نظم

(ابو الاثر حفیظ جالندھری)

اب شام ہو چلی ہے   اب چھا چلا اندھیرا
دُنیا پہ آسماں نے   صبر و سکوں بکھیرا
اور دامنِ شفق پر
سُرخی نے رنگ پھیرا
مستور ہیں ہوائیں   اس پُر سکوں فضا میں
کچھ میٹھے میٹھے نغمے
کچھ گیت کچھ ترانے
لیکن اُداس ہوں میں   بالکل نراس ہوں میں

خوش ہو کے اس طرح سے   گاتی نہیں کبھی میں
اس خوشنما خوشی کو   پاتی نہیں کبھی میں
اس کیف و سرخوشی میں
آتی نہیں کبھی ہنس
میری اُداس گھڑیاں   رہتی ہیں سینہ کوباں
سُن سُن کے یہ مُنادی
اب ہو چکی ہوں عادی
چپ چاپ سُن رہی ہوں   اور سر کو دُھن رہی ہوں

بے کار ہی گذارا   یہ دن پھر آج میں نے
سوچا نہ کاہلی کا   کوئی علاج میں نے
اُٹھ کر نہیں سنوارا
کچھ کام کاج میں نے
کھیتوں پہ جانے والے   ہمّت دکھانے والے
لوٹے ہیں کام کر کے
دامن خوشی سے بھر کے
خوشیاں منا رہے ہیں   اور گیت گا رہے ہیں

مغرب کے سُرخ بادل   مرجھا چکے ہیں سارے
اور شام کی جبیں پر   چھٹکے ہوئے ہیں تارے
لیکن میں سرنگوں ہوں
بیٹھی ہوں اک کنارے
بے تاب ہو رہی ہوں   چپ چاپ رو رہی ہوں
بے کار زندگی پر
بیمار زندگی پر
سر کو کھپا رہی ہوں   آنسو بہا رہی ہوں

لیکن ہے مدتوں سے　　ایسا ہی حال میرا
سب بھول جاؤں گی میں　　آئے گا جب سویرا
پھر کاہلی کا آکر
دل میں جمے گا ڈیرا
دن بیت جائے گا پھر　　یہ وقت آئے گا پھر
خوش ہوں گے کام والے　　اور میں کروں گی نالے
تدبیر سے ڈروں گی　　تقدیر پر مروں گی

یہ دن یہ میری راتیں　　یہ ماہ و سال میرے
بڑھتے رہے ہمیشہ　　رنج و ملال میرے
گو خوشنما بہت ہیں
خواب و خیال میرے
لیکن انہیں اگر میں　　تحفے کے طور پر میں
اُس در پہ لے کے جاؤں　　دربار میں دکھاؤں
تو دو جہاں کا آقا　　مجھ کو نکال دے گا

جب صبح کی ضیا میں　　ملتی نہیں مسرت
پھر شام کی ردا میں　　حاصل ہو کیا فراغت
مجھ کو تو ایک پل بھی
ہوتی نہیں یہ جرأت
دل کو ذرا سنبھالوں　　پھولوں پہ آنکھ ڈالوں
دل ہے مرا فسردہ　　شاید ہوں وہ بھی مُردہ
شاید وہ میرے پیارے　　مُرجھا چکے ہوں سارے

آقا کے سامنے کیا　　منہ لے کے جاؤنگی میں
خواب و خیال کیونکر　　جا کر دکھاؤں گی میں
شرمندہ ہو کے یوں ہی
بس لوٹ آؤں گی میں
غفلت شعار ہوں میں　　تقصیر وار ہوں میں
اُس نے اگر یہ پوچھا　　دُنیا سے لائی ہے کیا
پھر کیا جواب دوں گی!　　اللہ میں کیا کہوں گی!!

راحت پسند ہستی　　کچھ کام کاج کر لے
ہاں محنتوں کا خُوگر　　اپنا مزاج کر لے
کرنا جو ہے تجھے کل
وہ اُٹھ کے آج کر لے
اُٹھ کارگاہ میں چل　　محنت کی راہ میں چل
اُٹھ وقت جا رہا ہے　　تجھ کو بتا رہا ہے
تو عمر کھو رہی ہے　　برباد ہو رہی ہے

اظہارِ حال

(از جناب محمد دین تاثیر ایم۔ اے)

یہ نظم گویا اُس "عرضِ حال" کا جواب ہے۔ جو اپریل کے مخزن میں شائع ہوئی تھی۔ اگر آپ اپنے لطف کو المضاعف کرنا چاہتے ہیں۔ تو اپریل کا مخزن نکال کر صفحہ ۶۹ دیکھئے +

ایڈیٹر

جاؤ کہ اب وہ جوشِ تمنا نہیں رہا
آنکھیں وہی ہیں دیکھنے والا نہیں رہا

اُس آگ کا دُھواں بھی نہیں اب دماغ میں
سودائے زُلف و عارضِ زیبا نہیں رہا

جاتی رہیں ہوس کی وہ سب عشوہ سازیاں
وہ شوقِ جلوۂ پسِ پردا نہیں رہا

ہاں تم وہی ہو سادہ دلوں سے فریب کار
ہاں یہ مری خطا ہے کہ ویسا نہیں رہا

آبِ بقا بھی چشمِ خرد میں سراب ہے
میں تشنۂ فریبِ تمنا نہیں رہا

تم آج بھی وہی ہو جو کل تھے۔ بجا۔ درست
میں وہ نہیں رہا۔ بہت اچھا نہیں رہا

وارداتِ قلب

(از حضرتِ گمنام)

(۱)

گُل کی نکہت میں عنادل کی فغاں میں تُو ہے سازکے پردوں میں شاعر کی زباں میں تُو ہے
بخششِ عام ہے ہر سمت ہے جلوہ تیرا مجھ سے ناچیز کے اندازِ بیاں میں تُو ہے

(۲)

شبِ تاریک ہے خاموشیاں ہیں۔ ہُو کا عالم ہے جہاں سویا ہُوا ہے جاگتی ہے دَرد کی دُنیا
ترے دربار میں حاضر ہُوا ہوں یہ تمنّا ہے الٰہی مجھ کو مل جائے مری کھوئی ہوئی دُنیا

(۳)

یہ مرگ و زیست کا بے ربط سلسلہ کیا ہے بہار کیوں ہے؟ خزاں کیوں ہے؟ ماجرا کیا ہے
عجیب بھول بھلیّاں ہے آپ کی دُنیا حضور، ہم بھی سُنیں اس کا مدعا کیا ہے

(۴)

میں کبھی اپنے خدا سے جو مچل جاتا ہوں یعنی ایمان کے حلقے سے نکل جاتا ہوا
چٹکیاں لیتا ہے پھر وعدۂ فردا کا خیال پھر کھلونوں کے تصوّر سے بہل جاتا ہو

ترنّم

(ابوالمصانع جلالؔ میرزا خانی)

اک دھندلکی چاندنی گہوارۂ ابرِ بہار
جھولتا ہے وادیِ عالم میں فطرت کا نکھار

چھپ گئیں کالی گھٹا میں چوٹیاں کہسار کی
دیبیوں نے رقص کی ایک انجمن تیار کی

برق سی چمکی نظر آیا سنہری سا غبار
ہوگیا دم میں غلافِ سازِ قدرت تار تار

پھر انہیں تاروں کو کوئی آ کے جنباں کر گیا
آسمانوں سے ترنّم بوندیاں بن کر گرا

تھرتھرا اُٹھی محبت کے سُروں میں نغمگی
خامشی کے تار میں میٹھی صدا پیدا ہوئی

مست ندی بن کے موسیقی قہستاں سے چلی
ایک ساون کی گھٹا بن کر نیستاں سے چلی

بحر و بر کے زیر و بم کو مست و بے خود کر گئی
اک خمارِ شوق سے ساری فضائیں بھر گئی

آبشار آگے بڑھے دل میں ترنگیں آگئیں
گونج اُٹھے کہسار اور خاموشیاں تھرا گئیں

اے ترنّم اے لبِ محبوب کی پیاری ندا
مایۂ نازِ اَلَستُ و نازشِ قالوا بلےٰ

اے کہ پنہاں ہے صداؤں میں تری گفتارِ دوست
اے کہ پیدا ہے تری ہر موج میں رفتارِ دوست

نشہ بن کر اُڑ شرابِ زندگی کی سطح پر
ایک جادو بن کے ہر موجِ پریشاں میں اُتر

اُن کے ہونٹوں سے نکل مُردوں میں جاں سی پھونک دے
برق بن کر ہر طرف روحِ رواں سی پھونک دے

کس قدر پُر درد ہیں نالے لبِ مجبور پر
گونج پھر اک بار اے سازِ محبت طور پر

اے کہ تجھ میں جھولتی ہیں حسن کی نیرنگیاں
باندھ دے اک بار گوکل کے کنہیا کا سماں

اپنی موجوں پر اُٹھا لے چل جلالِ زار کو
وادیِ آبوؔ پہ جا کر پھینک اس بیمار کو

نیند

(محمد امیر صاحب اورنگ آبادی)

اے نیند راحتوں کی دیوی ہے نام تیرا　　ہے بادۂ سکوں سے لبریز جام تیرا
تجھ میں سما گیا ہے اک عالمِ مسرّت　　ہے ہیچ تیرے آگے دُنیا کا عیش و عشرت
شب کے سکوں میں اپنا جلوہ ہے تو دکھاتی　　پیغام راحتوں کا گھر گھر ہے تو سُناتی
ہیں دوڑ دھوپ کرتے وحش و طیور دن بھر　　پھرتے ہیں شام کو پھر شیدائے خواب بن کر
آمد کا راگ گایا تو نے جو وادیوں میں　　بدمست ہو کے قدرت ڈوبی خموشیوں میں
مدہوش ہو کے شاخیں پیڑوں کی جُھک گئی ہیں　　خاموش ہو کے موجیں دریا کی رُک گئی ہیں
دن بھر کی محنتوں سے مزدور تھک تھکا کر　　ہوتے ہیں پھر شگفتہ پہلو میں تیرے آ کر
دہقاں کو تجھ سے ہے اک کیفِ شراب حاصل　　آنکھوں سے تجھ کو پی کر سوتا ہے مست و غافل
مفلس ہو یا تونگر درویش ہو کہ سلطاں　　پاتے ہیں تجھ سے راحت ہے فیض تیرا یکساں

(۲) دُنیائے چشم میں ہے کیا خوب تیرا مسکن　　جس کی فضا پہ صدقے قدرت کے سارے گلشن
تیرے ہی سایے میں ہے آرام گاہِ عالم　　ہے گود تیری گویا جائے پناہِ عالم
تیرے نشوں میں زائل سب کی خودی ہوئی ہے　　سو میکدوں کی مستی تجھ میں بھری ہوئی ہے
ہیں مستیاں وہ تیری جو دل سے غم بھلا دیں　　ہیں لوریاں وہ تیری جو دار پر سُلا دیں
گر تُو نہ ہو جہاں میں ہو جائے تلخ جینا　　ہے میٹھی نیند سونا آبِ حیات پینا

(۳) اے نیند تو اگر ہو چشمِ جہاں سے پنہاں　　بس ایڑیاں رگڑ کر مر جائیں سارے حیواں
ہے تُو مسافروں کی کُلفت کو دھونے والی　　آرام دینے والی تکلیف کھونے والی
زنداں میں قیدیوں کی غمخوار تُو رہی ہے　　غربت میں بے کسوں کی دلدار تُو رہی ہے
بیمارِ ناتواں کی تُو ہے شفیق دایہ　　دیتا ہے چین اُس کو دامن کا تیرے سایہ
بیمارِ غم ہوں، آنکھیں نا آشنا ہیں تجھ سے　　کہہ کچھ تو مُنہ سے اپنے کیوں ہے خفا تو مجھ سے
تیری بلائیں لوں میں محوِ خرام ہو جا　　مشتاق گوشِ دل ہے محوِ کلام ہو جا
آنکھوں میں اپنی تجھ کو پُتلی بنا بٹھاؤں　　ویرانہ اپنے دل کا آ تجھ سے میں بساؤں

تازہ غزلیں

جناب شیخ عبد اللطیف تپش۔ بی۔ اے

اے دردِ ہجر! صبرِ محبت کی جان پر
اک چیخ ہے زمین پر اک آسمان پر

چکرا دیا جہاں کو دلِ بے قرار نے
گویا اُٹھا کے رکھ دی زمیں آسمان پر

کام آئی بزمِ غیر میں یہ بے تکلفی
کٹ کٹ گئے وہ آج ہمارے بیان پر

قصہ سُناؤں کیا دلِ خانہ خراب کا
جب نیند مختصر ہو مری داستان پر

اب تک بھی تم کو عشق و ہوس میں نہیں تمیز
دُشمن کو آزماتے ہو میرے گُمان پر

بھاگے ہیں میکدے سے تو حجرے میں بند ہیں
چلّہ کیا ہے شیخ نے اُتری کمان پر

تیغِ نگاہِ ناز کا اک وار اَور بھی!
قاتل!! ذرا تو رحم کسی نیم جان پر!!!

آخر کو شکوہ کرتے ہی اُن سے بنی تپش
جو بات دل میں تھی وہی آئی زبان پر

سید محمد علی صاحب آذر جالندھری

کوئی جس کا نہ ہوُا خود جو کسی کا نہ ہوُا
فائدہ ہونے سے اس کے؟ وہ ہوُا یا نہ ہوا

ضعف میں گرتے ہوئے دل کو سنبھالے رہتی
اپنی ہستی کا مجھے اتنا سہارا نہ ہوا

اللہ اللہ رے محویّت اندیشۂ مرگ
جیتے جی میں غمِ ہستی سے شناسا نہ ہوا

مٹی دینے تو مجھے کاش تم آئے ہوتے
تم سے کیا خاک ہوُا تم سے تو اتنا نہ ہوا

اس کو کہتے ہیں وفا یہ ہیں وفا کے معنی
دل سے دم بھر کو جُدا داغِ تمنّا نہ ہوا

چشمِ گریاں کے لئے منظرِ عشرت ہے فضول
پا بزنجیر کبھی موج سے دریا نہ ہوا

بارہا گلشنِ عالم میں بہاریں آئیں
کبھی سرسبز مرا نخلِ تمنّا نہ ہوا

ظرف یہ ہوتا ہے اور ظرف اسے کہتے ہیں
قطرۂ اشک ہمارا کبھی دریا نہ ہوا

طور پر جا کے جو ہر ایک اُسے دیکھ آئے
اک تماشا ہوُا پھر حسُن کا جلوا نہ ہوا

مَیں ہوں وہ شاہدِ معنی کا طلب گار آذرؔ
جس کو صورت پہ کبھی بھول کے دھوکا نہ ہوا